مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں
سیارہ ڈائجسٹ
اگست 2015ء
ہندو پائلٹ نے قائداعظمؒ کا جہاز مار گرانے کا منصوبہ بنالیا تھا
صدر نے کہا پی آئی اے کے سربراہ نے جہازوں کے سودے میں پیسے بنائے،
ہیرے چرائے اور چین کے خلاف جاسوسی کی ہے
غلام اسحاق نے ڈالروں سے بھرا صندوق
میرے حوالے کیا اور کہا، "اسے لے لو"
پاک فضائیہ کے سابق سربراہ کے حیرت انگیز انکشافات

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

الحدیث

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خادموں سے حسن سلوک کرتے رہنا:

ترجمہ: حضرت کعب ابن مالک کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے پانچ دن پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میری جو ملاقات ہوئی وہ مجھے یاد ہے اس دن میں نے آپ کو یہ فرماتے سنا:

''ہر نبی کے لئے اس کی امت میں سے کوئی نہ کوئی خلیل ضرور ہوا ہے اور میرے خلیل ابوبکرؓ ابن ابی قحافہ ہیں اور اللہ نے اپنے نبی محمدؐ کو اپنا خلیل بنایا۔ سنو تم سے پہلے کے لوگ اپنے نبی کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا کرتے تھے اور میں تم کو اس سے روکتا ہوں۔'' (وفات کے بعد میری قبر پر سجدہ نہ ہونے پائے۔)

پھر اس کے بعد فرمایا:

''اے اللہ! کیا میں نے پہنچادیا؟'' (یہ بات آپؐ نے تین بار فرمائی۔)

پھر آپؐ نے فرمایا:

''اے اللہ! تو گواہ رہ۔'' (یہ بھی تین دفعہ دہرایا) اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے آپؐ پر غشی طاری ہوئی اور جب غشی دور ہوئی تو فرمایا:

''اپنے غلاموں کے سلسلے میں اللہ سے ڈرتے رہنا' اللہ سے ڈرتے رہنا' ان کو پیٹ بھر کھانا دینا' پہننے کے لئے کپڑے دینا اور ان سے نرمی سے بات کرنا۔''

تشریح: یہی حکم گھر کے مستقل خادم کے لئے بھی ہے۔

(بحوالہ: سیارہ ڈائجسٹ فرمان رسول نمبر)

القرآن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۃ الانعام

ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جبکہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا ''کیا تُو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں۔'' ابراہیم کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا انتظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہوجائے۔ چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہوگیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب' یہ سب سے بڑا ہے مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیم پکار اُٹھا، اے برادران قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔

(آیات ۷۴ تا ۷۸) (حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

اس شمارے میں.....

صفحہ	عنوان	مصنف	تفصیل
2	القرآن	ضیاء القرآن	قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!
3	الحدیث	ادارہ	خادموں سے حسن سلوک کرتے رہنا!
14	دستک	امجد رؤف خان	قصہ ایک بار کا!
49	خوشہ چیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں	قلندر حسین سید	ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں چننے کے لیے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی درکار ہوتی ہے!
63	شب تاب	جاوید راہی	ایک عورت کی کہانی، جس نے انتقام کی آگ میں سب کچھ جلا ڈالا!
73	موتیا	کرنل محمد خان	تقسیم ہند سے پہلے کا قصہ، دو دلوں کی داستان جو ایک ملاقات میں ہی ختم ہو گئی!

17

- ہندو پائلٹ نے قائداعظم کا جہاز مار گرانے کا منصوبہ بنالیا تھا
- صدر نے کہا، پی آئی اے کے سربراہ نے جہازوں کے سودے میں پیسے بنائے، میرے مخبر نے اور چین کے خلاف جاسوسی کی ہے
- غلام اسحاق نے ڈالروں سے بھرا صندوق میرے حوالے کیا اور کہا، "اسے لے دیتا"
- پاک فضائیہ کے سابق سربراہ کے حیرت انگیز انکشافات

اظہار خیال

”ایک اور کارنامہ“

جناب کامران خاں صاحب مدیر منتظم ”سیارہ ڈائجسٹ“ السلام علیکم! آپ کے موقر جریدہ کا شمارہ جولائی ملا کیا خوب سرورق رحمت رمضان جیسے خوبصورت الفاظ سے جگمگا رہا تھا۔ اندرونی صفحات میں ”دستک“ پر امجد رؤف خاں صاحب نے جس صاف گوئی سے ہم نام نہاد مسلمانوں کی اس مقدس مہینے میں کارستانیوں کا احاطہ کیا ہے وہ قابل داد ہیں لیکن وہ ان بازی گروں کو بچاگئے جو خاموش تماشائی بنے اپنی نرم حکومت پوری کرنے کی خواہش دل میں لئے خوشی میں مگن ہیں اور سب اچھا ہے کا راگ الاپے جارہے ہیں۔ خداوند قدوس ان کے ناپاک عزائم پھر خاک میں ملائے۔ پھر یہ وہی کچھ کہیں گے کہ ہمیں تو اپنی مدت پوری نہیں کرنے دی۔ ملک میں رمضان المبارک میں بھی حسب معمول بجلی کی لگاتار لوڈشیڈنگ کے ساتھ گیس کی بھی کمی کردی جاتی ہے جس کے لئے خواتین کو کھانا پکانے میں دشواری ہوتی ہے۔ یہاں مظلوم عوام کا کوئی پرسان حال نہیں کراچی میں لوڈشیڈنگ اور حبس سے جو کچھ ہوا وہ کسی سے مخفی نہ ہے۔ یہ لوگ تو ایئر کنڈیشنرز میں بیٹھ کر محض بیان بازی کرتے ہیں ہاں اگر ان کا کوئی اس کسمپرسی میں مرتا تو ان کو احساس ہوتا۔

ہم مسلمان ہیں اس پہ کچھ لکھنا کار بحث ہے اور اپنی توانائیوں کا ضیاع ہے۔ رمضان کے مہینے میں مہنگائی؛ غیر مسلم ممالک میں مذہبی تہوار جیسے جوش اور جذبے سے منائے جاتے ہیں وہاں اشیائے خوردونوش اور اشیائے صرف کے ریٹس معمول سے کم کرکے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ریلیف دیا جاتا ہے افسوس کہ ہم لوٹے جاتے ہیں ہم تو ان اشیاء کے ریٹس پوچھنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں کیونکہ ریٹس سن کر چیز خریدنے کی خواہش حسرت بن جاتی ہے۔ ویسے تو نمائشی رمضان بازار لگائے گئے ہیں جہاں اربوں روپے سبسڈی دینے کی نوید عوام کو سنائی جاتی ہے اور یوٹیلیٹی سٹورز ہیں اور یہاں عوام کو کیا ریلیف ملتا ہے اس کے دیکھنے کے لئے خوردبین چاہئے۔ ایسا کچھ حال رمضان دسترخوانوں کا ہے جہاں لاکھوں روپے کا صرف ٹینٹوں کا کرایہ وصول کیا جائے گا۔ سب چور ڈاکو اور شاطر اکٹھے ہوگئے ہیں اور لوٹ مار کا بازار گرم کررکھا ہے پھر یہ لوگ اس کمائی سے عمرے کریں گے اور آخری عشرہ مسجد نبوی میں اعتکاف میں بیٹھ کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں گے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ہماری حکومت پنجاب کا ایک اور کارنامہ ملاحظہ ہو۔ حال ہی میں آٹھویں کلاس کی جغرافیہ کی کتاب مارکیٹ میں آئی ہے جس کی پشت پر پاکستان کا نقشہ ہے اس میں سرائیکستان اور ہزارہ کو صوبوں میں دکھایا گیا ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے! اب بھلا کوئی وزیر تعلیم سے پوچھے کہ یہ کیسے ہوا کیوں ہوا اور کس کے ایماء پر ہوا؟ بہرحال شنید ہے کہ مارکیٹ سے ان کتابوں کو اٹھوایا جارہا ہے اور ساتھ ہی حکومت کے اس اقدام کیخلاف

مظاہروں کا سلسلہ بھی چل نکلا ہے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

ہاں یاسمین کنول صاحبہ کا شکریہ! کہ وہ ''خود جلیں دیا اغیار کو بینا کردیں'' میں شامل تحریروں کے لئے لکھتی ہیں کہ ان میں پھولوں کی خوشبو شامل ہوتی ہے یہ میرا کمال نہیں بلکہ ان صاحب بصیرت لوگوں کا کمال ہے جن کی کتابوں سے اخذ ہوتا ہے۔

(قلندر حسین سید)

کس کا کتنا ہاتھ ہے؟

جناب امجد کامران صاحب۔ آداب!

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے ایک مدت ہوئی سیارہ سے میرا رابطہ منقطع ہو چکا ہے پتہ نہیں اس میں آپ کا کتنا ہاتھ ہے یا آفس ورکرز کا جو ساتھ کام کرتے ہیں حتیٰ کہ مجھے وہ ڈائجسٹ بھی نہیں مل سکا جس میں میرا افسانہ شائع ہوا تھا۔ چھ ماہ تو ہوگئے ہیں۔ ایک اور کام بھی کہہ رکھا ہے کہ ایک لسٹ بنوا دیں تاکہ اگلی کتاب کی تیاری مکمل کرسکوں۔

میں کمر کی تکلیف کی وجہ سے اتنی دور آ نہیں سکتی۔ اگر آپ میرے افسانوں کی لسٹ بنوا دیں تو مجھے ڈھونڈنے میں آسانی رہے گی۔

مہربانی سے کسی کے ذمہ یہ کام لگا دیجئے اور وہ سیارہ بھی بھیجیں جس میں افسانہ چھپا تھا۔ ایک اور تازہ افسانہ بھیج رہی ہوں میرا ایڈریس آفس میں نوٹ کروا دیں شکریہ۔

(آسناتھ کنول)

☆ آسناتھ کنول صاحبہ، اس بارے میں آپ سے عرض ہے کہ ہمیں کم از کم افسانوں کی اشاعت کا دورانیہ ہی بتا دیجئے تاکہ فہرست بنانے میں کچھ مدد مل سکے۔

مضامین شائع نہیں ہوئے

جناب امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم!

حج کے ایمان افروز واقعات پر مبنی ایک مضمون ''حج مبارک 1997ء'' کے عنوان سے ارسال خدمت کیا تھا جو کہ نہ تو جون 2015ء اور نہ ہی جولائی 2015ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے حالانکہ آپ نے جلد شائع کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ میں نے تو واپسی ڈاک لفافہ ٹکٹوں لگا ساتھ بھیجا تھا کہ اگر مضمون پسند نہ آئے تو واپس کردیجئے گا اور اس دوران ایک مضمون ماہ رمضان کی مطابقت سے ''اللہ کا مہینہ'' کے نام سے بذریعہ UMS آپ کو ملا ہوگا وہ بھی نہیں چھپا۔

خیر آپ کی مرضی ہے۔ آپ بااختیار ہیں اور ہم بے بس۔ دو مضمون سچے حالات و واقعات پر مشتمل تحریر کئے ہوئے رکھے ہیں، جو جلد ہی ارسال کردوں گا۔ امید ہے کہ آپ تعاون فرمائیں گے۔ آخر میں چلتے چلتے عید کی مبارکباد قبول ہو آپ کو اور آپ کے عملہ کو ڈھیروں خوشیاں نصیب ہوں (آمین) سیارہ ڈائجسٹ میں لکھنے والوں پڑھنے والوں کو اہل وطن اور عالم اسلام کو بہت بہت عید مبارک۔

(غلام نبی عارف)

☆ غلام نبی عارف صاحب آپ کا مضمون ''اللہ کا مہینہ'' جولائی کے شمارے میں سرورق کے مضمون کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

سکوں سے متعلق مضمون

جناب کامران نعمان صاحب! مدیر منتظم، اسلام علیکم! امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آج افطاری کے بعد بکس (Books) کی

دکان پر حاضری دی ان سے آپ کا "سیارہ ڈائجسٹ" جولائی 2015ء طلب کیا۔ انہوں نے مجھے رقم ادا کرنے پر دے دیا۔ آپ کو جو سکوں (Coins) کے متعلق مختصر مضمون ارسال کیا تھا آپ نے شائع کروا دیا بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ادارہ کو اور اس کے جو زیر سایہ کام کر رہے ہیں ترقی دے اور خوش و خرم رہیں۔

انشاء اللہ تھوڑے دنوں کے بعد آپ کو ٹکٹوں کے متعلق مختصر مضمون ارسال کروں گا مہربانی کر کے اپنے ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ میں ضرور شائع کریں تاکہ متعلقہ افراد کی پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہو۔

(حاجی محمد وارث)

منفرد شمارہ

محترم مدیر اعلیٰ صاحب! السلام علیکم! جون کا شمارہ لاہور کی ساری خوبصورتیوں کو دامن میں سمیٹے ملا۔ مزا آ گیا۔ جولائی کے شمارے میں رمضان کے حوالے سے ایمان افروز معلومات تھیں۔ نشاط بابا کے ساتھ اگست کے مہینے کے رمضان کے خصوصی شمارے کیلئے معراج النبیؐ اور نذرانہ عقیدت بھیج رہی ہوں امید ہے اس خصوصی شمارے میں ان کو ضرور شامل کریں گے۔ تازہ شمارہ مجموعی لحاظ سے بھی منفرد تھا۔

دعاؤں کیساتھ
(نوشابہ اختر)

پاکستان کو کیا تحفہ دینا ہے؟

محترم ایڈیٹر صاحب! ہمیشہ خوش رہیں!!!
السلام علیکم! اگست کی آمد آمد ہے اور پاکستان کی سالگرہ کا دن بھی قریب ہے سوچتی ہوں ہم نے پاکستان کو اس سال کیا تحفہ دینا ہے؟ ہر روز نئے سے نیا محاذ پاکستان کی ترقی کے خلاف کھلا نظر آتا ہے۔ یہ سیاسی فضا کب مستقبل کی خوشخبری سنانے کے قابل ہوگی۔ معاشرتی روایات کب آباؤ اجداد کی پیروی کرتی نظر آئیں گی۔ کدورت، بغض اور کینہ کب ختم ہوگا؟ پاکستان کو 14 اگست 2015ء کی سالگرہ پر کیا تحفہ دینا ہے۔ اللہ کرے غریب عوام کے بھلے کی کوئی بات کر جائیں پاکستان کی سربلندی کے لئے کوئی کارنامہ رقم کریں۔ پاک فوج کو سلام!! کہ ہر مشکل گھڑی میں عوام کا ساتھ دیا ہے۔ دہشت گردی ہو یا سیاسی محاذ آرائی، سیلاب ہو یا زلزلہ پاک فوج کے جوانوں نے ہمیشہ زخموں پر مرہم رکھا اللہ تعالیٰ پاکستان کو سلامت رکھے اور اس کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

رمضان کا شمارہ یعنی جولائی کا رمضان نمبر رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں بڑا اچھا لگا۔ واقعی رمضان گناہوں کی تلافی کا مہینہ ہے۔ شوکت افضل صاحب کو مجلس مشاورت میں شمولیت پر مبارکباد۔ ان کی تحریر انا کی زنجیر کی پہلی قسط بہت اچھی لگی۔ کہانی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے پہلی قسط نے ہی ہمیں گرفت میں لے لیا ہے۔ اگلی کا انتظار ہے کہانی بہت دلچسپ ہے۔

قلندر حسین سید، نواز خان، شوکت افضل، حکیم راحت نسیم اور عارف محمود اہل سیارہ کی جان ہیں اور ان پانچ ستونوں پر سیارہ کی عمارت کھڑی ہے۔ بلاشبہ یہ سیارہ کے حواس خمسہ ہیں باقی تحریروں میں مراقبہ اور اس کی اہمیت، مقابلہ حسن، حکایت کہانی کے علاوہ ماں جی متاثر کن تحریریں رہیں۔ عزت کا رکھوالا اور انا کی زنجیر تو خصوصی تحریریں ہیں ناں۔ باقی باتیں آئندہ اجازت اللہ حافظ۔

(دعا گو یاسمین کنول)

مشعل راہ تحریریں

محترم مدیر اعلیٰ! سیارہ ڈائجسٹ۔ السلام علیکم!

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ماہ جولائی کا سیارہ ڈائجسٹ پڑھا یوں تو میں آپ کے رسالے کی ایک خاموش قاری ہوں۔ کب سے؟ یہ تو یاد نہیں عرصہ ہوا سیارہ ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے یوں تو پاکستان میں شائع ہونے والے کئی رسالوں کا مطالعہ میرا معمول ہے لیکن خط لکھنے کی جسارت آج پہلی مرتبہ کررہی ہوں۔ سیارہ ڈائجسٹ بلاشبہ ایک معیاری ڈائجسٹ ہے جس کا ہر ماہ بے چینی سے انتظار ہوتا ہے اور جب تک پورا پڑھ نہ لوں دل کو سکون میسر نہیں آتا۔ آپ کے ڈائجسٹ کے تمام ہی سلسلے لاجواب ہیں جو کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ آپ کی کاوشیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ رسالہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کررہا ہے اور کرتا ہی رہے گا۔ (آمین)

خط لکھنے کی خاص وجہ محترمہ شوکت افضل کی سلسلہ وار کہانی ''انا کی زنجیر'' ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ نے ان کی سلسلہ وار کہانی شروع کی ان کی تحریریں ہمارے لئے مشعل راہ ہوتی ہیں۔

دوسرا اچھا اضافہ ڈائجسٹ میں جناب ضرغام محمود صاحب ہیں پچھلے ماہ جن کی تحریر ''قربانی'' اور اس ماہ ''ماں جی'' پڑھ کر دل سے بے اختیار واہ بہت خوب نکلا دل کو چھونا اسی کو کہتے ہیں۔ موصوف اور بھی کئی رسالوں میں بڑی شان سے لکھ رہے ہیں اور بہت خوب لکھ رہے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ رسالے میں انہیں ہر ماہ ضرور شامل کرکے ہمیں بہترین اور معیاری کہانی سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیں۔ اس کے علاوہ اللہ کا وعدہ، حصار، چکنے پات، حکایت کہانی وغیرہ تحریریں اچھی ہیں۔

کچن کارنر سے بھی ہم نے چیز بال، فلفس اور ریشمی کباب سے رمضان میں استفادہ حاصل کیا اور گھر والوں سے داد سمیٹی۔

حرف آخر مجموعی طور پر رسالہ بہترین رہا جس کا سارا کریڈٹ آپ ہی کو جاتا ہے ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو خوب سے خوب تر کی طرف لے جائے اور ترقی کی راہ پر گامزن رکھے۔ (آمین) اگلے رسالے کی شدت سے منتظر۔

(کوثر جاں، کراچی)

تاریخ اسلام نمبر

محترم امجد رؤف خان صاحب، السلام علیکم۔

اس وقت جب میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں رمضان المبارک کا مہینہ اپنے اختتام کے قریب ہے اور عید کی آمد آمد ہے۔ اس لیے سب سے پہلے تو سیارہ ڈائجسٹ کے تمام قارئین کو عید کی خوشیاں مبارک۔ اس رمضان سیارہ ڈائجسٹ نے ہر سال کی طرح خاص اسلامی نمبر ''تاریخ اسلام نمبر'' شائع کیا ہے جو حقیقتاً ایک لائق تحسین کاوش ہے۔ اس میں جس طرح اسلامی تاریخ کے مستند واقعات کو حوالہ جات کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے، بہت کم تاریخی کتابوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ میرے نزدیک یہ خصوصی نمبر ہر گھر کی لائبریری میں ہونا چاہیے اور ہر مسلمان کو نہ صرف خود بلکہ اپنے اہل خانہ کو بھی اس کا مطالعہ کروانا چاہیے تاکہ ہم اپنی اسلامی تاریخ سے بالکل درست طور پر آگاہ ہو سکیں۔ اس یادگار پیشکش پر سیارہ ڈائجسٹ کی پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔

(زاہد رانا۔ لاہور)

"قصہ ایک ہار کا"

اکتوبر 2005ء میں جب پاکستان میں قیامت خیز زلزلہ آیا تو ہنستی مسکراتی صبح نے اچانک قیامت کا روپ دھار لیا۔ اس زلزلے نے کشمیر اور ایبٹ آباد سمیت ملک کے بالائی علاقوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ لاکھوں افراد لقمہ اجل بنے، ہزاروں افراد زخمی ہوئے اور لاکھوں افراد کو بے گھری کا عذاب سہنا پڑا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا ناقابلِ فراموش زلزلہ تھا۔ اسی دوران جب ترکی میں پاکستانی سفارتخانے میں امداد کی غرض سے کیمپ لگایا گیا تو اس کیمپ میں یہ دیکھا گیا کہ ترک خواتین اپنے زیورات دینے کے لئے پاکستانی سفارتخانے کا رُخ کرتی تھیں جہاں انہیں بتایا جاتا تھا کہ زیورات کے بجائے وہ نقد رقوم بطور امداد دیں لیکن ان کا اصرار ہوتا تھا کہ ہم پاکستان کے مسلمانوں کی ترک خلافت کے لیے قربانی کو نہیں بھلا سکتے اور یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے زیورات دے کر ان کے ساتھ اپنی مذہبی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ خواتین کو زیورات سے بہت محبت ہوتی ہے لیکن ترک خواتین نے اپنے جذبہ ایثار دکھا کر یہ ثابت کردیا کہ ان کے نزدیک اپنے پاکستانی بہن بھائیوں کے لئے زیورات کی کوئی قیمت نہیں۔

اسی طرح 2010ء میں پاکستان میں شدید سیلاب آیا جس سے لاکھوں لوگ بے گھر ہوگئے اور اربوں روپے کا نقصان ہوا۔ اس موقع پر ترک خاتون اول نے سیلاب سے متاثرہ لوگوں کیلئے وہ قیمتی ہار عطیہ کیا جو ان کی شادی والے دن ان کے شوہر یعنی طیب اردگان نے تحفے کے طور پر

دیا تھا۔ اگر وہ چاہتیں تو وہ اپنا بیش قیمت ہار بیچ کر بھی نقد رقم سیلاب کے متاثرین کے لئے دے سکتی تھیں لیکن انہوں نے پاکستانی قوم کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی کہ انہیں زیور سے زیادہ پاکستان کے مسلمانوں سے محبت ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے بھی اسی عقیدت کی یاد تازہ کرتے ہوئے اپنا زیور عطیہ کیا تھا جو ترک خلافت کے بچاؤ کے لیے اس خطے کے مسلمانوں نے دکھائی تھی۔

انہوں نے وہ ہار اس وقت سیلاب زدگان کیلئے عطیہ کردیا جب وہ طیب اردگان اور سید یوسف رضا گیلانی کے ہمراہ سندھ کے ایک فنڈ ریلیف کیمپ میں گئیں جہاں انہیں پتا چلا کہ آٹھ جوڑوں کی شادیاں ہو رہی ہیں۔ ترک خاتون اول نے جس مقصد کے لیے ہار دیا تھا وہ پورا ہوا یا نہیں کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا، البتہ اُس موقع پر اخبارات میں یہی خبر سامنے آئی کہ اس ہار کی مالیت کے برابر رقم شادی شدہ جوڑوں میں تقسیم کردی گئی ہے اور ہار سید یوسف رضا گیلانی کے حوالے کردیا گیا ہے تاکہ اسے وزیراعظم ہاؤس میں پاک ترک دوستی کی علامت کے طور پر رکھا جائے۔ لیکن پھر خبر آئی کے وہ ہار کہیں گم ہوگیا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ملک سے اور بہت سی چیزیں اچانک کہیں غائب ہوجاتی ہیں۔ مثلاً بجلی، گاڑی سے سی این جی، موٹر سائیکل سے پٹرول، چولہوں سے گیس، نلکوں سے پانی اور ہمارے حکمرانوں کا ضمیر۔

خیر کافی عرصہ خاموشی کے بعد کسی ''دشمن جاں'' نے ہار کی دوبارہ یاد دلادی۔ چنانچہ کچھ عرصہ پہلے ہار کی تلاش شروع کردی گئی، عین اُس وقت جب وزیرِداخلہ چوہدری نثار علی خان نے ایف آئی اے کو حکم دیا کے وہ ہار کی گمشدگی کی تحقیقات کریں تو انکشاف ہوا کہ ہار مل گیا ہے۔ ہار مل ہی جانا تھا کیونکہ بہت سے لوگ جانتے تھے کہ وہ ہار کہاں ہے اور مصلحتاً خاموش تھے۔ جب شور مچا اور لوگوں سے تحقیقات کی گئیں تو یہ بات سامنے آئی کہ سابق وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی اپنے دورِحکومت کے خاتمے کے بعد جاتے جاتے وہ ہار بھی اپنے ساتھ ہی اپنی ملکیت تصور کرتے ہوئے لے گئے تھے۔ چونکہ اس بات کی تردید یا اسے چھپانا ممکن نہ تھا اس لیے یوسف رضا گیلانی کو اقرار کرنا پڑا کہ وہ ہار انہی کے پاس ہے۔ شاید موصوف نے تسبیح سمجھ کر ہار اپنے پاس رکھ لیا تھا یا پھر ہوسکتا ہے وہ خود کو اس عطیے کے زیادہ مستحق سمجھتے ہوں۔ تاہم افسوس کی بات یہ ہے کہ سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے اس خوبصورت اور ایمان افروز تاریخ کو نظرانداز کرتے ہوئے اس ہار پر قبضہ جمائے رکھا۔ کتنے افسوس کی بات ہے پاکستان کی شبیہہ کو ہمارے کرپٹ حکمران ہی بیرونی دنیا میں مجروح کررہے ہیں۔ سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی ابھی

تک اپنی پرانی روش پر قائم ہیں۔ سابق وزیراعظم کی اس حرکت کی وجہ سے پاکستان کی پوری دنیا میں بدنامی ہوئی ہے۔ انھوں نے یہ تک نہ سوچا کہ جب یہ بات کھلے گی اور ترک وزیراعظم اور اُن کی اہلیہ تک بھی پہنچے گی تو نہ صرف اُن کی بلکہ پوری پاکستانی قوم کی کس قدر تذلیل ہوگی۔ بہر حال میڈیا اور کچھ دیگر سماجی و سیاسی حلقوں کی طرف سے شدید دباؤ کے بعد سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے وہ ہار واپس کردیا۔ تاہم وہ اس بات کی وضاحت نہ کرسکے کہ آخر کس بنیاد پر انھوں نے اس ہار کو اپنے پاس رکھا۔

اب اس سارے معاملے کا ایک اور اہم پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارا نظام کس قدر فرسودہ اور بیکار ہے جس میں اس طرح کی بددیانتی اور پوری قوم کو دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا کردینے والوں کو کوئی سزا نہیں ملتی۔ کوئی ادارہ، کوئی رہنما، کوئی قانون حرکت میں نہیں آتا۔ ایسا کوئی واقعہ کسی ترقی یافتہ ملک میں ہوتا، کسی قانون کی بالادستی والے ملک میں ہوتا تو ملک وقوم کی تذلیل کا باعث بننے والے کو سخت ترین سزا دیکر نشان عبرت بنادیا جاتا مگر ہمارے ہاں چند دن اس بات کا چرچا رہا اور اس کے بعد سب اس واقعہ کو بھول گئے۔ تاہم یہ واقعہ ترک خاتون اول اور ترک عوام کو ضرور یاد رہے گا، اور بھی دنیا کے جن جن حصوں میں یہ خبر پہنچی ہوگی وہاں کے لوگ ایک پاکستانی لیڈر کی اس شرمناک بددیانتی کو ضرور یاد رکھیں گے اور اسی کی بنیاد پر پاکستان کے بارے میں رائے قائم کریں گے۔

(امجد رؤف خان)

ادارہ

فضائیہ میں ماہ و سال

☆ ''ہندو پائلٹ نے قائداعظمؒ کا جہاز مار گرانے کا منصوبہ بنالیا تھا

☆ صدر نے کہا، پی آئی اے کے سربراہ نے جہازوں کے سودے میں پیسے بنائے، ہیرے چرائے اور چین کے خلاف جاسوسی کی ہے

☆ غلام اسحاق نے ڈالروں سے بھرا صندوق میرے حوالے کیا اور کہا ''اُسے دے دینا''

پاک فضائیہ کے سابق سربراہ کے حیرت انگیز انکشافات

ایئر مارشل (ر) ظفر چودہری نے دوسری جنگ عظیم کے دوران انڈین ایئرفورس میں بطور پائلٹ شمولیت اختیار کی اور تقسیم کے بعد پاکستان ایئرفورس میں شامل ہوئے۔ وہ پاکستان کے پہلے چیف آف ایئر سٹاف اور پاک فضائیہ کے تھری سٹار جنرل تھے۔ وہ مارچ 1972 سے اپریل 1974 تک پاک فضائیہ کے سربراہ رہے اور اس دوران انھیں قومی و بین الاقوامی امور کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ زیرِ نظر اقتباسات اُن کی کتاب ''فضائیہ میں گزرے ماہ وسال'' سے لیے گئے ہیں جو انتہائی دلچسپ، غیر معمولی اور انکشاف انگیز واقعات پر مبنی ہیں۔ یہ کتاب مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو'
چند جھلکیاں

میں جب پی آئی اے میں تھا تو ایک دن مجھے ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا دفتر میں فون آیا۔ اس سے قبل میری ان سے واقفیت نہیں تھی اگرچہ میں انہیں کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں' جس پر میں نے پوچھا کہ میں ملنے کے لئے کہاں آؤں؟ اس وقت تک وہ الیکشن میں مغربی پاکستان میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہو چکے تھے لیکن ابھی حکومت میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ خود میرے گھر آ کر ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ شام کے وقت تشریف لائے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا حفیظ پیرزادہ صاحب نے ان کا پیغام مجھے پہنچا دیا تھا؟ میں نے کہا کہ پیرزادہ

صاحب کئی مرتبہ میرے دفتر آئے ہیں لیکن انہوں نے آپ کا کوئی پیغام مجھے نہیں دیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے پیغام بھجوایا تھا کہ چونکہ وہ سیاسی آدمی ہیں اس لئے بعض اوقات سفارش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن مجھے ان سفارشوں پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا ہوا آپ نے یہ بتا دیا کیونکہ آپ کے اور آپ کی پارٹی کے لیڈروں کے سفارشی خطوں کا ایک انبار جمع ہو گیا ہے اور چونکہ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جس پر کوئی کارروائی کرنا ضروری ہو اس لئے میں نے ان پر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ مسٹر بھٹو نے کہا کہ جو میں نے کیا ہے وہ ٹھیک ہے اور اگر کوئی خاص بات ہوئی تو مجھے خود فون کر دیں گے یا آ کر مل لیں گے۔ پھر انہوں نے کہا کہ اب چونکہ دو اہم مسائل پیش ہیں اس لئے وہ خود آئے ہیں اور ان معاملوں میں مجھے ضرور ان کی مدد کرنا ہو گی۔

میرے پوچھنے پر انہوں نے دو سفارشات کیں اور کہا کہ یہ سیاسی لحاظ سے ان کے لئے بہت اہم ہیں اور مجھے ان کی مدد کرنا ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ انہیں پتہ چلا ہے کہ ہم فلاں نام کے ایک انجینئر کو خوامخواہ برخاست کر رہے ہیں جو بہت اچھا کام کرتا ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ کراچی میں ان کی ایک خاص کارکن کا بھائی ہے اور وہ اس کی ناراضگی ہرگز مول نہیں لے سکتے۔

میں نے پوچھا کہ دوسری کیا بات ہے؟ انہوں نے بتایا کہ جب انہوں نے وزیر خارجہ کے عہدے سے استعفیٰ دیا تھا تو ان کے سٹینو گرافر نے بھی ان کی خاطر استعفیٰ دے دیا تھا۔ چند سال قبل اس کی بیوی برٹش ایئرویز میں ایئر ہوسٹس تھی اور حال ہی میں اس نے پی آئی اے میں اسی کام کے لئے درخواست دی تھی لیکن اسے کہا گیا کہ اس کا وزن معیار سے زیادہ ہے اور اس لئے اسے یہ ملازمت نہیں دی جا سکتی۔ ساتھ ہی مسٹر بھٹو نے کہا کہ ان میاں بیوی کی مالی حالت اب بہت پتلی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں اس معاملے میں ان کی مدد کروں۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا کہ آپ نے اپنی مشکلات کا ذکر کیا ہے، کیا مجھے اجازت ہے کہ میں بھی اپنی مشکلات کا ذکر کروں؟ وہ مسکرائے اور کہا ہاں ضرور۔ میں نے کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ یہ انجینئر صاحب جو عمارتی شعبے سے منسلک ہیں نہایت بددیانت آدمی ہیں۔ میں نے خود اس معاملے کی تفتیش کی ہے اور مجھے ذرا بھر بھی شک نہیں کہ وہ دونوں ہاتھوں سے ٹھیکیداروں سے رشوت لیتے رہے ہیں۔ اگر یہ معاملہ کورٹ میں پیش کیا جائے تو اس کے فیصلے میں کئی ماہ لگ جائیں گے۔ جب میں پی آئی اے میں آیا تھا تو میں نے سب کارکنوں کو متنبہ کیا تھا کہ اگر کوئی مالی بدعنوانی کا مرتکب ہوا تو میں اسے ایئر لائن سے نکال باہر کروں گا۔ یہ پہلا شخص ہے جسے میں نے پکڑا ہے اور یہ بات کہ میں نے اس معاملے میں خود تفتیش کی ہے ایئر لائن میں پھیل چکی ہے۔ اب اگر میں اسے چھوڑ دوں تو میری بات پر کون یقین کرے گا؟ بہتر ہو گا کہ میں اپنا منصب چھوڑ کر واپس ایئر فورس میں چلا جاؤں۔ میں نے بتایا کہ ہم ان صاحب کو برخاست نہیں کر رہے۔ انہیں تین ماہ کی رخصت پر بھیج دیا گیا ہے اور واپسی پر انہیں

اس بنا پر فارغ کر دیا جائے گا کہ ایئر لائن کو ان کی مزید ضرورت نہیں رہی۔ مسٹر بھٹو کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور انہوں نے کہا "بس میری مشکل حل ہو گئی۔ مجھے اس چڑیل کی جس کا یہ بھائی ہے صرف اگلے دو ماہ تک ضرورت ہے۔ اس کے بعد یہ فاحشہ جو چاہے کرتی پھرے، مجھے کوئی پروا نہیں۔"

جہاں تک دوسرے معاملے کا تعلق تھا میں نے کہا کہ میرے لئے یہ ہرگز مناسب نہ ہوگا کہ متعلقہ افسر کو کہوں کہ فلاں خاتون کو ایئر ہوسٹس بنا لیا جائے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ ہمارے معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں۔ اگر میں ایسا کروں تو یہ بدعنوانی کو فروغ دینے کے مترادف ہوگا۔ تاہم مجھے حال ہی میں پتہ چلا ہے کہ ایئر لائن میں ایئر ہوسٹسوں کی بہت کمی ہے اور جب میں نے متعلقہ شعبے سے اس کی وجہ پوچھی تو مجھے جواب ملا کہ جو خواتین اس کام کے لئے درخواست دیتی ہیں وہ ہمارے معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر سارے ملک میں ہمیں کافی لڑکیاں اس کام کے لئے نہیں ملتیں تو اس کا یقیناً یہ مطلب ہے کہ جو معیار ہم نے مقرر کئے ہیں وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہیں اور یہ کہ جاپان میں جسامت، قد و قامت کے یقیناً وہ معیار نہیں ہونگے جو یورپ یا امریکہ میں ہیں۔ اس لئے آپ فوراً اپنے موجودہ معیار میں مناسب تبدیلی کریں تاکہ یہ کمی پوری ہو سکے۔ پھر مسٹر بھٹو سے مخاطب ہوتے ہوئے میں نے کہا کہ اس خاتون کو مشورہ دیجئے کہ وہ اپنا وزن کچھ کم کریں اور دوبارہ درخواست دیں اس طرح امید ہے کہ وہ اپنے بل بوتے پر بغیر کسی سفارش کے ایئر لائن میں شامل ہو سکیں گی۔ وہ مسکرائے اور کہا آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ جانے کے لئے اٹھے تو کہا کہ تمہارا مکان بہت سادہ ہے۔ میں نے کہا کہ یہ میری ضروریات کے لئے بہت کافی ہے اور میرے مزاج کے عین مطابق ہے۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔

وزرائے باتدبیر

1973ء میں وزیراعظم نے ایک میٹنگ بلائی جس میں کئی وزراء، افواج کے سربراہان اور چند سینئر سول افسر شامل تھے۔ حسب معمول مسٹر بھٹو عین وقت پر پہنچے اور سب حاضرین سے ہاتھ ملایا۔ وہ ابھی اپنی کرسی پر بیٹھ ہی رہے تھے کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ایک وزیر دبے پاؤں داخل ہوئے۔ مسٹر بھٹو فوراً کھڑے ہو گئے اور انتہائی درشت لہجے میں چیخے "تم دیر سے کیوں آئے ہو؟" یہ صاحب وہیں رُک گئے اور ڈرتے ڈرتے نہایت لجاجت سے جواب دیا: "جناب میرا ٹیکسی ڈنٹ ہو گیا تھا" مسٹر بھٹو چنگھاڑے: "تو پھر تم اس میں کیوں نہ مر گئے؟ ایک لیٹ آئے ہو دوسرا جھوٹ بولتے ہو۔ اچھا اس دفعہ تمہیں معاف کیا لیکن آئندہ کبھی یہ حرکت نہ ہو۔" اتفاق سے ان وزیر صاحب کی کرسی میرے ساتھ تھی۔ تمام وقت ان کی آنکھیں ایک خالی کاغذ پر مرکوز رہیں اور دو تین گھنٹے کی میٹنگ میں وہاں یک لفظ بھی نہ بولے۔ آخر میں مسٹر بھٹو نے ہر ایک سے باری باری پوچھا کہ کیا وہ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟ ان وزیر صاحب نے اپنی باری پر کہا "جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ عین مناسب ہے اور مجھے اس سے پورا

اتفاق ہے۔" میں اگر یہ روداد کسی اور سے سنتا تو شاید یقین نہ کرتا لیکن یہ سب کچھ میری موجودگی میں ہوا اور میں اسے جھٹلا نہیں سکتا۔

ایک اور موقعے پر مسٹر بھٹو نے انہیں وزیر صاحت کی ایک پوشیدہ کمزوری کا سر عام مذاق اڑایا جس پر وہ بہت کھسیانے ہوئے۔ مسٹر بھٹو کے یہاں کھانے کی دعوت تھی جس سے قبل مہمان حسب ذائقہ کچھ پی پلا رہے تھے۔ جب ایک ملازم میرے پاس وہ ٹرے لایا جس میں مختلف مشروب رکھے تھے تو میں نے اندازے سے وہ گلاس اٹھا لیا جس میں سیون اپ معلوم ہوتا تھا۔ مسٹر بھٹو یہ دیکھ کر انتہائی بلند آواز میں، جو سب حاضرین سن سکیں ملازم سے یوں مخاطب ہوئے "بیوقوف انسان تمہیں پتہ نہیں کہ ایئر مارشل نہیں پیتے۔ انہیں سیون اپ لاکر دو۔ یہ سپیشل ڈرنک ان مولانا کے لئے ہے۔" ظاہر ہے وزیر صاحب بہت خجل ہوئے اور سب لوگ ہنسنے لگے۔

پھر ایک موقعے پر ایک نہایت معتبر وزیر کی گوشمالی کی گئی۔ ایک خاصی بڑی میٹنگ کے دوران مسٹر بھٹو نے ان سے کہا: "میں نے سنا ہے تم نے کل فالکن (چھوٹا جیٹ جہاز) استعمال کیا تھا" وزیر صاحب نے کہا "جی ہاں" کام بہت ضروری تھا اور پی آئی اے کی کوئی پرواز میسر نہیں تھی۔" مسٹر بھٹو سختی سے بولے "چند روز ہوئے گورنر پنجاب نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا وہ فالکن استعمال کر سکتا ہے؟ میں نے اسے کہا کہ ہرگز نہیں اور تم تو صرف آدھے وزیر ہو تم کیسے اسے استعمال کر سکتے ہو؟" بھری مجلس میں ان صاحب کی بہت سبکی ہوئی۔ میٹنگ کے اختتام پر مسٹر بھٹو نے ہنستے ہوئے مجھے کہا: "یہ جہاز کسی اور کو مت دینا یہ صرف تمہارے اور میرے لئے ہے۔"

لیبیا کی دھونس اور اس کا جواب

لیبیا کی پرزور درخواست اور حکومت پاکستان کے فیصلے کے مطابق پاکستانی فضائیہ نے اپنے بہت سے لوگ بشمول پائلٹوں کے لیبیا بھجوائے تاکہ وہ ان کی فضائیہ کی تشکیل میں مدد دے سکیں۔ بعض اوقات تو لیبیا والے یہ تقاضا کرتے کہ فوری طور پر کچھ اور لوگ بھی بھیجے جائیں جو ہمارے لئے مشکل ہوتا مگر حکومتی پالیسی کے تحت ہم ان کی ہر ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتے چاہے ہمارے اپنے کام میں کچھ کمی رہ جائے۔ اگرچہ دونوں ممالک سیاسی سطح پر آپس میں بہت قریب تھے۔ لیکن میدان عمل میں کئی دشواریاں پیش آتیں۔ لیبیا کی فضائیہ کے افسروں کا ہمارے لوگوں سے سلوک بالعموم ناروا ہوتا اور وہ انہیں بلاوجہ تنگ کرتے رہتے۔ ہم نے اس معاملے میں کئی مرتبہ انہیں توجہ دلائی اور انہوں نے وعدے بھی کئے کہ کسی کو ہمارے لوگوں سے زیادتی نہیں کرنے دیں گے لیکن حالات میں کوئی بہتری نہ ہوئی اور ہمارے لوگ تنگ ہوتے رہے۔ بجائے اس کے کہ وہ تشکر کے جذبات کا اظہار کرتے وہ پاکستانیوں کو کرائے کے ٹٹو سمجھتے اور ان سے ناروا سلوک کرتے۔ کئی مرتبہ وہ ہمارے لوگوں سے ایسا کام کروانا چاہتے جو باہمی معاہدے کے تحت انہیں کرنے کی ممانعت تھی۔ ان کا نظام بھی ایسا الجھا ہوا تھا کہ یہ پتہ

کرنا مشکل ہوتا کہ کون کس شعبے کا انچارج ہے اور اختیارات کی کیا تقسیم ہے۔ انہیں اس شے کی جسے ہم ڈسپلن کہتے ہیں کوئی سمجھ نہیں تھی وہ اپنے افسروں کو معمولی فروگزاشت پر جیل میں ڈال دیتے اور پھر انہیں رہا کر کے وہی ذمہ داری دوبارہ سونپ دیتے۔

ایک دن مجھے اپنے ایک سینئر افسر کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ اسے اس شعبے کے مدارالمہام نے جس میں وہ کام کرتا ہے بلا کر یہ کہا ہے: ''ہمیں پتہ چلا ہے کہ تمہارا ایک ایسی تنظیم سے تعلق ہے جو ہمارے ملک کے مفاد کے خلاف کام کرتی ہے۔ اس اطلاع کی تصدیق ہو چکی ہے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمہیں اسی وقت فارغ کیا جاتا ہے اور تمہیں دو ہفتے کے اندر ملک چھوڑنا ہوگا۔'' مجھے یہ اطلاع پا کر سخت غصہ آیا کیونکہ یہ قطعاً غلط اور بیہودہ الزام تھا اور اگر ہم اس پر احتجاج نہ کرتے تو ہمارے لوگوں کی ساکھ سخت مجروح ہوتی۔ میں نے فوراً سیکرٹری دفاع کو خط لکھا کہ یہ مذموم حرکت ہمارے لوگوں کے وقار کو گرانے کی ایک کوشش ہے اور ہم اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔ اگر انہیں ہمارے کسی آدمی کے متعلق کوئی شکایت ہو تو انہیں چاہئے کہ ہمیں اطلاع دیں تاکہ چھان بین کے بعد ہم مناسب اقدام کر سکیں۔ ہمیں فوراً حکومتی سطح پر پرزور احتجاج کرنا چاہئے اور اگر لیبیا اس حرکت پر ندامت کا اظہار نہیں کرتا اور یقین نہیں دلاتا کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں ہوگی تو ہمیں اپنے تمام لوگوں کو وہاں سے واپس بلانے کے متعلق سوچنا چاہئے۔

سیکرٹری دفاع نے میرا خط فوراً مسٹر بھٹو کو بھیج دیا اور دو روز بعد آغا شاہی' سیکرٹری خارجہ کا مجھے فون آیا کہ وزیراعظم نے لیبیا کے سفیر کو بلا کر کہا ہے کہ اگر ہمیں 24 گھنٹے کے اندر لیبیا کی حکومت کی معذرت اور یقین دہانی کہ ایسا پھر نہیں ہوگا موصول نہ ہوئی تو تمام پاکستانیوں کو فوراً واپس بلا لیا جائے گا۔ ساتھ ہی آغا شاہی نے کہا کہ اگر ہمارا مطالبہ نہ مانا گیا تو پھر فضائیہ کو اپنے لوگوں کو فوراً واپس بلانا ہوگا اور ہمیں اس کی تیاری کر لینی چاہئے مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی اور ہم نے تیاری شروع کر دی۔

اگلے دن مسٹر بھٹو پچھلے پہر کوئٹہ سے پشاور پہنچے اور جہاز سے اترتے ہی مجھے ایک طرف لے گئے اور پوچھا کہ لیبیا سے کوئی خبر آئی ہے؟ میں نے کہا ابھی تک مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ شام کو گورنمنٹ ہاؤس میں کھانا تھا مسٹر بھٹو ہنستے ہوئے میری طرف بڑھے اور کہا کہ آغا شاہی کا ابھی فون آیا ہے کہ لیبیا نے حرف بحرف انہی لفظوں میں معذرت کر لی ہے جیسا کہ ہم نے مطالبہ کیا تھا۔ اس لئے اب اپنے لوگوں کو واپس بلانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ خوشی کے ساتھ مجھے فخر بھی محسوس ہوا کہ حکومت کا سربراہ ایسا دلیر شخص ہے جو ملک کے وقار کی خاطر ایسا بھرپور قدم اٹھا سکتا ہے۔

ایک قطرہ بھی نہیں!

میرے فضائیہ کے سربراہ بننے کے چند ماہ بعد مسٹر بھٹو پشاور آئے اور حسب روایت میں نے انہیں ...ر کے کھانے پر مدعو کیا۔ مہمانوں میں چند مرکزی وزراء اور صوبہ سرحد کے گورنر بھی تھے کھانے سے قبل

مہمانوں کو مشروب پیش کیے گئے۔ جب ملازم ٹرے لے کر مسٹر بھٹو کے پاس پہنچا تو انہوں نے دیکھا کہ اس میں صرف کوکا کولا قسم کے مشروب ہیں پھر کچھ مصنوعی شکایتی انداز طاری کرکے مجھے کہا: "بھئی اس گھر کو کیا ہو گیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے یہاں شراب پانی کی طرح بہا کرتی تھی اور اب ایک قطرہ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا: "جی ہاں! کچھ تبدیلی ضرور ہو گئی ہے۔" میں اپنے گھر میں شراب نہیں رکھتا تھا اور میں نے مسٹر بھٹو کی خاطر اس اصول سے انحراف کرنا ضروری نہ سمجھا۔ یہ مہمان کی خوش اخلاقی تھی کہ انہوں نے یہ محرومی خوشدلی سے برداشت کی اور بات ہنسی میں ٹل گئی۔

جب ایک اور موقعے پر مسٹر بھٹو کو کھانے کی دعوت دی گئی تو میرے اے ڈی سی نے مجھے بتایا کہ مسٹر بھٹو کا ایک ملازم آیا ہے جو اپنے ساتھ ایک بوتل بھی لایا ہے اور کہتا ہے کہ اسے ہدایت ملی ہے کہ وہ یہ مشروب اپنے آقا کو پیش کرے۔ میں نے کہا کہ اسے باورچی خانے میں بلا لیں اور کہیں کہ ہماری طرف سے اجازت ہے کہ وہ اپنے آقا کی ہدایات پر عمل کرے اور اس طرح مسٹر بھٹو کو اپنی پسندیدہ مشروب حاصل ہو گئی اور پچھلی مرتبہ کی طرح ان کی شام ویران نہ رہی۔

ہر حکم منظور نہیں

1973ء کے وسط میں مجھے سیکرٹری دفاع نے فون پر کہا کہ وزیر صاحب (مسٹر عزیز احمد نائب وزیر دفاع) فرماتے ہیں کہ فلاں سینئر افسر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پوسٹ کر دیا جائے۔ میرے نزدیک افسروں کا تبادلہ کرنا فضائیہ کے اپنے دائرہ اختیار میں شامل تھا اور اس میں وزارت دفاع کی دخل اندازی نامناسب تھی۔ ایسا کرنا فضائیہ کے نظم و نسق کو کمزور کرنے اور اس کے سربراہ کے جائز اختیارات پر قدغن لگانے کے مترادف ہے۔ اس لئے میرا یہ فرض تھا کہ میں ایسا نہ ہونے دوں چنانچہ میں نے سیکرٹری دفاع سے کہا کہ میں ان ہدایات پر عمل کرنے سے قاصر ہوں۔ انہیں بہت حیرانی ہوئی اور انہوں نے میرا جواب دہرا کر پوچھا کہ کیا میں نے واقعی یہی کہا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں میں نے یہی کہا ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ جلد ہی ان کا پھر فون آیا کہ میرا جواب سن کر وزیر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ایک حکم ہے اور اس کی تعمیل ایک ہفتے کے اندر مکمل کرکے انہیں مطلع کروں۔ میں نے کہا کہ میرا جواب وہی ہے: میں پہلے دے چکا ہوں: یعنی کہ میں اس حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا کیونکہ یہ میرے دائرہ اختیار میں دخل اندازی ہے۔ چند منٹ بعد انہوں نے پھر فون کیا اور کہا کہ وزیر صاحب فرماتے ہیں کہ معاملے نے بہت سنگین صورت اختیار کر لی ہے اور اس کے متعلق مجھے جلد از جلد صدر صاحب (مسٹر بھٹو) کے روبرو پیش ہونا چاہیے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ جائز حکم ہے اور میں اس کی فوراً تعمیل کروں گا۔

مسٹر بھٹو اس وقت کراچی میں تھے اور اگلی صبح انہیں وہاں سے فضائیہ کے فالکن جہاز میں لاہور جانا تھا۔ میں اس شام کراچی پہنچ گیا اور اپنے ہاتھ سے ایک نوٹ مسٹر بھٹو کو مخاطب کرکے لکھا اور یہ انتظام کیا کہ جہاز پر سوار ہوتے وقت انہیں پہنچا دیا جائے۔ اس نوٹ میں وزارت دفاع کے وہ احکام دہرا۔

گئے جو مجھے ملے تھے اور وہ جوابات بھی جو میں نے دیئے تھے۔ پھر میں نے کہا کہ افسروں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ کرنے کا حق صرف فضائیہ کا ہے اور اس میں وزارت دفاع کی دخل اندازی مناسب نہیں۔ یہ ایک پرانا قانون ہے اور اس میں کوئی تبدیلی میرے لئے قابل قبول نہ ہوگی کیونکہ اس طرح فضائیہ کے سربراہ کی حیثیت صرف ایک بے اختیار فرد (Rubber Stamp) کی ہو جائے گی اور اس کے لئے اپنی سروس کا نظم و ضبط برقرار رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ تاہم اگر حکومت یہی فیصلہ کرنا چاہتی ہے کہ یہ اختیار وزارت دفاع کو منتقل ہو جائے تو پھر کسی دوسرے کو فضائیہ کا سربراہ بنا دیا جائے اور مجھے جلد از جلد فارغ کر دیا جائے۔

اگلی صبح خلاف معمول میں مسٹر بھٹو کے جہاز میں داخل ہونے سے پہلے انہیں نہ ملا اور سیدھا جہاز کے کاک پٹ میں جا کر بیٹھ گیا۔ کراچی سے لاہور کی پرواز کے دوران بھی میں ان سے نہ ملا اور جہاز چلاتا رہا۔ عام طور پر میں انہیں سوار ہونے سے قبل ملتا اور پھر جب جہاز بلندی پر پہنچ کر صحیح سمت پر گامزن ہو جاتا تو پیچھے آ کر ان سے مختصری رسمی بات چیت کر لیتا لیکن اب ایک نہایت اہم مسئلہ درپیش تھا اور میں نے ان سے کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ میں اپنا نکتہ نظر لکھ کر واضح کر چکا تھا۔ جونہی ہم لاہور پہنچے مسٹر بھٹو کاک پٹ میں داخل ہوئے اور مجھے کہا کہ میں گورنمنٹ ہاؤس آ جاؤں۔ میں وہاں پہنچا تو کمرے میں پنجاب کے گورنر اور ایک مرکزی ایڈوائزر بھی موجود تھے۔ مسٹر بھٹو ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور مجھ سے کچھ نہ کہا۔ کچھ دیر بعد میں نے جانے کی اجازت مانگی تو دروازے تک میرے ساتھ آ گئے اور کہا: ”مجھے معلوم نہیں عزیز احمد نے ایسا کیوں کیا ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا اور آپ کو اس معاملے میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ مجھے اس جواب سے پوری تسلی تو نہ ہوئی لیکن فوری بحران ٹل گیا۔

ہیروں کی چوری

مسٹر بھٹو نے حکومت سنبھالتے ہی سٹیٹ بینک کے گورنر شاکر اللہ درانی صاحب کو برطرف کر کے جیل میں ڈال دیا۔ میں نے پی آئی اے کا چارج درانی صاحب سے لیا تھا اور ہم دونوں میں خاطر داری کا تعلق قائم تھا۔ چارج دیتے ہوئے انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ کچھ عرصہ قبل ہیروں کا ایک پیکٹ جو پی آئی اے برسلز سے کراچی کے راستے بیجنگ لے گئی تھی وہ راستے میں کہیں چوری ہو گیا تھا اور بیجنگ پہنچ کر پتہ چلا کہ پیکٹ میں سے ہیرے نکال کر چاول بھر دیئے گئے تھے۔ یہ انڈسٹری میں کام آنے والے قیمتی ہیرے تھے جو حکومت چین نے بلجیم سے خریدے تھے اور انہیں چین پہنچانے کی ذمہ داری پی آئی اے کو سونپی گئی تھی۔ میں بھی جب ایئرلائن کے سربراہ کی حیثیت سے چین گیا تو چینی حکام نے بھی اس غفلت کی شکایت کی تھی۔ میں جواب میں صرف یہی کہہ سکا کہ ہمیں اس حادثے پر بہت افسوس ہے اور ہم پوری کوشش کریں گے کہ یہ قیمتی اشیاء برآمد ہوں۔

درانی صاحب کی برخاستگی کے چند دن بعد کراچی کے ایک اخبار میں نمایاں سرخیوں کے ساتھ یہ خبر چھپی کہ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ یہ ہیرے درانی صاحب نے خود چرائے ہیں۔ یہ ایک صریح بہتان تھا اور میں نے اپنا فرض سمجھا کہ اس کی تردید کی جائے۔ میں نے اپنے تعلقات عامہ کے افسر کو فون پر کہا کہ وہ اس اخبار کے ایڈیٹر کو فون کر کے کہیں کہ پی آئی اے کا موجودہ سربراہ کہتا ہے کہ یہ الزام غلط ہے اور وہ فوراً اس کی تردید شائع کریں۔ کچھ دیر بعد اس افسر نے بتایا کہ ایڈیٹر صاحب کہتے ہیں کہ تمہارا منیجنگ ڈائریکٹر اصل حقیقت سے واقف نہیں کیونکہ یہ خبر مجھے پریذیڈنٹ صاحب (مسٹر بھٹو) نے خود دی ہے۔ اب میں پریذیڈنٹ کی بات مانوں یا کسی اور کی؟ لہٰذا اس خبر کی تردید شائع نہ ہوئی۔

اس واقعے کے جلد ہی بعد میں اسی جہاز میں سوار تھا جس میں مسٹر بھٹو سفر کر رہے تھے۔ یہ پی آئی اے کی معمول کی پرواز تھی۔ مسٹر بھٹو نے مجھے بلا کر کہا: ''تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم نے درانی کو جیل میں ڈال دیا ہے۔'' میں نے کہا: ''جی ہاں۔ میں نے یہی سنا ہے۔'' وہ بولے: ''یہ بڑا غلط آدمی ہے۔ اس نے جہازوں کے سودوں میں پیسے بنائے ہیں' ہیرے چرائے ہیں اور چین کے خلاف جاسوسی کی ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس کی انکوائری کرو تاکہ ہم اسے پوری سزا دے سکیں۔'' میں نے جواب دیا: ''میں پی آئی اے کے حالات سے اچھی طرح واقف ہو چکا ہوں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو غلط اطلاعات ملی ہیں۔ درانی صاحب میرے پیش رو ہیں اور میں نے ان سے ایسا سلوک کیا ہے جیسا کہ میں چاہتا ہوں میرا جانشین مجھ سے کرے۔ میرا ان کیخلاف انکوائری کرنا ہرگز مناسب نہیں میں تو سمجھتا ہوں کہ کسی انکوائری کی ضرورت نہیں لیکن اگر حکومت کی یہی مرضی ہے تو کسی باہر کے آدمی کو یہ کام سونپا جائے۔ ہم اسے تمام سہولتیں مہیا کر دیں گے کہ وہ پوری پوری چھان بین کر سکے' جس سے چاہے پوچھ گچھ کرے اور سارا ریکارڈ بھی دیکھ سکے۔'' ان کو یہ بات پسند تو نہ آئی لیکن کہا کہ اچھا وہ کسی تجربہ کار شخص کو اس کام کے لئے بھیجیں گے اور ہم اس کی ہر طرح مدد کریں۔

کچھ ہی دنوں بعد ہی ایک ریٹائرڈ سینئر پولیس افسر تشریف لائے اور مجھے بتایا کہ وہ درانی صاحب کے معاملے میں انکوائری کرنے آئے ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ ایک افسر متعین کر دیا تاکہ وہ ہر شعبے کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر سکیں' سارا ریکارڈ بھی دیکھیں اور جس سے چاہیں پوچھ گچھ کریں۔ تین چار دن بعد مجھے مسٹر بھٹو کا فون آیا کہ یہ صاحب شکایت کرتے ہیں کہ ہم ان سے پورا تعاون نہیں کر رہے۔ میں نے کہا وہ غلط کہتے ہیں اور تفصیل سے بتایا کہ ہم نے تو ان کے سامنے پورا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ ان صاحب کو کوئی قابل گرفت چیز نہ ملی اور وہ اپنی سبکی چھپانے کے بہانے تلاش کر رہے تھے کیونکہ وہ مسٹر بھٹو کو یقین دلا کر آئے تھے کہ وہ ضرور مسٹر درانی کیخلاف کوئی جرم ڈھونڈ کر پوری شہادت مہیا کریں گے۔

کچھ عرصے بعد درانی صاحب کو رہا کر دیا گیا کیونکہ ان کیخلاف کوئی ثبوت نہ ملا تھا۔ جتنی دیر وہ جیل

میں رہے میں نے ان کے بال بچوں کی خبرداری کی کوشش کی اور انہیں تسلی دیتا رہا کہ بالآخر یہ بلا ٹل جائے گی۔ میرے ایئرلائن سے فارغ ہونے کے بعد پی آئی اے کے دو جرمن ملازم فرینکفرٹ میں منشیات کے کاروبار میں پکڑے گئے۔ تفتیش کے دوران انہوں نے اقبال کیا کہ چھن جانے والے ہیرے بھی انہوں نے چرائے تھے اور پیکٹ میں چاول بھر دیئے تھے اس طرح یہ معمہ بالآخر حل ہوگیا۔

نیویارک کی "سٹیسی جانسن"

فضائیہ سے ریٹائر ہونے کے چار سال بعد 1978ء میں امریکہ کے قیام کے دوران ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرا قیام ایک پرانے واقف مسٹر ریاض کے ہاں تھا جو لانگ آئی لینڈ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتے تھے۔ ہمیں پتہ چلا تھا کہ لانگ آئی لینڈ کے بے شور نامی شہر میں ایک کاروں کی ڈیلرشپ فروخت ہو رہی ہے۔ میرے ایک قریبی دوست نے مجھے کہا کہ میں اس ڈیلر شپ کا سودا کرنے کی کوشش کروں اور اس غرض کے لئے انہوں نے دو لاکھ ڈالر سے کچھ زائد رقم میرے بینک اکاؤنٹ میں بھجوا دی۔ ڈیلرشپ کے مالک سے سودا ہوگیا اور معاہدے کے کاغذات وغیرہ تیار کر لئے گئے۔ اب صرف قانونی کارروائی اور رقم کی ادائیگی باقی تھی۔ میں نے تمام متعلقہ کاغذات اپنی ذاتی چیزوں اور کچھ نقدی وغیرہ کے ساتھ اپنے بریف کیس میں رکھے جس میں تالہ لگا تھا اور جو حفاظت کی خاطر میں اپنے ساتھ ہی رکھتا۔

ایک روز ریاض اور میں اپنے ایک مشترکہ دوست کو چھوڑنے نیویارک کے کینیڈی ایئرپورٹ گئے۔ وہ TWA سے لندن جا رہے تھے اور ہم نے پارک کرکے انکے ساتھ TWA کے ٹرمینل کے اندر گئے اور انہیں خدا حافظ کہا۔ جب ہم واپس ریاض کے گھر پہنچے تو مجھے احساس ہوا کہ میرا بریف کیس میرے ساتھ نہیں۔ پہلے کار میں دیکھا اور جب نہ ملا تو اندازہ کیا کہ یا ایئرپورٹ پر کار میں سے کسی نے نکال لیا یا TWA کے ٹرمینل میں میری نظر چرا کر کسی نے اٹھالیا۔ کار کے دروازوں اور شیشوں پر دست اندازی کا کوئی نشان نہ تھا اس لئے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ یہ حرکت ٹرمینل میں ہوئی ہے۔ ہم فوراً واپس ایئرپورٹ گئے اور جہاں جہاں ہم رکے تھے وہاں تلاش کیا۔ TWA کے سکیورٹی کے دفتر سے بھی پوچھا لیکن بریف کیس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ گھر واپس پہنچتے ہی میں نے متعلقہ اداروں کو فون کرکے وہ کریڈٹ کارڈ اور ٹریولز چیک کینسل کروا دیئے جو بریف کیس میں رکھے تھے لیکن بزنس کے کاغذات اور ذاتی چیزیں کھونے کی پریشانی ضرور تھی۔ بااین ہمہ میرے دل کی آواز سرگوشی کر رہی تھی کہ یہ چیزیں جلد مل جائیں گی۔ میں نے جس سے بھی یہ کہا وہ ہنسا اور کہا کہ یہ تقریباً ناممکن ہے ویسے دل کے خوش رکھنے کو اپنا یہ خیال اچھا ہے!

اگلے روز اتوار تھا اور ریاض کا ہمسایہ سارجنٹ فرینک جو مقامی پولیس سے منسلک تھا گھر میں تھا۔ ہم نے اسے یہ روداد سنائی اور مشورہ پوچھا۔ اس کا بھی خیال تھا کہ بریف کیس ملنا تقریباً ناممکن ہے لیکن

اس کے گم ہونے کی رپورٹ مقامی پولیس کے دفتر میں کردینی چاہیے۔ چنانچہ ہم نے ایسا کردیا۔ صبح سے ہمارا فون بج رہا تھا اور کریڈٹ کارڈ اور ٹریولر چیک وغیرہ کے ادارے مجھ سے مزید تفاصیل پوچھتے رہے۔ کوئی تین بجے سہ پہر پھر فون بجا اور ریاض نے بتایا کہ کال میرے لئے ہے فون پر گفتگو اس طرح ہوئی:

''ہیلو۔ یس''

''کیا میں ایئر مارشل ظفر چودھری سے بات کررہی ہوں؟''

''جی ہاں' میں ظفر چودھری ہوں''

''کیا آپ کا بریف کیس کھویا ہے جس میں ضروری کاغذات ہیں؟''

''جی ہاں' ایسا ہی ہوا ہے''

''جناب آپ کا بریف کیس اور کاغذات میرے پاس ہیں۔''

''شکر ہے خدا کا' یہ تو بہت اچھی خبر ہے' آپ کو بریف کیس کہاں سے ملا؟''

''اسے کسی نے سڑک پر پھینک دیا تھا لیکن میرا خیال ہے آپ کی سب چیزیں محفوظ ہیں۔''

''کیا آپ نیویارک شہر سے بات کررہی ہیں؟''

''جی''

''آپ مجھے اپنا نمبر دیجئے' اور میں آپ کو فون کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ فون کال پر آپ کے پیسے خرچ ہوں''

''یہاں کا نمبر 212-997-9357 ہے''

''کیا یہ آپ کا گھر ہے؟''

''نہیں یہ پبلک فون کا کال بکس ہے۔''

اس نے فون رکھ دیا اور میں نے اس نمبر پر فون کیا جو لکھوایا گیا تھا۔

''جی ہاں میں ہی بول رہی ہوں' جس نے ابھی آپ سے بات کی تھی۔''

''میں آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری گری ہوئی چیز اٹھائی اور مجھے اطلاع دینے کی تکلیف اٹھائی اس سے میری خاصی مشکل حل ہوجائے گی۔''

''ہاں' کیونکہ بریف کیس میں کریڈٹ کارڈ' ٹریولر چیک' ایڈریس بک اور کنٹریکٹ کے دستاویزات وغیرہ ہیں اور تمہارے بینک کی سٹیٹ منٹ بھی۔''

''شکر ہے یہ سب چیزیں آپ کو مل گئیں۔ اب میں یہ چیزیں لینے کس جگہ آؤں؟''

''ذرا صبر کرو بھائی' اتنی جلدی اچھی نہیں''

''معاف کیجئے' میں سمجھا نہیں''

"تم ان کی کیا قیمت لگاتے ہو، تم امیر آدمی ہو اور خاصی رقم دے سکتے ہو۔"
"میں تو سمجھتا تھا کہ آپ اپنے ملک میں آئے ایک اجنبی پر مہربانی کر رہی ہیں۔"
"ہاں لیکن تمہیں کچھ قیمت ادا کرنا ہوگی ورنہ میں سب کچھ پھینک دوں گی اور تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔"
"نہیں بھئی ایسا نہ کرو۔ یہ تو بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"
"میں سٹیسی جانسن ہوں اور تمہارا نام تو میں جان گئی ہوں تم فضائیہ کے بڑے افسر ہو۔"
"ہاں میں ایئر فورس میں ہوتا تھا۔ اب ریٹائر ہو گیا ہوں"
"لیکن تم بہت امیر آدمی ہو۔ تمہارے بینک اکاؤنٹ میں دو لاکھ ڈالر سے زیادہ رقم ہے۔ میں نے تمہاری بینک سٹیٹ منٹ دیکھی ہے۔"
"وہ میرے پیسے نہیں ہیں وہ تو میرے دوست نے بھجوائے ہیں تاکہ میں ان کے لئے ایک بزنس خریدوں میں تو ہرگز امیر آدمی نہیں۔"
"تمہارا مطلب ہے کہ کوئی شخص اپنا اتنا پیسہ تمہارے ذاتی اکاؤنٹ میں رکھ دے گا"
"بالکل ایسا ہی ہوا ہے یہ رقم میری نہیں"
"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اتنی بیوقوف ہوں کہ ایسی انہونی بات مان لوں گی"
"میں جو کہہ رہا ہوں وہ بالکل سچ ہے"
"ہوگا مگر میں نہیں مانتی۔ مجھے دو ہزار ڈالر ادا کرو ورنہ تمہاری چیزیں کوڑے میں پھینک دوں گی"
"نہیں ایسا مت کرو ذرا ٹھہرو میں اپنے میزبان سے مشورہ کر لوں"
ریاض سے مشورہ کے بعد میں نے 200 ڈالر کی پیشکش کی۔ اس نے کہا چلو میں ایک ہزار لے لوں گی میں نے کہا 500 زیادہ مناسب رہیں گے۔
"اچھا میں اپنے میاں سے مشورہ کرتی ہوں اور تمہیں چھ بجے پھر فون کروں گی۔" اور فون بند ہوگیا۔
اب گھر میں خاصی گہما گہمی ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد ریاض کا ہمسایہ فریک بھی آ گیا جو مقامی پولیس سے منسلک تھا۔ اس نے پولیس سٹیشن سے ایک شخص کو بلوایا جس نے فون کال کے متعلق میرا بیان لکھا۔ وہ ساتھ ٹیپ ریکارڈر بھی لایا جو فون کے ساتھ لگ سکتا تھا تاکہ اگلی فون کال ریکارڈ کر لی جائے۔ اس نے مجھے کہا کہ فون آنے پر سودا فت نہ ہونے دوں اور کم سے کم ممکنہ رقم پر فیصلہ کر لوں اور کوشش کروں کہ بات لمبی ہو تاکہ فون کال اچھی طرح ریکارڈ ہو جائے۔ عین چھ بجے فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر نے کہا کہ سٹیسی جانسن کی کال ہے کیا تم اس کے چارجز منظور کرتے ہو میں نے کہا ہاں منظور ہیں۔
"میں سٹیسی جانسن بول رہی ہوں"

''عین وقت پر فون کرنے کا شکریہ۔ یہ تو بتاؤ تمہیں یہاں کا فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟''

''بریف کیس میں تمہارے نام ایک خط ریاض کی معروفت ہے جس میں گھر کا پتہ لکھا ہے۔ میں نے اس علاقے کی فون ڈائریکٹری دیکھی اور مجھے نمبر مل گیا۔ دیکھا میں کتنی ہوشیار ہوں!''

''ہاں تم ہوشیار تو ضرور ہو''

''ہاں لیکن میں امیر بننا چاہتی ہوں تمہاری البم میں ایک خوبصورت سی چھوٹی بچی کی تصویر ہے۔ کیا وہ تمہاری بیٹی ہے؟''

''نہیں وہ میری پوتی ہے''

''خیر یہ تو بتاؤ مجھے کتنے پیسے دو گے؟''

میں نے رقم اوپر نیچے کی اور ساتھ بیٹھے پولیس مین کے مشورے پر 750 ڈالر دینے منظور کر لیے۔

''کیا یہ رقم اس وقت تمہارے پاس ہے؟''

''نہیں یہ تو کل بینک سے لانی پڑے گی''

''اچھا میں تمہیں کل سات بجے صبح فون کروں گی۔'' اور فون بند ہو گیا۔

ریکارڈنگ مشین پر میری آواز تو ریکارڈ ہو گئی لیکن دوسری آواز ریکارڈ نہ ہوئی۔ پولیس والا دوسری مشین لے آیا جسے ٹیسٹ کیا گیا اور وہ ٹھیک پائی گئی۔ مجھے کہا گیا کہ کل جب فون آئے تو میں پھر کوشش کروں کہ بات لمبی ہو اور کوشش کروں کہ یہ لڑکی بریف کیس لے کر لانگ آئی لینڈ کی سفوک (Suffolk) کاؤنٹی میں آئے جہاں ریاض کا گھر تھا۔ اور یہ کہ بریف کیس کا تبادلہ سہ پہر میں ہو تاکہ ملزمہ کو پکڑنے کے لئے پورا انتظام کر لیا جائے۔

اگلی صبح (سوموار کے دن) ہم سب سات بجے سے قبل فون کے پاس بیٹھ گئے لیکن سات بجے اس کا فون نہ آیا۔ پولیس والا کچھ بددل ہو رہا تھا کہ ساڑھے سات بجے فون کی گھنٹی بجی اور ہمیں چارجز منظور کرنے کو کہا گیا' پھر یہ بات ہوئی۔

''اچھا' کیا تم گیارہ بجے تک رقم لا سکو گے؟''

''یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ ہمیں کہاں ملنا ہے۔ بہتر ہو اگر تم اس جگہ کے کہیں قریب آ جاؤ جہاں ہم مقیم ہیں اس طرح کام جلدی ہو جائے گا۔''

''یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہمیں مین ہیٹن میں ملنا ہے اور جلدی۔''

''میں مین ہیٹن سے ٹھیک طرح واقف نہیں تم اس طرف کیوں نہیں آ جاتیں؟''

''اگر تمہیں اپنی چیزیں درکار ہیں تو تمہیں مین ہیٹن آنا ہو گا سمجھے؟''

''اچھا بھئی' میں کوشش کرونگا پہلے مجھے بے شور میں بینک جانا ہو گا اور مین ہیٹن پہنچتے پہنچتے سہ پہر ہو جائے گی۔''

"تمہیں پورے تین بجے مین ہٹن کے امیریکانو ہوٹل آنا ہوگا"

"میرا خیال ہے میں تین بجے آسکوں گا لیکن یہ امیریکانو ہوٹل کہاں ہے؟"

"یہ سیونتھ ایونیو اور 52 سٹریٹ پر ہے۔ بہت بڑا ہوٹل ہے کسی سے بھی پوچھ لینا"

"لیکن میں تمہیں کیسے پہچانوں گا؟"

"فکر مت کرو میں تمہیں پہچان لوں گی۔ میں نے البم میں تمہاری تصویر دیکھی ہے۔ تم وردی میں بہت معتبر دکھائی دیتے ہو۔ ایک اور بات اکیلے آنا اور پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گے"

"میں ان علاقوں سے اچھی طرح واقف نہیں میری مدد کے لئے میرا میزبان ریاض ساتھ ہوگا"

"اچھا میں بھی اپنے ساتھ کسی کو لے آؤں گی۔ کوئی چالاکی مت کرنا اور پورے تین بجے پہنچ جانا تم نے کیا پہنا ہوا ہوگا؟"

"گرے سوٹ اور سرخ ٹائی"

"کیا تم نے ہاتھ میں کچھ اٹھا رکھا ہوگا؟"

"نہیں' میرا بریف کیس تو تمہارے پاس ہے" (وہ زور سے ہنسی)

"اچھا' تین بجے ملوں گی' بھولنا نہیں' تین بجے"

اس دفعہ ریکارڈنگ مشین ٹھیک چلی اور تمام گفتگو ریکارڈ ہوئی جو ہم نے بار بار سنی۔ پولیس کے آدمی نے مجھ سے اتفاق کیا کہ یہ آواز کسی جوان سیاہ فام لڑکی کی تھی۔ پولیس والوں نے خاصی بحث اور کئی دفعہ فون کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ یہ کیس نیویارک کے علاقہ کوئنز کی پولیس کے حوالے کرنا چاہئے کیونکہ واردات کینیڈی ایئرپورٹ میں ہوئی جو کوئنز میں واقع ہے۔ یہ فیصلہ بھی ہوا کہ پولیس سارجنٹ فرینک کو میرے ساتھ جانا چاہئے اور ملزموں سے اپنا تعارف بطور مسٹر ریاض کروانا چاہئے۔ ہم کوئی بارہ بجے کوئنز کے پولیس ہیڈکوارٹرز کے لئے روانہ ہوئے جہاں پہنچ کر پولیس نے فیصلہ کیا کہ یہ کیس مین ہٹن کے مڈٹاؤن پولیس سٹیشن کے حوالے کردینا چاہئے کیونکہ امیریکانو ہوٹل جہاں ملزم نے ہمیں ملنا ہے ان کی حدود میں واقع ہے۔ ہم دو بجے وہاں پہنچے اور دو سپیشل ایجنٹوں نے ہمیں کچھ ہدایات دیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ عام سویلین کپڑے پہن کر ہمارے ساتھ جائیں گے وہ بہت تجربہ کار لوگ تھے اور ان کے لئے یہ ایک معمولی سا کیس تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہ لڑکی ہوٹل میں نہ آئے اور بعد میں پھر فون پر رابطہ کرے لیکن اگر وہ آئی تو مجھے اصرار کرنا چاہئے کہ بریف کیس ہوٹل میں لایا جائے اور میں کسی صورت میں اس کے ساتھ ہوٹل سے باہر نہ جاؤں جہاں مجھ پر تشدد ہوسکتا ہے اور ان کے لئے میری حفاظت کرنا مشکل ہوگا۔ انہوں نے مجھے ایک نوٹوں کی گٹھی دی جس کے اوپر اور نیچے ڈالروں کے نوٹ تھے لیکن درمیان میں سفید کاغذ تھے اور کہا کہ اگر وہ لڑکی رقم دیکھنے پر اصرار کرے تو میں اسے یہ گٹھی

جیب سے نکال کر دکھا دوں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ میں اصرار کروں کہ بریف کیس ہوٹل میں لایا جائے اور میں خود ہوٹل سے باہر نہ جاؤں۔ بریف کیس ملنے پر میں اسے کھول کر دیکھوں اور اطمینان کرلوں کہ سب چیزیں اس میں موجود ہیں اور پھر سگریٹ سلگاؤں جوان کے لئے اس بات کا اشارہ ہوگا کہ وہ اپنی کارروائی کریں۔ جب میں نے کہا کہ میں تو سگریٹ نہیں پیتا تو انہوں نے کہا کہ میں رومال نکال کر ناک پونچھوں اور باقی کام وہ خود سنبھال لیں گے۔

پھر ہم کار سے امیریکانو ہوٹل پہنچے۔ کار ہوٹل کے قریب ہی سڑک پر کھڑی کردی گئی جس پہ انہوں نے ایک چھوٹا سا نوٹس چسپاں کردیا جو اس بات کا اعلان تھا کہ یہ کار پولیس کی تحویل میں ہے اور شہر کی پولیس اسے غلط پارکنگ کی وجہ سے اٹھا کر نہ لے جائے۔ پھر ہم امریکانو ہوٹل کی وسیع لابی میں داخل ہوئے جہاں سینکڑوں لوگ موجود تھے اور اکثر چھوٹی چھوٹی میزوں کے گرد بیٹھے تھے۔ فرینک اور میں ایک طرف کھڑے ہوگئے اور دونوں ایجنٹ دوسری طرف جہاں سے ہم انہیں آسانی سے نظر آتے تھے۔ جلد ہی ایک خوش پوش سیاہ فام لڑکی ہمارے قریب سے گزری جس کے ساتھ ایک گریل جوان لڑکا تھا۔ میں نے فرینک سے کہا کہ ممکن ہے یہ ہماری سٹیسی جانسن ہو۔ ان دونوں نے ایک چکر کاٹا' ہمیں اچھی طرح دیکھا اور ہمارے سامنے کھڑے ہوگئے۔

پھر وہ دونوں میری طرف بڑھے اور لڑکی نے پوچھا:

''کیا تم ایئر مارشل ظفر چودھری ہو؟''

''ہاں۔ اور کیا تم سٹیسی جانسن ہو؟''

''ہاں۔ کیا رقم لے آئے ہو؟''

''رقم تو لے آیا ہوں لیکن بریف کیس کہاں ہے؟''

''وہ یہیں ہوٹل کے باہر ہے۔ چلو باہر چلیں اور میں تمہارے حوالے کردوں''

''نہیں تبادلہ جیسا کہ تم نے کہا تھا ہوٹل کے اندر ہوگا۔''

ساتھ کے گرانڈیل لڑکے نے کہا کہ ہوٹل میں تبادلہ کرنے میں خطرہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ کام باہر ہوٹل کی نکڑ پر کرنا چاہئے۔ میں نے اصرار کیا کہ تبادلہ ہوٹل کے اندر ہوگا۔ اس پر لڑکی نے اپنے ساتھی سے بڑے تحکمانہ انداز میں کہا کہ وہ بریف کیس ہوٹل میں لے آئے۔ جونہی وہ گیا' لڑکی سارجنٹ فرینک کی طرف متوجہ ہوئی اور کہا کہ تم مسٹر ریاض ہوگے۔ اس نے کہا ہاں میں ریاض ہوں اور دونوں نے ہاتھ ملایا۔ جلد ہی لڑکا بریف کیس لے کر آگیا جو میں نے پہچان لیا۔ لڑکی نے کہا کہ ہم سب ایک چھوٹی میز کے گرد بیٹھتے ہیں تاکہ تم دیکھ لو کہ تمہاری چیزیں بریف کیس میں موجود ہیں اور رقم ادا کردو۔ ہم چاروں ایک میز کے گرد بیٹھ گئے اور لڑکی نے بریف کیس میز پر رکھ کر کہا کہ دیکھ لو تمہاری سب چیزیں موجود ہیں۔ بریف کیس کا تالہ ٹوٹا ہوا تھا اور وہ فوراً کھل گیا۔ میں نے جلدی سے چیزوں

پر نگاہ دوڑائی اور اگرچہ اوپر نیچے ہو گئی تھیں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ سب موجود ہیں۔ تھوڑے سے وقت میں تفصیل سے جائزہ لینا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ میں نے جیب سے رومال نکالا اور ناک پونچھا۔ یوں معلوم ہوا کہ گویا کوئی جادو کی چھڑی گھومی اور آنکھ جھپکتے میں دونوں ایجنٹ وارد ہوئے اور یہ اعلان کرتے کہ "ہم پولیس کے کارندے ہیں اور تمہیں گرفتار کرتے ہیں" انھوں نے لڑکی اور اس کے ساتھی کو ہتھکڑی لگادی۔ یہ کام اتنی تیزی سے ہوا کہ لڑکی اور اس کا ساتھی ہل بھی نہ سکے۔

ساتھ کی میزوں پر بیٹھے لوگوں نے یہ تماشا دیکھا اور سب حیرانی سے دم بخود نظر آتے تھے۔ پھر سب آپس میں سرگوشی کرنے لگے اور آنکھیں پھاڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ ہم سب کی توجہ کا مرکز تھے کہ ہمارے ساتھ بیٹھے دو لوگوں کو ہتھکڑی لگ گئی تھی۔ لوگوں کی نظروں میں شاید ہم بھی مجرم تھے اور اس احساس سے مجھے کچھ گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ لڑکی نے شور مچایا کہ وہ تو صرف ہمدردی کے جذبے کے تحت کھوئی چیز لوٹانے آئی تھی۔ لڑکے نے کہا کہ اس کا اس قصے سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے تو یہ لڑکی یہ کہہ کر ساتھ لے آئی تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ چلو تمہیں کچھ انعام مل جائے گا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا اور لڑکی سے کہہ رہا تھا تم نے مجھے خواہ مخواہ پھنسوا دیا ہے غلط کام تم نے کیا ہے اور میں تمہارے ساتھ شامل نہیں تھا۔

لیکن لڑکی تڑاق پڑاق بولے جا رہی تھی اور پولیس کو گالیاں دے رہی تھی۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئی اور کہا کہ مجھے معلوم ہے تم کونسی جگہ بزنس خرید رہے ہو۔ میں سب کچھ جلا کر راکھ کردوں گی اور تم پچھتاؤ گے کہ تم نے مجھے گرفتار کروایا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا پہلے بھی پولیس سے سابقہ رہا ہے اور وہ ان کے طریق عمل سے واقف ہے۔ وہ غصے میں ضرور تھی لیکن گھبرائی بالکل نہیں۔ پولیس ایجنٹ ہم سب کو ہوٹل کے ایک دفتر میں لے گئے اور عیسیٰ جانسن سے پوچھا کہ اس کا اصل نام کیا ہے۔ اس نے جواب دیا "وہ میں پولیس سٹیشن جا کر بتاؤں گی پہلے مجھے ایک سگریٹ پلاؤ ورنہ میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہ دوں گی۔" پولیس ایجنٹ نے اسے سگریٹ دیا اور کہا کہ ابھی سورج چمک رہا ہے لیکن تمہارے منہ سے شراب کی بو پہلے ہی آ رہی ہے۔

ایک ایجنٹ لڑکی اور لڑکے کو ٹیکسی میں بٹھا کر لے گیا اور دوسرا ہمیں اپنے پولیس سٹیشن لے آیا جہاں مجھ سے تفصیلی بیان لکھوایا گیا۔ پھر کہا گیا کہ میں کل سٹی کورٹس میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی سے ملوں۔ بالآخر سارجنٹ فریک اور میں گھر لوٹے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میں کوئی جاسوسی فلم دیکھ رہا تھا یا جو کچھ ہوا ہے وہ شاید خواب ہی ہو۔ گھر پہنچ کر میں نے بریف کیس کی چیزوں کو اچھی طرح کھنگالا۔ سوائے پچاس پونڈ کی نقدی کے سب اشیاء موجود تھیں اگرچہ ایک ایک کو کھول کر دیکھا گیا تھا اور سب گڈمڈ ہوگئی تھیں۔ تالے کو اس طرح توڑا گیا تھا کہ باہر سے ٹھیک معلوم ہوتا تھا جس سے اندازہ ہوا کہ چور کافی تجربہ کار تھا۔

اگلے دن میں سٹی کورٹس گیا جو گھر سے کوئی تین گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ وہاں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی سے ملا جو ایک خاتون تھی۔ اس نے بتایا "سٹیسی جانسن" کی شناخت کرلی گئی ہے کیونکہ اس کا اصل نام پہلے سے پولیس ریکارڈ میں موجود ہے۔ کوئی سال بھر پہلے اسے ایک چوری کے سلسلے میں سزا بھی ہوئی تھی۔ البتہ اس کیس میں اسے ضمانت پر رہا کردیا گیا ہے جو کہ یہاں کا معمول ہے۔ اس نے میرا بیان دیکھا اور کچھ مزید تفصیل پوچھی اس نے کہا کہ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ بریف کیس اور اس میں رکھی اشیا۔ مجھے مل گئی ہیں اور چونکہ یہ ایک بہت دلچسپ کیس ہے اس لئے اس کی پیروی وہ خود کریں گی۔ انہوں نے مجھے کورٹ کے ضابطے کی تفصیل بھی بتائی تاکہ جب مقدمہ پیش ہو تو مجھے کوئی گھبراہٹ نہ ہو۔

کیس کی تاریخ کوئی چار ہفتے بعد کی مقرر ہوئی اور مجھے اس کی اطلاع بھیج دی گئی۔ عین وقت پر کورٹ کی کارروائی شروع ہوئی اور مجھے گواہی کے لئے بلایا گیا جو اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے قلمبند کروائی۔ پھر صفائی کے وکیل نے سوالات کئے اور میرے بیان پر جرح شروع کی۔ "سٹیسی جانسن" بڑی معصوم بن کر اپنے وکیل کے ہمراہ بیٹھی تھی۔ اس کا وکیل ایک چرب زبان جوان آدمی تھا جس کا انداز خاصا گستاخانہ تھا۔ اس نے الٹے سیدھے سوال کرکے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کی اور میری ہر بات کو الٹے معنی پہنانے چاہے۔ پہلے تو میں شائستگی اور خاطر داری سے جواب دیتا رہا لیکن جب اس نے کہا کہ "جب تم نے یوں کہا تو تمہارا اصل مطلب اس طرح تھا" تو میرا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور میں نے کہا: "آپ اچھی طرح سن لیں کہ میں انگریزی زبان سے بخوبی واقف ہوں جو میں کہتا ہوں میرا مطلب بعینہٖ وہی ہوتا ہے اور جو میرا مطلب ہو وہ میں پوری طرح اور بغیر کسی ابہام کے واضح کرسکتا ہوں۔ آپ مجھے یہ بتانے کی کوشش نہ کریں کہ میرا کیا مطلب ہے کیونکہ اس سے صرف وقت ضائع ہوتا ہے اور مزید یہ کہ براہ مہربانی سوال کرتے ہوئے مجھے زیادہ لحاظ اور خاطر سے مخاطب کریں اور یہ یاد رکھیں کہ آپ اپنے استدلال کی کمزوری کو گستاخانہ رویے سے پورا نہیں کرسکتے۔" جج صاحب جو ایک سیاہ فام معتبر شخص تھے، نے زور سے قہقہہ لگایا اور اس گستاخ وکیل سے کہا: "لو بھئی آج تمہاری اچھی خاطر ہوئی ہے۔ لیکن یہ سب تمہارا اپنا قصور ہے کہ تم بڑھ بڑھ کر اور بلاضرورت بولتے ہو۔" پھر جج صاحب نے مجھ سے کہا "جناب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اس کیس کو کھنے میں ہماری مدد کی۔ اب آپ فارغ ہوگئے ہیں اور جب چاہیں جاسکتے ہیں۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ملزم نے امریکن قانون کے مطابق مروجہ پلی بارگین کی سہولت استفادہ کرتے ہوئے کسی کم درجے کے جرم کا اقبال کیا اور اس کی سزا پائی۔ اس کے ساتھی کو پروبیشن پر رہا کردیا گیا کیونکہ اس کا جرم کم نوعیت کا تھا۔ یہ قصہ یہیں ختم ہوگیا اور بفضل خدا نہ "سٹیسی جانسن" نے تنگ کیا نہ اس سلسلے میں کوئی اور مشکل پیش آئی۔

ناکام سازش اور مقدمات

مارچ 1973ء میں مجھے ایک روز جنرل ٹکا خان کا جو بری فوج کے سربراہ تھے فون آیا۔ انہوں نے پوچھا کہ میں راولپنڈی کب آؤں گا۔ میں نے کہا کہ فی الحال تو آنے کا کوئی پروگرام نہیں لیکن اگر کوئی کام ہو تو میں آج ہی آ سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں اچھا ہو اگر آپ ابھی آ جائیں۔ چنانچہ میں اسی دن قبل دوپہر ان کے دفتر پہنچ گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ایک سازش کا سامنا ہے اور آپ کے بھی کچھ لوگ ملوث ہیں۔ مجھے بہت حیرانی ہوئی اور میں نے پوچھا کہ اس معاملے کی کیا نوعیت ہے؟ انہوں نے بتایا کہ چند ہفتے پہلے ایک لیفٹیننٹ کرنل ان کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ افسروں کا ایک گروہ جس میں چند حاضر سروس ریٹائرڈ کئے گئے لوگ بھی شامل ہیں حکومت پر قبضہ کرنے کی سازش تیار کر رہا ہے اور ان لوگوں نے مجھے بھی اس سازش میں شریک ہونے کو کہا ہے۔ ٹکا خان نے بتایا کہ انہوں نے اس افسر سے کہا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل رہے اور تمام کارروائی کی اطلاع انہیں دیتا رہے۔ میں نے پوچھا کہ اس گروہ میں کون لوگ شامل ہیں؟ انہوں نے ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ مجھے سازش کی تفاصیل بتائے۔ ڈائریکٹر نے بتایا کہ اس سازش میں دو ریٹائرڈ بریگیڈیئر اور چند ایسے کرنل اور میجر شامل ہیں جو سروس میں ہیں فضائیہ کے سرکردہ ممبران ونگ کمانڈر ہاشمی اور سکواڈرن لیڈر غوث ہیں ان کی پانچ چھ میٹنگ سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی کے ایک سینما گھر میں ہوئی ہیں یہ لوگ حکومت کے سربراہ کو قتل کر کے اور فوج اور فضائیہ کے سربراہان اور چند دوسرے افسروں اور حکومتی عہدیداروں کو قید کر کے یا ٹھکانے لگا کر حکومت پر قبضہ کر لینے کیلئے تیاری کر رہے ہیں۔ گو اس مہم کی تفاصیل تقریباً طے ہو گئی ہیں لیکن ابھی یہ فیصلہ باقی ہے کہ یہ قدم کب اٹھایا جائے گا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے اپریل کے مہینے میں کوئی ایسا موقع چنا جائے گا جب ان لوگوں کی اکثریت جنہیں قید کرنا یا ٹھکانے لگانا ضروری سمجھا گیا ہے کسی ایک جگہ پر جمع ہو۔

میرے لئے یہ خبر حیران کن بلکہ تقریباً ناقابل یقین تھی ٹکا خان نے کہا کہ یہ اطلاعات اچھی طرح جانچی اور پرکھی جا چکی ہیں اور ان میں ہرگز کسی شک کی گنجائش نہیں۔ میں نے کہا کہ جن دو فضائیہ کے لوگوں کے نام لئے گئے ہیں ان میں سے ونگ کمانڈر ہاشمی تو ماری پور کراچی میں متعین ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہوگا لیکن وہ راولپنڈی آ کر میٹنگ میں شریک ہوتا ہے اور وہی فضائیہ کی نمائندگی کرتا ہے اور اس نے بتایا ہے کہ وہ چند اور افسروں کو بھی اپنے ساتھ ملا چکا ہے میں نے کہا اچھا میں ان پانچ چھ تاریخوں کو نوٹ کر لیتا ہوں جب یہ میٹنگیں ہوئی ہیں اور پتہ کرتا ہوں کہ ان تاریخوں کو ہاشمی کہاں تھا۔ میں ونگ کمانڈر ہاشمی کو ایک اچھا افسر خیال کرتا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ یہ خبر غلط ثابت ہو اور ہاشمی کا اس سازش سے کوئی تعلق نہ ہو۔

میں واپس ایئر ہیڈ کوارٹرز پشاور آیا اور متعلقہ شعبہ سے کہا کہ وہ پتہ کرے کہ ونگ کمانڈر ہاشمی ان پانچ چھ تاریخوں کو کہاں تھا جن کی تفصیل میں نوٹ کر کے لایا تھا۔ اگلے دن مجھے بتایا گیا کہ ہاشمی ان

کسی ذاتی کام کی بنا پر رخصت لے کر ان تمام جہازوں کو راولپنڈی کیا تھا۔ یہ اطلاع میرے لئے سخت تکلیف دہ تھی کیونکہ میرے لئے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے اب یہ ضروری ہو گیا کہ اس معاملہ کی مزید تفتیش کی جائے چنانچہ مجھے بادل نخواستہ یہ حکم دینا پڑا کہ ونگ کمانڈر ہاشمی اور سکواڈرن لیڈر غوث کو حراست میں لے کر ان سے پوچھ گچھ کی جائے۔ دونوں افسروں کو پشاور لایا گیا اور متعلقہ شعبہ نے تفتیش شروع کی ساتھ ہی میں نے حکم دیا کہ تفتیش کے دوران ان پر ہرگز کسی قسم کا تشدد نہ کیا جائے اور مشتبہ کیا جائے۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس حکم کی پابندی نہ ہوئی تو میں متعلقہ عملے کو مجرم سمجھوں گا دوران تفتیش خلاف ورزی کرنے والوں کی ... جائے گی۔ اور انھیں سزا دی جائے گی۔

تفتیش کرنے والے وقتاً فوقتاً مجھے بتاتے رہے کہ کیا معلومات حاصل ہوئی ہیں اور اس سلسلے میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ بیانات بھی دکھائے جو زیر تفتیش لوگوں نے اپنے ہاتھ سے لکھے۔ ان بیانات سے معلوم ہوا کہ چند اور لوگوں کو بھی اس سازش میں شامل کر لیا گیا تھا چنانچہ انھیں بھی حراست میں لے کر پوچھ گچھ کی گئی اور اس طرح کوئی تیس افسر تفتیش میں شامل کئے گئے۔ ان میں چند ایسے بھی تھے جن کے خلاف کوئی قابل اعتبار مواد نہ ملا۔ ایسے لوگوں سے پوری پوری معذرت کی گئی اور یہ یقین دلا کر کہ وہ مکمل طور پر قابل اعتبار ہیں انھیں اپنے سابقہ منصب پر فائز کر دیا گیا۔ ہر ایک کو میں اپنے گھر کھانے پر مدعو کرتا اور دلجوئی کرنے کے علاوہ یہ پوچھتا کہ کیا دوران تفتیش ان پر کسی قسم کی زیادتی یا تشدد ہوا؟ ہر ایک نے کہا کہ اگرچہ یہ مرحلہ بہت صبر آزما تھا لیکن ان پر کسی نے تشدد کیا نہ کوئی ذلت آمیز سلوک کیا۔ اس پر مجھے تسلی ہوئی کہ اس سلسلے میں میرے احکام پر عملدرآمد ہو رہا ہے اور تفتیش کرنے والا عملہ کسی غیر قانونی یا خلاف تہذیب سلوک کا مرتکب نہیں ہو رہا۔

تفتیش ختم ہونے پر فضائیہ کے قانونی شعبے اور پاکستان کے ڈپٹی اٹارنی جنرل نے بیانات کا جائزہ لیکر یہ تعین کیا کہ کن کن لوگوں پر مقدمہ چلنا چاہئے۔ مسٹر بھٹو کا خیال تھا کہ چونکہ یہ مشترکہ سازش تھی اس لئے بری فوج اور فضائیہ کو ایک ہی کورٹ مارشل قائم کر کے فوجی اور فضائیہ کے افسروں پر اکٹھا مقدمہ چلانا چاہئے جن لوگوں کو فوج نے حراست میں لیا ان کو اٹک کے قلعہ میں رکھ کر تفتیش کی جا رہی تھی۔ کوئی دس بارہ سال قبل ایک معاملہ میں ISI نے فضائیہ کے چند افسروں کو حراست میں لے کر اٹک فورٹ میں رکھا تھا اور ان پر تشدد کیا گیا تھا۔ (ان کیخلاف کوئی جرم ثابت نہ ہوا لیکن ان کی عزت نفس کو ایسا دھکا لگا کہ انہوں نے فضائیہ کو خیر باد کہنا مناسب سمجھا۔) مجھے یہ بات اچھی طرح یاد تھی اور میں نہ چاہتا تھا کہ فضائیہ اپنے لوگوں کو فوج کے حوالے کر دے۔ میں نے اپنے سینئر رفقاء سے مشورہ کیا اور انہوں نے بھی مشترکہ کورٹ مارشل قائم کرنے کی مخالفت کی کہ اس طرح ہمارے لوگ اٹک فورٹ لے جائیں گے اور وہ فوج کے تصرف میں ہونگے۔ چنانچہ میں نے مسٹر بھٹو سے کہا کہ فضائیہ علیحدہ کورٹ مارشل قائم کرنا چاہتی ہے اور اپنے لوگوں کو فوج کے حوالے نہیں کرنا چاہتی میرے اصرار پر

کل کو یہ لوگ اور کیا فساد پھیلائیں گے۔ مسٹر بھٹو نے سامنے رکھی فائل پر نظر دوڑائی اور سیکرٹری دفاع سے کہا "مگر آپ کو اس سے اتفاق نہیں۔" فضل مقیم نے جواب دیا کہ انہیں ان لوگوں کو ریٹائر کرنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ان کے خیال میں انہیں ایک ایک' دو دو کر کے اگلے چند ماہ میں ریٹائر کرنا چاہیے تاکہ ہمیں کسی شدید ردعمل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مسٹر بھٹو نے میری رائے پوچھی میں نے کہا مجھے اس تجویز سے ہرگز اتفاق نہیں کیونکہ یہ فضائیہ کے نظم و ضبط کو مجروح کرے گی اور اس کا اخلاقی جواز بھی بہت مشکوک ہوگا ہمیں اس معاملے کا دوٹوک فیصلہ کرنا چاہیے' آج تو ہم ریٹائرمنٹ کی وجہ بیان کر سکتے ہیں لیکن جس شخص کو چند ماہ بعد ریٹائر کیا جائے گا اسے اور دوسروں کو بھی ہم کیا وجہ بتائیں گے؟ اگر اس کی وجہ سازش میں ملوث ہونا ہے تو وہ تو ہمیں آج بھی معلوم ہے۔ مسٹر بھٹو نے مسٹر حفیظ پیرزادہ کی رائے پوچھی اور انہوں نے کہا' مجھے ایئر مارشل سے پورا اتفاق ہے۔" مسٹر بھٹو نے کہا: "بہت خوب' ان لوگوں کو فوراً ریٹائر کر دو" اور فائل سیکرٹری دفاع کو پکڑا دی میں نے سیکرٹری دفاع سے پوچھا کہ کیا آپ یہ احکام مجھے لکھ کر بھجوائیں گے۔ انہوں نے جواب دیا پرائم منسٹر نے فیصلہ کر دیا ہے اور آپ بغیر مزید انتظار کے اسے عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اگرچہ اس کی کوئی ضرورت تو نہ تھی لیکن یہ احتیاط کرتے ہوئے کہ کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے' میں نے پرائم منسٹر سے پوچھا: "کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے مجھے ہدایت دی ہے کہ ان لوگوں کو کل سے ہی ریٹائر کر دیا جائے؟" مسٹر بھٹو نے بلند آواز سے کہا: "ہاں' درست ہے" میٹنگ برخاست ہو گئی اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے میں نے وزیر قانون کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے میرے موقف کی تائید کی۔ ان کا جواب تھا کہ ان کا اپنا موقف بھی یہی تھا کیونکہ وہ اسی ت کو صحیح سمجھتے تھے۔

میں واپس ایئر ہیڈ کوارٹر آیا اور متعلقہ شعبے سے کہا کہ ان چودہ افسروں کی فوری ریٹائرمنٹ کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس طرح پرائم منسٹر کے فیصلے کے تین دن بعد 16 فروری کو ان لوگوں کو ریٹائر کر دیا گیا۔ مسٹر بھٹو سے میری اگلی ملاقات 22 فروری کو لاہور ایئرپورٹ پر ہوئی جب اسلامی ممالک کے سربراہان کا یکے بعد دیگرے استقبال کیا جا رہا تھا۔ ایک وقفے کے دوران وہ مجھے ایک طرف لے گئے اور پوچھا کہ کیا ریٹائر کیے گئے لوگوں کو فارغ کر دیا گیا ہے اور کیا فضائیہ میں اس کا کوئی ناگوار عمل ہوا ہے؟ میں نے بتایا کہ وہ لوگ فارغ کر دیے گئے ہیں اور کوئی ناگوار ردعمل نہیں ہوا کیونکہ سب جان گئے ہیں کہ یہ لوگ سازش میں کسی حد تک ملوث تھے اور ان کی خاطر کوئی اپنا نقصان کرنے کو تیار نہیں۔ مسٹر بھٹو کا چہرہ کھل اٹھا اور انہوں نے غیر متوقع طور پر مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے کہا: بہت خوب' بہت خوب" ان کے ردعمل سے عیاں تھا کہ انہیں خفیہ ایجنسیوں نے ڈرایا ہوا تھا کہ ریٹائرمنٹوں کے ساتھ ہی بہت سے دوسرے افسر ہمدردی کے جذبے کے تحت فضائیہ سے مستعفی ہو جائیں گے۔ یہ سن کر کہ ایسا کچھ نہیں ہوا انہیں بہت تسلی ہوئی اور انہوں نے بھرپور خوشی کا اظہار کیا۔

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ!

مارچ کے پہلے اور دوسرے ہفتے میں فضائیہ کے چند افسروں کو وزارت دفاع میں بلایا گیا لیکن مجھے اس کی اطلاع نہ دی گئی۔ پھر کچھ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ ریٹائرمنٹ کے فیصلہ کا دوبارہ جائزہ لیا جا رہا ہے۔ مجھے کسی ایسے اقدام پر سخت اعتراض تھا اور میں نے پرائم منسٹر سے ملاقات کا وقت لیا تاکہ صحیح صورت حال معلوم ہو سکے۔ میں 17 مارچ کی صبح کو پرائم منسٹر سے ملا اور بتایا کہ میں نے کیا افواہیں سنی ہیں اور یہ کہ مجھے وزارت دفاع کے رویے پر سخت اعتراض ہے۔ میری بات سنتے ہی انہوں نے کہا کہ اس میٹنگ میں وزیر مملکت دفاع اور سیکرٹری دفاع کو بھی شامل ہونا چاہیے۔ یہ لوگ پہلے ہی سے ساتھ کے کمرے میں موجود تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر بھٹو کو یہ اندازہ تھا کہ میں کیا بات کرنے آ رہا ہوں اور انہوں نے ان دو حضرات کو بھی بلا رکھا تھا۔ ان کے آتے ہی مسٹر بھٹو تقریباً خاموش ہو گئے اور میری ان دو حضرات سے گرما گرم بحث ہونے لگی۔ مسٹر عزیز احمد کا مؤقف تھا کہ ریٹائرمنٹ کا فیصلہ غلط ہے اور میں ان سے مسلسل اور پرزور اختلاف کرتا رہا۔ فضل مقیم حسب معمول ہیں ہیں اور سلگی بات کرتے رہے۔ مسٹر بھٹو بحث میں شامل نہیں ہوئے۔ کچھ دیر بعد مسٹر بھٹو نے ان دونوں کو فارغ کر دیا اور مجھ سے پوچھا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

میرا جواب تھا کہ آپ معاملے کا پورا جائزہ لے کر پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں جو میری دانست میں صحیح تھا اور اسے تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر آپ دوبارہ کوئی چھان بین کرنا چاہتے ہیں تو کسی ایسے شخص کو نامزد کریں جس پر آپ کو مکمل اعتبار ہو تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ بھال کر کے اپنی سفارشات پیش کرے۔ انہوں نے فون اٹھایا اور مسٹر حفیظ پیرزادہ سے کہا کہ وہ تمام کام چھوڑ کر فوراً ریٹائرمنٹ کے معاملے کا جائزہ لیں اور اپنی سفارشات انہیں پیش کریں اور یہ کہ وہ مجھ سے رابطہ کر کے تمام ریکارڈ دیکھیں۔ میں نے مسٹر بھٹو سے کہا کہ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میری دانست میں یہ ایک غلط اقدام ہو گا کہ پہلے فیصلے کو تبدیل کر کے کسی ریٹائرشدہ فرد کو بحال کیا جائے اور دوبارہ فضائیہ میں شامل کیا جائے۔ اس طرح نہ صرف میری پوزیشن پر زد پڑے گی بلکہ فضائیہ کے نظم و ضبط پر بھی برا اثر پڑے گا لیکن اگر انہوں نے یہی فیصلہ کیا تو میں فضائیہ کی سربراہی سے سبکدوش ہونا چاہوں گا۔ مسٹر بھٹو نے کہا کہ وہ اُمید کرتے ہیں کہ یہ معاملہ سلجھ جائے گا اور مجھے یہ قدم نہیں اٹھانا پڑے گا۔ میں نے سمجھا کہ اس زبانی بات کو تحریر کے دائرے میں لایا جائے۔ چنانچہ میں نے مسٹر بھٹو کو ایک خط لکھا جو 23 مارچ کو انہیں پہنچا دیا گیا۔ اس خط میں میں نے اپنی رائے اور پوزیشن دوبارہ بیان کی اور درخواست کی کہ اگر انہوں نے کسی ریٹائرشدہ فرد کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا تو پیشتر اس کے کہ اس فیصلے پر عمل ہو مجھے فضائیہ کی سربراہی سے فارغ کر دیا جائے تاکہ میں ریٹائر ہو سکوں۔ میرا یہ مؤقف دنیا بھر کی اس روایت کے مطابق تھا جو اصول کا درجہ حاصل کر چکی ہے کہ اگر کوئی ملٹری کمانڈر ایسی صورت سے دوچار ہو کہ کسی

افسروں کو بحال ہونا چاہئے اور اگر پہلا فیصلہ صحیح تھا تو پھر کسی کو بھی بحال نہیں ہونا چاہئے۔ سات افسروں کو ریٹائر کرنا اور سات کو بحال کرنا تو نہ ادھر کی بات ہے نہ ادھر کی۔ مسٹر بھٹو نے کہا کہ وہ سیاستدان ہیں اور انہیں سیاسی مصلحتیں بھی نظر میں رکھنی ہوتی ہیں۔ میں نے کہا آپ ضرور سیاستدان ہیں لیکن میں تو ایک فوجی ہوں اور میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں میرے نزدیک کوئی بات یا فیصلہ صحیح ہے یا غلط۔ میں اس مجوزہ فیصلے کو غلط سمجھتا ہوں اور اسے صدق دل سے قبول نہیں کرسکتا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ میں فضائیہ سے سبکدوش ہوجاؤں اور میری درخواست ہے کہ اس فیصلے پر عملدرآمد میری سبکدوشی کے بعد ہو۔ انہوں نے کہا کہ کیا میں واقعی اس معاملے کو اتنا اہم سمجھتا ہوں کہ اس کی خاطر فضائیہ سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتا ہوں؟ میں نے کہا۔ ”جی ہاں ضرور۔ اور یہ کہ ہم نے فضائیہ میں ہمیشہ اصولوں کی پاسداری کی کوشش کی ہے اور اپنے ماتحتوں کو بھی اصولوں پر کاربند رہنے کو کہا ہے۔ اب جب میں خود ایک اہم مسئلے سے دوچار ہوں تو یہ حد درجہ غلط ہوگا کہ میں اصول کو ترک کرکے مصلحت کا راستہ اختیار کروں۔ اگر میں ایسا کروں تو میرا ضمیر مجھے ہمیشہ ملامت کرے گا۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ میں فضائیہ سے علیحدہ ہوجاؤں تاکہ آپ آزادانہ اپنے نئے فیصلے کو عملی جامہ پہنا سکیں۔“ مسٹر بھٹو نے میرے متعلق چند تعریفی کلمات کہے اور کہا کہ وہ تو یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں سبکدوش ہوجاؤں لیکن اگر میرا یہی فیصلہ ہے تو وہ میری راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ اس اثناء میں کافی ختم کرچکا تھا اور میں نے پوچھا کہ کیا میں آج ہی ریٹائر ہوسکتا ہوں؟ انہوں نے کہا آپ سیکرٹری دفاع سے بات کرلیں تاکہ نیا آدمی آسانی سے چارج لے سکے پھر انہوں نے کہا کہ وہ مجھے کوئی اعلیٰ ذمہ داری سونپنا چاہیں گے۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ ان حالات میں اس موضوع پر بات کی جائے اور بات بدلتے ہوئے پوچھا کہ مجھے کس کو چارج دینا ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ یہ فیصلہ اب کرنا ہوگا کیونکہ ابھی تک حتمی طور پر معلوم نہیں تھا کہ آپ کا فضائیہ سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ اٹل ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ان سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور کہا میں آپ کو رخصت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ لمبی گیلری سے گزر کر میرے ساتھ باہر پورچ میں آئے پیچھے پیچھے ان کا اے ڈی سی جو فضائیہ کا افسر تھا چل رہا تھا۔ باہر آکر انہوں نے کار کے لئے آواز دی۔ کار آنے پر انہوں نے دروازہ کھولا اور میں انہیں آخری مرتبہ سیلوٹ کرکے کار میں روانہ ہوگیا۔

میں سیدھا سیکرٹری دفاع فضل مقیم کے دفتر گیا۔ انہوں نے مصنوعی تجسس طاری کرتے ہوئے پوچھا کیا فیصلہ ہوا؟ میں نے کہا آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں موجودہ حالات میں اپنی منصبی ذمہ داری نبھانے کے لئے تیار نہیں اس لئے پرائم منسٹر سے فیصلہ ہوگیا ہے کہ میں فوراً سبکدوش ہوجاؤں میں نے پوچھا کہ میری سبکدوشی کے متعلق کیا اعلان ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ ابھی یہ نہیں سوچا گیا اور پوچھا کہ میرا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کو سچ بولتے ہوئے یہ کہنا چاہئے کہ میں نے فضائیہ سے علیحدگی کی

درخواست کی ہے جو کہ پرائم منسٹر نے منظور کر لی ہے۔ وہ ہنسے اور کہا کہ اگر ایسا اعلان ممکن نہ ہو تو پھر کیا ہونا چاہیے۔ میں نے کہا کہ پھر صرف یہ اعلان کر دیا جائے کہ میں ریٹائر ہو گیا ہوں اور کوئی تفصیل بیان نہ کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ اعلان شام کو ہونا چاہیے تاکہ میں اس سے پیشتر پشاور پہنچ کر گھر والوں کو اطلاع دے سکوں دوسرا یہ کہ کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیے جس سے لوگ یہ نتیجہ اخذ کریں کہ میں کسی غیر ذمہ داری یا غلط حرکت کا مرتکب ہوا ہوں۔ انہوں نے کہا ایسا ہرگز نہیں ہوا اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسا غلط الزام لگایا جائے۔ اس بات چیت میں کوئی دس منٹ لگے جس کے بعد میں واپس پشاور آ گیا۔ شام نو بجے ٹیلی ویژن کی خبروں میں اعلان ہوا کہ ایئر مارشل ظفر چودھری کو ریٹائر کر دیا گیا ہے اور ان کی جگہ ایئر وائس مارشل ذوالفقار علی خان کو فضائیہ کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے۔

سیکرٹری دفاع سے یہ اتفاق ہوا تھا کہ اعلان میں کہا جائے گا کہ میں "ریٹائر ہو گیا ہوں" لیکن کہا یہ گیا کہ میں "ریٹائر کر دیا گیا ہوں۔" اگرچہ یہ اعلان متفقہ فیصلے کی خلاف ورزی تھی اور مجھے یہ بات کھٹکی لیکن ریٹائر ہونے سے ایسا سکون میسر ہوا تھا کہ میں نے اس پر اعتراض کرنا مناسب نہ سمجھا اور چپ رہا۔

میں ابھی پشاور میں سرکاری مکان خالی کر رہا تھا اور لاہور منتقل ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ میں نے اخبار میں دیکھا کہ شہ سرخیوں کے ساتھ میرے متعلق خبر چھپی ہے جسے پڑھ کر مجھے سخت دکھ ہوا اور مجھے غصہ بھی آیا۔ کہا گیا تھا کہ وزارت دفاع کے نمائندے نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا ہے کہ ایئر مارشل ظفر چودھری کو فضائیہ کی سربراہی سے اس لیے فارغ کیا گیا ہے کہ اس نے ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کورٹ مارشل کی سزاؤں میں [illegible] اضافہ کر دیا اور بغیر حکومت کی اجازت کے چند افسروں کو پیشگی [illegible] ریٹائر [illegible] کر دیا۔ یہ الزام نہ صرف غلط تھا بلکہ صریحاً جھوٹ تھا جو [illegible] سیاسی مصلحت کے تحت گھڑا گیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں نے کورٹ مارشل کی دی گئی سزاؤں میں وزیر اعظم کے مشورے سے [illegible] تخفیف کی تھی نہ کہ اضافہ۔ اور کچھ افسروں کو ریٹائر کرنے کی [illegible] میری تھی لیکن [illegible] کرنے کا حکم وزیر اعظم نے خود دیا تھا اور یہ سب کچھ وزیر قانون حفیظ پیرزادہ [illegible] کی موجودگی میں ہوا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ بعد میں یہ سن کر کہ افسروں کی ریٹائرمنٹ [illegible] کوئی ردعمل نہیں ہوا وزیر اعظم نے انتہائی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

میں نے خبر پڑھتے ہی فضل مقیم کو فون کیا اور پوچھا کہ کیا انہوں نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟ ان کا جواب نفی میں تھا۔ میں نے کہا تو ٹھہریے میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں کہ میرے متعلق وزارت دفاع کے نمائندے نے کیا کہا ہے۔ تمام بیان سن کر انہوں نے کہا کہ یہ تو غلط ہے۔ میں نے کہا

کہ صرف غلط نہیں بلکہ سراسر جھوٹ ہے اور آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کیونکہ آپ خود اس سارے معاملے کے گواہ ہیں۔ انہوں نے کھسیانے ہو کر کہا کہ انہیں بہت افسوس ہے کہ ایسا ہوا اور وہ پتہ کریں گے کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔ اور کوشش کریں گے کہ اس کا مناسب تدارک ہو۔ تدارک کیا خاک ہونا تھا کیونکہ مجھے چند دنوں بعد فضائیہ کے تعلقات عامہ کے افسر نے بتایا کہ یہ بیانات پریس کانفرنس میں سیکرٹری دفاع فضل مقیم نے خود دیے تھے! معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کی منافقت کی کوئی حد نہیں ہوتی! دوران گفتگو فضل مقیم نے یہ بھی کہا کہ وزیراعظم پوچھ رہے تھے کہ آپ کس قسم کی ذمہ داری قبول کرنا پسند کریں گے؟ میں نے غصے میں جواب دیا کہ مجھے کوئی ملازمت نہیں چاہئے اور مجھ سے ایسی بات نہ کریں آئندہ! اگر آپ کو کچھ کہنا ہو تو لکھ کر بات کریں کیونکہ مجھے آپ کی زبانی بات پر کوئی اعتبار نہیں۔ جہاں تک فضائیہ اور فضائیہ کے نئے سربراہ کا تعلق تھا انہوں نے مجھ سے لحاظ تعظیم اور خاطر داری کا سلوک کیا جس کے لئے میں ان کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ حسب روایت میرے لئے الوداعی دعوت کا اہتمام کیا گیا اور بھرپور انداز میں فضائیہ میں میری کارکردگی کو سراہا گیا۔ بعد میں انتہائی خاطر اور خلوص سے مجھے اور میرے اہل و عیال کو ہوائی جہاز سے روانہ کیا گیا۔

لاہور پہنچنے کے چند دن بعد مجھے وزیراعظم کا خط ملا جس میں انہوں نے کہا جب انسان کسی اعلیٰ منصب پر پہنچ جائے تو کچھ ایسے امور بھی پیش آ سکتے ہیں کہ بعض اوقات اسے قبل از وقت فارغ ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ کہ میری اعلیٰ پیشہ ورانہ قابلیت اور لگن ہمیشہ حکومت کی نظر میں رہی۔ وزیراعظم کی اس غیر متوقع عنایت سے خوشی کم ہوئی اور حیرانی زیادہ کہ ایک طرف تو مجھے برا بھلا کہا جا رہا تھا اور دوسری طرف میری تعریف کی جا رہی تھی!

"دُعا"

قدرت نے پوچھا "اس میں دعائیں لکھی ہیں۔ میرے کئی ایک دوستوں نے کہا تھا کہ خانہ کعبہ میں ہمارے لئے دعا مانگنا۔ میں نے وہ سب دُعائیں اس کاپی میں لکھ لی تھیں۔"

"دھیان کرنا" وہ بولے "یہاں جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔"

میں نے حیرت سے قدرت کی طرف دیکھا۔ بولے "اسلام آباد میں ایک ڈائریکٹر ہیں۔ عرصہ دراز ہوا انہیں روز بخار ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر، حکیم، وید، ہومیو سب کا علاج کر دیکھا۔ کچھ افاقہ نہ ہوا سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ آخر چارپائی پر ڈال کر کسی درگاہ پر لے گئے۔ وہاں ایک مست سے کہا بابا دعا کر کہ انہیں بخار نہ چڑھے...... انہیں آج تک پھر بخار نہیں چڑھا۔ اب چند سال سے گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی گردن اِدھر اُدھر ہلا نہیں سکتے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں یہ مرض صرف اس صورت میں دُور ہو سکتا ہے کہ انہیں بخار چڑھے۔ انہیں دھڑا دھڑ بخار چڑھنے کی دوائیاں کھلائی جا رہی ہیں مگر انہیں بخار نہیں چڑھتا۔"

دعاؤں کی کاپی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ میں نے اللہ کے گھر کی طرف دیکھا۔

"میرے اللہ! کیا کسی نے تیرا بھید پایا ہے"

(لبیک۔ از: ممتاز مفتی)

وہ ہستی جس نے ہمیں پاکستان دیا

1941ء میں جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا تھا مجھے حیدرآباد دکن جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر میں مجاہد حسین صاحب (چشتی مجاہد کے والد) جو گورنمنٹ آف انڈیا کے افسر تھے بھی شامل تھے۔ جب ہم حیدرآباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ قائداعظم محمد علی جناح بھی ایک مقدمے میں وکالت کے سلسلے میں وہاں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ مجاہد حسین صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ ایک وقت قائداعظم کے سیکرٹری کے طور پر کام کر چکے ہیں میں نے اصرار کیا کہ وہ کوئی ایسا راستہ نکالیں کہ ہم قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوسکیں۔ اس وقت تک قائداعظم ہندوستان کے مسلمانوں کے واحد رہنما بن چکے تھے اور خاص طور پر ہر نوجوان ان کی طرف انتہائی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ایک ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہیں ہم راستہ پوچھتے ہوئے وہاں جا پہنچے۔ گیٹ پر ایک چوکیدار مقرر تھا جس نے ہمارا راستہ روکا اور کسی قدر درشتی سے اعلان کیا کہ کسی کو گیٹ کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہم نے کچھ اس کی منت سماجت کی اور یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجاہد حسین صاحب قائداعظم کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن وہ نہ مانا اور چلا چلا کر ہم پر دھونس جمانے لگا۔ یہ شور ابھی جاری تھا کہ عمارت کا صدر دروازہ کھلا اور برآمدے میں وہ چہرہ نمودار ہوا جس کی تصویر ہر مسلمان گھرانے کی زینت بن چکی تھی۔

قائداعظم حسب معمول نہایت اجلا اور اعلیٰ سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے اور مجاہد حسین صاحب کو پہچانتے ہی مسکرانے لگے اور ہمیں اندر آجانے کو کہا ہمیں وہ اپنے دفتر میں لے گئے اور مجاہد حسین صاحب سے پوچھا کیسے آنا ہوا۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکا میرے سر ہوگیا تھا کہ وہ آپ کو دیکھنا چاہتا ہے اور اس غرض کے لئے میں کوئی چارہ کروں۔ یہ سنتے ہی قائداعظم میری جانب گھومے اور انگریزی میں کہا "تو میاں اب اچھی طرح دیکھ لو" ان کی شخصیت میں کمال جاذبیت تھی اور ان کے چہرے سے نظر ہٹانا مشکل تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں پڑھتا ہوں اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیا کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرا جواب کچھ گول مول تھا جس پر انہوں نے کہا "اپنی تعلیم پر پوری توجہ دو اور پھر جس کام کا بھی انتخاب کرو اسے اعلیٰ طریق سے انجام دو۔" پھر انہوں نے آواز دی: "فاطمہ! ان لوگوں کے پینے کے لئے کچھ لاؤ۔" جلد ہی ایک معمر خاتون ٹرے میں دو گلاس شربت لے کر آئیں اور ہمیں پیش کیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ہستی قائداعظم کی ہمشیرہ ہیں جنہوں نے ہمیں یہ کمال عزت بخشی ہم کوئی دس منٹ تک قائداعظم کی خدمت میں حاضر رہے لیکن میں کئی دنوں، ہفتوں اور مہینوں تک ہر کس و ناکس کو انتہائی فخر سے بتاتا رہا کہ میں نے ابھی قائداعظم کو دیکھا ہے اور ان سے باتیں بھی کی ہیں۔

قائداعظم 1945ء میں پشاور تشریف لائے جن دنوں میں وہاں فضائیہ کے ایک یونٹ میں متعین تھا وہ دہلی سے انڈین نیشنل ایئرویز کی اس پرواز سے آرہے تھے جو دوپہر کے وقت پشاور پہنچتی تھی اور

جس پر کوئی چودہ پندرہ سیٹوں والا جہاز چلتا تھا۔ قائداعظمؒ کی متوقع آمد کے سبب ہندوستانی افسروں میں خاصی گرما گرم بحث ہونے لگی جو کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ ناخوشگوار بھی ہو جاتی اور جس میں ہمارے ساتھ کے چند ہندو افسران کا گہرا تعصب بھی نمایاں ہو جاتا۔ جس دن قائداعظمؒ کو آنا تھا اس روز پھر خاصی تکرار ہوئی جس کے اختتام پر ایک بنگالی پائلٹ بنام بھاسکرن دت نے اعلان کیا: "آج میرے جہاز کی مشینیں گنیں لوڈ ہوں گی اور میں اس جہاز کو مار گراؤں گا جس میں جناح آرہا ہے۔" یہ سُن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے اسے للکارا: "بچو میرا جہاز تمہارے ساتھ چلتا رہے گا اور پیشتر اس کے کہ تم اس جہاز کے پاس پھٹکو میں تمہیں مار گراؤں گا۔" میں نے اس کے ساتھ ہی ٹیک آف کیا اور اس کے جہاز کو ایک لمحے کے لئے نظر سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ بھاسکرن دت کی دھمکی خالی بڑ ہی ثابت ہوئی اور قائداعظمؒ کا جہاز بخیریت پشاور پہنچ گیا۔ تاہم اس واقعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ بعض ہندو کتنے متعصب اور کج ذہن کے مالک تھے۔ اور اس نقطہ نظر کو بھی تقویت ملتی ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کی اصل ذمہ داری درحقیقت اکثریتی مذہب کے متعصب اور غیر روادار عناصر پر عائد ہوتی ہے نہ کہ مسلمانوں پر۔

قائداعظمؒ کا پشاور میں نہایت عالیشان استقبال ہوا اور شام کو انہوں نے اسلامیہ کالج میں ایک جلسے سے خطاب کیا۔ فضائیہ کے اکثر مسلمان افسر بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ ان کی شمولیت ایک عظیم لیڈر کی تعظیم اور ان سے عقیدت کا اظہار تھا اور ان کی غرض ہرگز یہ نہ تھی کہ وہ کسی سیاسی کارروائی میں حصہ لیں۔ قائداعظمؒ کی تقریر کا خاص نقطہ یہ تھا کہ وہ انگریزی حکومت سے یہ وعدہ حاصل کر چکے ہیں کہ وہ اس وقت تک ہندوستان کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے جب تک کوئی ایسا سیاسی حل نہ ڈھونڈ لیا جائے جسے مسلم لیگ بھی قبول کرے۔ سامعین نے اس تقریر اور یقین دہانی کا انتہائی جوش سے خیر مقدم کیا اور سب خوشی خوشی واپس لوٹے۔

آخری مرتبہ میں نے قائداعظمؒ کو اپریل 1948ء میں ان کے رسالپور کے یادگار دورے کے دوران دیکھا۔ پہلے انہوں نے فضائیہ کی ایک پریڈ کا معائنہ کیا اور پھر جب ہمارے میس میں ناشتے کے لئے تشریف لائے تو فضائیہ کے افسروں کے ساتھ ایک تصویر کھنچوائی جو اب ایک قیمتی یادگار بن چکی ہے۔ پھر انہوں نے بری فوج کی پریڈ کی سلامی لی جو کوئی دو گھنٹے جاری رہی۔ کمزوری کے باوجود وہ تمام وقت سیدھے کھڑے رہے یہ ان کی قوت ارادی اور ہمت کا ایک بین ثبوت تھا۔ ویسے ان کی یہ خصوصیات پہلے ہی ضرب المثل بن چکی تھیں۔ فضائیہ کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا "طاقتور فضائیہ کے بغیر کوئی بھی ملک حملہ آور کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ پاکستان کو اپنی فضائیہ بہت جلد منظم کرنی ہے اور یہ فضائیہ اپنی کارکردگی میں کسی سے بھی کمتر نہیں ہونی چاہئے" یہ الفاظ اب تک ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

"خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں"

husain_sayyed2001@yahoo.com

قلندر حسین سید سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گزشتہ کئی ماہ سے وہ اپنی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جا رہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سید نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے چند اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی کھٹاس، کونین کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

"دیکھا پڑھا اور طاق نسیاں کر دیا"

○ اگر معاشرے میں دیکھا جائے تو ہر شخص اپنی غلطیاں پس پشت ڈال کر صرف دوسروں پر تنقید کر رہا ہے۔

○ یہ کیسا دور ہے کہ یہاں ولی اپنے ذہن سے اتنا دکھی نہیں جتنا دوسروں کے منہ سے دکھی ہے۔

○ موت تکلیف دہ ہے مگر اتنی نہیں جتنی زندگی

○ مسجد کے منبر میں بیٹھ کر کڑک نبھے میں لوگوں کے ذہن میں قیامت کا خوف بھرنے والے ملاں شاید تم کو معلوم نہیں کہ یہاں ہر مفلس کا بھوکا پیٹ ایک نیا درد قیامت برپا کرتا ہے۔

(مولانا عبید اللہ سندھی)

○ مرد کی سب سے بڑی دشمن جہالت نہیں بلکہ سب کو معلوم ہونے کی خوش فہمی ہے۔

(سفیان ...)

○ کائنات میں جب دوسرا شخص پیدا ہوا تو پہلے کے حقوق آدھے رہ گئے۔

○ کسی بھی حالت میں اپنا وصلہ مت چھوڑیں کیونکہ لوگ گرے ہوئے مکان کی اینٹیں بھی اٹھا لے جاتے ہیں۔

○ صبح کو شمع بجھنے پر جو سورج نکلا وہ روشنی۔

ساتھ حوصلہ دینے والی تمازت بھی لایا۔

O پاکستان کی بدقسمتی یہ رہی یہ ملک ابتدا ہی سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہا۔ کبھی قانون ٹوٹے، کبھی روایات ٹوٹیں، کبھی اسمبلیاں ٹوٹیں، کبھی آئین ٹوٹا، حتیٰ کہ ملک تک ٹوٹ گیا۔ اتنی ٹوٹ پھوٹ کے بعد باقی آدھے ملک کا بچے رہنا ایک معجزے سے کم نہیں۔

"طلسمات فرنگ"

(سفرنامہ) علی سفیان آفاقی کی کتاب سے اقتباس

ہم نے ٹورنٹو کے ایک وزیر صاحب سے پوچھا تھا کہ حضور آپ کے ملک میں بے انتہا خالی زمین پڑی ہوئی ہے مگر آپ پھر بھی باہر سے آنے والوں کو اجازت دینے کے سلسلے میں اس قدر کنجوسی سے کام لیتے ہیں آخر کیوں؟ وہ بولے دیکھئے پہلے ہم آبادیاں بناتے ہیں۔ باہر سے آ کر کوئی آباد ہوگا تو اسے گھر بھی درکار ہوگا۔ پانی، بجلی، سڑک، ٹرانسپورٹ، بچوں کے لئے سکول اور بڑوں کے لئے روزگار، علاج کے لئے ہسپتال، یہ سب چیزیں ضرورتیں جب فراہم ہو جاتی ہیں تو پھر اس حساب سے لوگوں کو آنے کی اجازت دیتے ہیں یعنی ہر معاملے میں منصوبہ بندی سے کام لیا جاتا ہے۔ وہ لوگ سو دو سو سال پہلے ہی آنے والے حالات کے لئے منصوبہ بندی کر لیتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہے کہ سال میں لاکھوں کروڑوں کی لاگت سے ایک پل بناتے ہیں جو پانچ سال بعد ضرورت کے لئے ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ نئی بستیاں آباد کرتے ہیں جہاں سڑکیں اتنی تنگ ہوتی ہیں کہ دو سال بعد ہی آمد و رفت دشوار ہو جاتی ہے۔ ہمارے تو عجیب و غریب طور طریقے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے حکمران بھی دوکر بہت سرمایہ دار، تاجر کھاتے پیتے لوگ بھی دنیا

بھر کی خاک چھانتے پھرتے ہیں مگر قسم لے لیجئے جو کہیں سے کوئی کام کی بات سیکھ کر تو آ جائیں۔

ایک دن ننھا اور اس کا پوتا دونوں گھر سے گھومنے پھرنے کی غرض سے نکلے ہیں اور شاپنگ پلازا میں ایک جگہ بیٹھے سستا رہے ہیں۔ ننھا اپنے پٹھانی لباس، کلاوہ اور پشاوری چپل کے علاوہ اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے بھی سب کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ پوتا ایک عدد آئس کریم کی فرمائش کرتا ہے جو دادا جان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ خالص امریکن لب و لہجے میں انگریزی بول رہا ہے۔ ادھر خان صاحب اپنی پشتو نما زبان بول رہے ہیں۔ آخر ایک پاکستانی برابر سے گزرتے ہوئے انہیں بتاتا ہے کہ بچہ آئس کریم کھانا چاہتا ہے۔ خان صاحب سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ خوچہ ہم تو اپنے پوتے کا فرمائش بھی نہیں سمجھتا ہے کتنے شرم کا مقام ہے۔ ننھا کو گھر میں بہو کے ساتھ بھی زبان کی پرابلم پیش آ رہی تھی اور پوتے کے ساتھ بھی مشکل تھی۔ وہ تنگ آ کر کہتے تھے کہ او خانان تمہارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ ایک دوسرے کی بات تک نہیں سمجھ سکتا۔ پھر سب سے بڑی مشکل عورتوں کے لباس کی تھی۔ ننگی ٹانگیں اور کھلے بازو دیکھ خان صاحب آنکھیں بند کر لیا کرتے تھے۔ ایک بار اس کی وجہ سے ٹریفک حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچ گئے۔ چلئے باہر والوں پر تو ان کا کوئی بس نہیں چلتا تھا مگر گھر میں بہو بھی ایسا ہی بے شرمی والا لباس پہنتی تھی تو وہ دانت پیس کر رہ جاتے تھے۔ بیٹے سے کہتے تھے کہ تم اس کا تن ڈھانپو اسے شلوار قمیص اور دوپٹہ بنا کر دو۔ کتنا شرم کا مقام ہے کہ ہمارا بہو ننگا پھرتا ہے۔

خان صاحب اس وقت کو یاد کر کے پچھتاتے تھے جب انہوں نے زمین اور مکان بیچ کر بیٹے کو پڑھنے کے لئے امریکہ بھیجا تھا وہ کہا کرتے تھے کہ

ان کا تو زمین جائیداد بھی گیا۔ بیٹا بھی گیا اور شرم و حیاء بھی چلا گیا۔

پرتگال کا تاریخی شہر لزبن

کرہ ارض پر بے شمار خوب صورت اور سحر انگیز مقامات موجود ہیں جو دیکھنے والوں کو اپنا اسیر کر لیتے ہیں۔ لیکن ان خوب صورت مقامات پر کچھ ایسے خوف ناک مناظر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں' جو کسی کو بھی خوف زدہ یا ہراساں کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ آپ کبھی پرتگال کے خوب صورت و تاریخی شہر لزبن گئے ہیں تو آپ یقیناً ہاں یا ناں میں جواب دیں گے۔ اگر نہیں گئے تو لزبن سے آشنا اس کی تعریفوں کے پل باندھ دے گا۔ یہ شہر نہ صرف تاریخی اہمیت کا حامل ہے بلکہ یہاں مختلف قسم کے خوب صورت نظاروں کے ساتھ خوف ناک مناظر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں دنیا بھر سے سیاح قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے ہیں اور اس کی خوب صورتی کے سحر میں جکڑ جاتے ہیں۔ قدیم پرتگال کا شہر لزبن تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ پانچویں صدی میں جرمن قبائل اور آٹھویں صدی کے بعد مور حکمرانوں کے زیر تسلط رہا۔ 1147 میں صلیبی جنگجوؤں نے اسے دوبارہ فتح کیا۔ یہ وہی پرتگال ہے جہاں سے واسکوڈی گاما نے یورپ سے جنوبی افریقہ کے سفر کے دوران ہندوستان تک کا بحری راستہ دریافت کر کے تجارت کی نئی راہیں کھولیں۔ واسکوڈی گاما 1469ء میں پرتگال میں پیدا ہوئے۔ 1524ء میں کوچی ہندوستان میں وفات پائی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود اب تک لزبن' پرتگال کا دستاویزی نہیں بلکہ محض ڈی فیکٹو دارالحکومت ہے۔ پرتگال کی سرکاری زبان پرتگالی ہے اور یہی برازیل' موزمبیق' انگولا سمیت براعظم امریکہ کے کئی ملکوں کی بھی سرکاری زبان ہے۔ کیونکہ ان ممالک کو بھی پرتگال کے باشندوں نے آباد کیا تھا۔ لزبن شہر کی آبادی کم از کم 5 لاکھ 52 ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ رقبہ 958 مربع کلومیٹر ہے۔ بحر اوقیانوس اور دریائے ٹاگوس کے کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ ایک بہترین تجارتی مرکز کہلاتا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق سیاحوں کی تعداد کے لحاظ سے یہ یورپ کا ساتواں زیادہ دیکھا جانے والا شہر ہے۔ لزبن لندن' پیرس اور روم سے بھی قدیم شہر ہے۔ شہنشاہ جولیس سیزر نے اسے میونسپل شہر کا درجہ دے کر فلیسیتاز جولیا کا نام دیا تھا۔

(سید نوید عباس کا کالم
جنگ سنڈے میگزین سے)

"لانگ مارچ"

اکتوبر 1934ء میں ایک لاکھ کمیونسٹ سپاہی لانگ مارچ پر روانہ ہوئے تھے۔ ان میں سے صرف پانچ ہزار ہی صحیح سلامت شمالی چین کے صوبے شی نان تک پہنچ سکے۔ 95 ہزار سفر کی کٹھن راہوں میں لقمہ اجل بن گئے۔ چینی فوج کا ہر سپاہی شجاعت کا پیکر تھا۔ وہ جفا کشی' نبرد آزمائی' خطر پسندی کی بھٹی سے کندن بن کر نکلا تھا۔ لانگ مارچ کے روح پرور کارنامے سے سامراجی اور سرمایہ دارانہ جور و جفا کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کے دلوں میں صدا عزم و حوصلہ کی روح پھونکتے رہیں گے۔ لانگ مارچ فکری و عملی ہیجانات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ بن گیا ہے اور اسے انقلابی جدوجہد کی ایک درخشاں علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شرکت کرنے والے ہزاروں افراد کا حوصلہ بہت ولولہ انگیز تھا۔ یہاں ہم ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جسے لوگ وسعت نظر کے ساتھ رنگ مارچ میں درج کیا ہے۔ ... دل ہم مڑ کے روانہ ہوئے۔

چیئرمین ماؤزے تنگ کسی کام تو رک گئے اور حفاظتی کمپنی سٹاف کی معیت میں جانے کے بجائے میڈیکل کور میں شامل ہو کر آگے بڑھے۔ حفاظتی دستے کا سکواڈ لیڈر اور میں ان کے ساتھ تھے۔ ہم ایک کھلی وادی میں سے گزر رہے تھے جو میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک دشمن کے تین ہوائی جہاز نمودار ہوئے اور انہوں نے غوطے لگا کر ہم پر بم برسائے جو ہمارے قریب ہی گر کر پھٹے۔ ہم چیئرمین ماؤزے تنگ کو بچانے کے لئے لپکے۔ چیئرمین فی الفور اٹھ کھڑے ہوئے اور سکواڈ پر جھک گئے جس نے زخم کھایا تھا۔ سکواڈ لیڈر اپنے شانے کو تھامے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ چیئرمین نے نرمی سے ان کا کندھا چھوا اور میڈیکل آفیسر سے کہا "کیا تم اس کے لئے کچھ کر سکو گے؟"

سکواڈ لیڈر نے طبی امداد لینے سے انکار کر دیا اور کہا:

"نہیں نہیں، آپ آگے بڑھ جائیں۔"

اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کے بدن کا سارا لہو نچڑ گیا ہے۔ چیئرمین اس کے پاس بیٹھ گئے اور اس کا سر اٹھا کر کہا:

"کامریڈ ہو چنگ پاؤ! تم اچھے ہو جاؤ گے۔ بس چپکے لیٹے رہو۔ ہم تمہیں اٹھا کر شوٹ میں لے جائیں گے جہاں ڈاکٹر تمہارا علاج کریگا۔"

میرے سکواڈ لیڈر نے اپنے سر کو جو چیئرمین نے تھام رکھا تھا ہلاتے ہوئے کہا "میں نہیں چاہتا کہ آپ مجھے اٹھانے کے لئے تکلیف اٹھائیں۔ آپ زحمت نہ کریں مجھے یوں لگتا ہے جیسے موت میرے اندر گھر رہی ہے۔ آپ میرے بارے میں فکر نہ کریں۔ میں اپنے حاصل پر راضی ہوں۔ ہاں میرے خاندان کے لوگ جو کیان کیانگسی میں رہتے ہیں خبر کر دیجئے گا۔ مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ میں آپ کی ہمراہی میں شنگھائی نہیں جا سکا اور نہ ہی پڑاؤ کو دیکھ نہیں سکا۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا پھر بڑی مشکل سے سانس لیا اور میری جانب دیکھ کر بولا "چیف چانگ تنگ! چیئرمین ماؤ سے تنگ اور دوسرے لیڈروں کا خیال رکھنا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی اور ہم نہ سمجھ سکے کہ وہ کیا بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے پھر بولنے کی کوشش کی ہم نے اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھے۔ اچانک بڑی کوشش سے آواز بلند پکار کر کہا "انقلاب کی جے۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ "سکواڈ لیڈر! سکواڈ لیڈر!" میں چلایا وہ مر چکا تھا۔

چیئرمین نے اپنا بازو اس کی بغل سے نکالا اور کھڑے ہو کر مجھ سے کہا "لاؤ ایک رضائی"

میں نے بستر بند میں سے رضائی نکال کر انہیں دی چیئرمین نے نعش کو اس سے ڈھانپ دیا۔

بعد میں جاپانی حملہ آوروں کے خلاف لڑتے ہوئے جب بھی لانگ مارچ کا کوئی ہیرو گولی کھا کر گرتا تھا تو وہ اپنی لانگ مارچ والی سرخ ٹوپی اپنے کسی ساتھی کو دے کر مرنے سے پہلے کہتا "اس ٹوپی کی لاج رکھنا" ان عظیم کارناموں کی روح رواں اور سرخ فوج کے قائد چیئرمین ماؤزے تنگ کو لانگ مارچ کے دوران جو عظمت حاصل ہوئی وہ تاریخ عالم کے صفحات پر نقش دوام بن کر ثبت ہو چکی ہے۔

1946ء میں جاپانیوں کی شکست کے بعد چین میں دوبارہ خانہ جنگی چھڑ گئی۔ جس میں کومن تانگ کو شکست فاش ہوئی اور چیئرمین ماؤزے تنگ نے یکم اکتوبر 1949ء کو اشتراکی انقلاب کی کامیابی کا اعلان کیا۔ چیئرمین کی رہنمائی میں چینی کمیونسٹوں

نے اپنی معاشی اور سماجی مشکلات پر قابو پانیا اور دن رات محنت کر کے چین کو ایک عظیم صنعتی ملک بنا دیا۔
("تاریخ کا نیا موڑ" علی عباس جلالپوری کی کتاب سے اقتباس)

"اونٹ"

چند دن پہلے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ کلفٹن آپ نے دیکھا ہوگا وہاں بھی اونٹ پر بیٹھنا۔ اونٹ پر بیٹھنے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اٹھنے کے انداز میں دوسرے جانوروں سے مختلف ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنی پچھلی ٹانگیں کھڑی کرتا ہے۔ دنیا کے سارے دوسرے جانور اگلی ٹانگیں پہلے کھڑی کرتے ہیں اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اوپر بیٹھنے والا سب سے پہلے سجدہ کرتا ہے۔ یہ اللہ نے اس کا کام رکھا ہے۔ آدمی چاہے یا نہ چاہے سجدہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہوتا ہے ہم نے کافی وقت ان اونٹوں کے ساتھ گزارا لیکن میرے ساتھ عجیب و غریب واقعات گزرتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ نہیں پتہ تھا کہ اس اونٹ کے رشتے سے اور اس کے حوالے سے بھی میں یوں ایک الجھن میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ اونٹ کے بارے میں بھی قرآن پاک میں کہتا ہے کیا تم نے اونٹ کو دیکھا ہے کہ کس طرح کا جانور بنایا۔ یعنی اس کے عجائب و غرائب ابھی تک پوشیدہ ہیں اور سارے کے سارے اس کے محاسن لوگوں کے سامنے نہیں آئے۔ اتنا ہم جانتے ہیں کہ یہ میلوں اور دنوں تک سفر کرسکتا ہے۔ پانی کے بغیر۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ لیکن یہ اپنے انداز کا بڑا ہی خوب صورت جانور ہے۔ بے حد خوب صورت اگر آپ نے اسے بھی غور سے نہیں دیکھا اب آپ کو موقع ملے تو اسے ضرور دیکھئے گا۔ اللہ کرے آپ جائیں یا آپ گئے ہوں گے۔ جدہ سے مدینہ جاتے ہوئے بڑی خوب صورت سڑکیں ہیں، کہیں کہیں ریگستان کے لق و دق ٹوٹے اور کچے علاقے آ جانے پر آپ کو چلتے پھرتے اونٹوں کی کچھ قطاریں نظر آئیں گی ان کے مالکوں نے کھلے چھوڑے ہوتے ہیں۔ چاندی جیسی ریت پر جیسے چاندی سے بدن لے کے دھوپ کے اندر ایک عجیب شان دکھاتے ہوئے چلتے ہیں وہ نظارہ دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ہم بس پر سفر کر رہے تھے اور بس سے سر نکال نکال کر باہر دیر تک ان کو دیکھتے تھے۔ اللہ نے کیسی خوبصورت مخلوق پیدا کی ہے اس کے بارے میں ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے اس سلسلے میں مجھے کچھ یاد آیا۔ پاکستان میں جب امریکہ کا صدر آیا ابھی تک شاید ایک ہی آیا ہے جس کا نام (LINDON B JHONSON) تھا۔ وہ کراچی گیا تو جس چیز نے لنڈن بی جانسن کو متاثر کیا وہ عجیب چیز اونٹ تھا۔ ہماری بہت گاڑیاں تھیں جو سامان اسباب لے کر حرکت میں کام آتی تھیں، بہت سارا سامان ڈھوتی تھیں اونٹ گاڑیاں تھیں یہ 1952-53ء کی بات ہے وہ اونٹ سے اتنا متاثر ہوا تو اس نے کہا میں تو اونٹ امریکہ لے جاؤں گا اور اس کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اونٹ تو نہیں لے جاسکا اس اونٹ کا ساربان جو کہ شتربان تھا بشیر، اس کو ساتھ لے گیا۔ اور بشیر بیچارے کو بڑی مصیبت پڑی اور وہ روتا تھا کہ اونٹ کی وجہ سے مجھے امریکہ جانا پڑ رہا ہے وہ امریکہ جانے سے گھبراتا تھا کہ مجھے وہاں کی بولی نہیں آتی۔ اخبار میں بیان دیا میں وہاں جا کر کیا بات کروں گا۔ امریکہ جا کر مجھے کیا لینا ہے مجھے اونٹ گاڑی چلانی ہے الغرض اس کو جانا پڑا۔ اس نے نئی روئی ٹوپی خریدی اگر آپ نے تصویریں دیکھی ہوں تو بے چارے نے یہ کچھ کیا وہ آزاد آدمی تھا۔

سگریٹ سے نکل کر فضا میں پھیل جاتا ہے۔ یاد رکھیے فضا میں پھیلنے والے دھوئیں میں نقصان پہنچانے والا مادہ بھی زائد مقدار میں پایا جاتا ہے۔ نیز یہ دھواں ان افراد کے لئے بھی خطرناک ہے جو سگریٹ تو نہیں پیتے البتہ پینے والوں کے ساتھ موجود ضرور ہوتے ہیں ان دھوئیں سے بھی کئی خطرناک عوارض لاحق ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ ان میں نمونیا، پھیپھڑوں کا سرطان اور برونکائٹس شامل ہیں۔ اگر والدین سگریٹ کے عادی ہیں تو لامحالہ بچوں کے اس لت میں مبتلا ہونے کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ علاوہ ازیں تمباکو میں نائیٹروجن، آرسینک، ہائیڈروجن، سمیت سرطان پیدا کرنے والا کیمیکل کاربن نوجن بھی پایا جاتا ہے۔

سگریٹ نوشی کے علاوہ آج کل خصوصاً نوجوان لڑکے لڑکیوں میں شیشے کا استعمال بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے واضح رہے کہ شیشہ نوشی کے باعث پھیپھڑوں اور دل کے امراض کے خدشے کے ساتھ ساتھ ایک ہی پائپ سے منہ لگا کر پینے سے ٹی بی، ہیپاٹائٹس اور گردن توڑ بخار جیسے دیگر متعدی عوارض لاحق ہونے کا بھی احتمال ہوتا ہے۔

(ڈاکٹر اقبال پیرزادہ کی تحریر جنگ میگزین ڈاٹ کام سے)

"برٹرینڈ رسل"

بیسویں صدی کے عظیم فلسفی برٹرینڈ رسل نے آخری عمر میں دعوتوں میں جانا قریباً ترک کر دیا تھا۔

ایک مرتبہ رسل سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا "تقاریب کا مصنوعی ماحول اور رسمی دعوتیں وقت کا زیاں ہیں۔ اونچی سوسائٹی کے لوگ عموماً اوپری گفتگو کرتے ہیں جو بنیادی فہم سے خالی ہوتی ہے اور وقت ضائع ہونے کے ساتھ مجھے اشرافیہ کی اس کھوکھلی گفتگو سے کوفت بھی ہوتی ہے۔

"انصاف میں تاخیر"

میں نے اپنی نظر بندی کے دوران جیل میں بہت سے قیدیوں سے ملاقات کی تھی۔ اس طرح سے جب پولیس کی بند گاڑی میں ہم عدالت جاتے تو کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ دیگر مقدمات کے قیدی بھی ہمارے ہمراہ ہوتے جن سے گفتگو کے دوران مجھے کئی باتوں کا پتہ چلا۔

قیدیوں کے ذہنی احوال اور ان کی نفسیات معلوم کرنے کا ماحصل یہ ہے کہ قیدیوں کے لئے سزا بھگتنے کی اذیت کہیں زیادہ سخت ہوتی ہے اور پیشی کے لئے بار بار کوئی تاریخ ملنے پر ملزم قانون کا احترام کرنے کے بجائے اس سے باغی ہوتا چلا جاتا ہے اور اگر اس نے کوئی جرم کیا بھی ہوتا ہے تو اس پر ندامت کو بھول کر انصاف میں تاخیر کا شاکی ہو جاتا ہے۔

عدالتوں کے قائم کرنے کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ قانون کی عظمت وصولت اور اس کے وقار سے مجرم ہیبت زدہ ہو جائے تاکہ آئندہ جرم کا ارتکاب کرنے کی جرأت نہ کرے اور جرم کی سزا جو اسے دی جائے وہ تازیانہ عبرت ثابت ہو لیکن ہوتا یہ ہے کہ اسکے برعکس وہ ملزم سے مجرم بننے تک اپنے کردہ یا نہ کردہ گناہ کی اتنی سزا بھگت چکا ہوتا ہے کہ اس کے اندر کا انسان تمام کارروائی کو ناانصافی قرار دیتا ہے۔

مجھے قتل کے جرم میں ایک سزا یافتہ قیدی سے ملنے کا موقع ملا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ "تمہارا بیٹا کیا کرتا ہے۔" اس نے بڑی خوشی اور مسرت کے لہجے میں جواب دیا کہ "وہ بی اے میں پڑھتا ہے۔" پھر جب میں نے اس سے پوچھا کہ تم اسے کیا بنانا چاہتے ہو؟ تو اس نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ وہ ایک کامیاب وکیل بنے۔

اسی طرح قتل ہی کے مقدمے میں ماخوذ ایک موکل کی بیٹی بھی زیر تعلیم تھی۔ وہ ڈاکٹری کے آخری

سال (فائنل ایئر) کا امتحان دے رہی تھی اس شخص کی زبان سے اپنی بیٹی کے لئے جو تعریف کے الفاظ ادا ہوئے اگر آپ بھی سنیں تو کہیں کہ صرف بیٹی ہی اس کی دنیا تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی ڈاکٹر بن کر کلینک کھولے اور دکھ درد کے مارے لوگوں کی مخلصانہ خدمت کرے۔ ایسے ہی ایک اور مجرم سے بھی مجھے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جو اپنے چھوٹے بھائی سے بڑی امیدیں لگائے بیٹھا تھا۔

مختصراً یہ کہ میں نے کبھی کسی غلط کار سے یہ نہیں سنا کہ وہ اپنی اولاد کو بھی اپنی ہی راہ پر ڈالنا چاہتا ہے۔ ہر کسی نے اچھے مستقبل ہی کی ٹھان رکھی تھی اور اس کی مثبت فکر اور سوچ اچھی تھی۔ ان میں سے ہر ایک اپنے دوسرے کے لئے بھلائی اور اچھائی کا طالب تھا ہر ایک نیکی اور سرفرازی کی بات کرتا تھا۔ الغرض میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ ہر شخص میں نیکی، بھلائی اور اچھائی کا جذبہ ہر حالت میں باقی رہتا ہے۔ اسے غیر صالح کہہ کر نظر انداز کرنا غیر معقول بات ہے۔

ہماری رٹ یہ تھی کہ ہمیں نظر بندی کی وجوہات سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ مزید برآں یہ کہ نظر بندی بدنیتی پر مبنی ہے کیونکہ ہم موجودہ حکومت کے منی مارشل لاء کے فیصلے کو قومی اتحاد کی جانب سے چیلنج کرنے والے تھے۔ اس لئے ہمیں اس سے روکنے کے لئے ہماری نظر بندی کا حکم دیا گیا ہے۔

رٹ کے جواب میں عدالت کو بتایا گیا کہ مجھے ڈیفنس آف پاکستان رولز نمبر 213 کے تحت نظر بند کیا گیا ہے کیونکہ "میری حرکات" ملک کے امن و امان کے خطرے کا باعث تھیں۔ یہ جواب سن کر مجھے بڑی ہنسی آئی کہ حکومت وقت اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ میرے جیسے قانون کے پابند انسان کے روز مرہ معمولات (حرکات) سے بھی انہیں امن وامان خطرے میں دکھائی دیتا ہے۔

ہوم سیکرٹری نے حکومت کی اس رائے کے حق میں دو ثبوت مہیا کئے کہ میں نے لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی ایک قرارداد مورخہ 22/2/79 کو منظور کرنے کے لئے اجلاس میں شرکت کی جس میں یہ اپیل کی گئی کہ حکومت کے خلاف احتجاج برابر جاری رہے اور 23 مارچ کی تاریخ کو ملک کے لئے "یوم سیاہ" قرار دیا گیا جبکہ اس روز قومی اسمبلی کے منتخب ارکان کو اپنی رکنیت (عہدے) کا حلف اٹھانا تھا۔ دوسرا ثبوت یہ پیش کیا گیا کہ میں نے 23/4/77 کو قومی اتحاد کی کونسل کی میٹنگ میں شرکت کی جہاں حکومت کے خلاف قرارداد منظور کی گئی جو لاہور میں منی مارشل لاء کے خلاف تھی اور میں نے قومی اتحاد کی جنرل کونسل کو یہ رائے دی تھی کہ یہ منی مارشل لاء آئین کے خلاف لگایا گیا ہے۔

اتفاق سے ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن لاہور کی جانب سے جس روز بار روم میں قرارداد منظور ہوئی تھی میں اس روز بار روم میں گیا ہی نہیں تھا۔ جج صاحب نے لکھا کہ ایم قصور کے بار روم میں قرارداد کے روز موجود ہونے کا کوئی ثبوت حکومت نے پیش نہیں کیا اور اس کے بغیر ہی نظر بندی کا حکم دیا ظاہر کرتا ہے کہ نظر بندی کا یہ حکم قانون کے مطابق نہیں۔

اب یہ مقدمہ ماضی کی ایک داستان بن چکا ہے لیکن تکرار کے باوجود یہ لکھنا لازم ہے کہ پولیس آفیسران اگر معروف وکیل کے بارے میں یہاں تک لکھ سکتے ہیں کہ انہوں نے قرارداد پیش کی یا اس کی تائید کی جبکہ وہ اس روز وکلاء بار روم میں فی الواقع موجود ہی نہیں تھے تو ایک عام شہری ان کی دسترس سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس طرح کا ہی طرز عمل پولیس کو عوام کی نگاہوں سے گرا دیتا ہے اگر پولیس سفید جھوٹ بولنا شروع کر دے تو وہ جھوٹ

بولنے والے کو سزا کس طرح دلا سکے گی۔ یہ واقعہ یہ اصول بھی مرتب کرتا ہے کہ عدالت کو حکومت کی ہر بات نہیں مان لینی چاہئے اور خود متعلقہ افسران سے سوال و جواب کر کے اطمینان کر لینا چاہئے پاکستان کے کلچر اور ماحول میں جھوٹ اتنا داخل ہو گیا ہے کہ انصاف کرنا بہت دشوار ہو چکا ہے۔

(میرے مشہور مقدمے"
ایس ایم ظفر کی کتاب سے اقتباس)

"کلام اقبال"

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
تیرے دین و مذہب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری
(ارمغان حجاز)

"کلام پروین شاکر"

جہاں سوال کے بدلے سوال ہوتا ہے
وہاں سے محبتوں کا زوال ہوتا ہے
کسی کو اپنا بنانا ہنر ہی سہی
کسی کا بن کے رہنا کمال ہوتا ہے
(فیس بک ڈاٹ کام سے)

صبح کے وقت تخت نشیں شام کو مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا
(بہادر شاہ ظفر)

بند جگنو اک ہے خوشی کے لئے شعور
کانٹے بغیر پھول کھلاتی نہیں بہار
ہوتی ہے روشنی بھی مگر تیرگی کے بعد
پہلے خزاں نہ آئے تو آتی نہیں بہار
(انور شعور)

"حکومت' والدین طلباء و اساتذہ سب بگاڑ کے ذمہ دار ہیں!"

اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو سب سے پہلے اس قوم میں تحقیق و آگہی کا ذوق ختم ہو جاتا ہے۔ عوام کتاب چھوڑ کر کھیل تماشے' تفریح اور کھانے پینے کے شوقین ہو جاتے ہیں۔ علم کی فضیلت اور اہمیت کو فراموش کر دیتے ہیں اور ان کا مقصد زندگی' ہوس زر اور معیار زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے تک محدود ہو جاتا ہے۔ علم' کتاب اور قلم سے کنارہ کشی کے نتیجے میں یہ علمی زوال بتدریج ان کی معاشرتی و سماجی زندگی کے تمام شعبوں کی بنیادوں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے وہ اختراع و ایجاد تخلیق اور تنوع اور علمی سرگرمیوں کے بجائے جھوٹی شان و شوکت دکھاوے اور نام و نمود میں پڑ کر رفتہ رفتہ اخلاقی اقدار کھو بیٹھتے ہیں۔ موقع پرستی' مفاد پرستی' خود غرضی' انانیت پسندی' بدعنوانی' بدمعاشگی' وعدہ خلافی' بے حسی و سنگ دلی' احسان فراموشی' حتیٰ کہ محسن کشی جیسے نفسی و نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سچائی' حق پسندی' کشادہ دلی' وسیع النظری اور عفو و درگزر' جیسے اعلیٰ اخلاقی اوصاف کی جگہ جھوٹ تنگ نظری اور عدم برداشت اس قوم کے افراد اور معاشرے کی نفسیات کا حصہ بن جاتی ہے اور یوں وہ قوم ترقی یافتہ اقوام کی مالی اور علمی طور پر غلام بن جاتی ہے۔

مگر جب کسی قوم میں بیداری کی لہر پیدا ہوتی ہے، تو سب سے پہلے اس میں علم کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ پھر قدرت اس خوابیدہ قوم میں ایسے مفکرین' ادباء اور شعراء پیدا کرتی ہے جو اپنی فکر' مضامین اور شاعری کے ذریعے اپنی قوم کو جگاتے ہیں اور ان میں قوت عمل پیدا کرتے ہیں۔ انہیں مہذب و متمدن بناتے اور اخلاقی صفات سے آراستہ کرتے ہیں اور یوں وہ قوم اپنوں اور بیگانوں کی سیاسی اور ذہنی غلامی کا طوق اتار پھینکتی ہے اور ہر میدان میں ایسے کارنامے

انجام دینے لگتی ہے کہ اس کا ماضی خواب بن جاتا ہے اور دنیا اس قوم کے گن گاتی اور اسے اپنے لئے نمونہ تقلید سمجھنے لگتی ہے۔ یہ بحث بالکل الگ ہے کہ کسی زوال پذیر قوم میں علمی بیداری کی لہر کب اور کیوں بیدار ہوتی ہے اور مفکر، دانش ور اور شعراء اور ذہین لوگ کیسے پیدا ہونے لگتے ہیں؟ سو فی الحال اسے کسی اور موقعے کے لئے اٹھا رکھتے ہیں البتہ قارئین کے جذبہ تجسس کی تسکین کے لئے "آوازِ دوست" کے مصنف مختار مسعود کا ایک قول نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں انہوں نے لکھا ہے "یقیناً ہمارے ملک پر بھی اس حقیقی اور بصیرت افروز قول کا اطلاق ہوتا ہے۔

آج اگر پاکستانی قوم کو اعلیٰ سیاسی وعلمی قیادت میسر نہیں تو اس کی بنیادی وجہ ہماری جامعات اور تعلیمی اداروں کا زوال پذیر ہونا ہے۔ کسی بھی ترقی یافتہ قوم کو سیاسی اور علمی قیادت اس ملک کی جامعات اور تعلیمی ادارے فراہم کرتے ہیں اور بدقسمتی سے عرصہ دراز سے ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں نے یہ فریضہ ادا کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس جامعات تشدد، دنگا فساد، لڑائی جھگڑے اور گھٹیا سیاست کا اکھاڑہ بنی رہیں کچھ عرصہ قبل تک تو جامعات میں ایسی لاقانونیت تھی کہ بے شمار طلباء بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ یہاں تک کہ امن وامان کے قیام کے لئے رینجرز اہلکار تعینات کرنے پڑے۔ حالانکہ تیس پینتیس برس قبل ان ہی جامعات میں پولیس کے داخلے کا تصور بھی محال تھا۔ اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ جن جامعات میں زیر تعلیم طلباء وطالبات کو علم وفضل سے آراستہ اخلاقی خوبیوں کا جیتا جاگتا نمونہ اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہونا چاہئے ان ہی جامعات میں زبان، علاقے اور نسل پرستی کے نام پر طلباء کی سیاسی تنظیمیں وجود میں آگئیں جن طلباء کو تعلیم کی روشنی حاصل کرکے وسیع النظر اور درد مند ہونا چاہئے تھا آج صوبائیت اور نسل پرستی کے زہریلے اثرات لے کر معاشرے میں داخل ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان اعلیٰ تعلیمی اداروں کی تعلیم معاشرے کے حق میں بابرکت ثابت ہونے کی بجائے مہلک اور مضر ثابت ہو رہی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے اور خرابیوں کی جڑ کہاں ہے؟ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں کو علمی وفکری زوال و انحطاط سے نکالنے کی فکر کسی کو نہیں۔

گزشتہ دنوں صدر مملکت نے ایوان صدر میں ملک بھر کے دانش وروں، ادیبوں اور صحافیوں کا ایک اجتماع قومی مسائل پر غوروخوض کے لئے جمع کیا تھا۔ اس موقع پر راقم نے یہ عرض کیا کہ قوم کو زوال سے نکالنے کے کام کا آغاز کرنا ہے تو ہمیں ابتداء گھر اور تعلیمی اداروں کی اصلاح سے کرنا ہوگی۔ اگر والدین اور اساتذہ کی اصلاح ہوجائے تو پورا معاشرہ سدھر سکتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ والدین نے بچوں کی اخلاقی تربیت کا فریضہ ہی ترک کردیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مہنگے تعلیمی اداروں میں بچوں کو داخل کروا کر اور امتحانات میں اچھے نمبر دلوا کر وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئے ہیں۔ اس سوچ کے نتیجے میں جو بچے اس معاشرے کا حصہ بن رہے ہیں وہ بنیادی طور پر Careerist (ایسا شخص جو ذاتی ترقی کو ہر چیز پر مقدم رکھتا ہو) ہیں۔ بہترین روزگار کی ضمانت کی متلاشی یہ نسل بیشتر صورتوں میں جذبہ حب الوطنی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے عاری ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک اعلیٰ تعلیم کا مقصد کوٹھی، کار اور آسودہ حالی کے ذریعے فقط معیار زندگی بلند کرنا ہے۔ چاہے اس کے لئے بوڑھے والدین اور خاندان کو چھوڑ کر بیرون ملک ہی کیوں نہ جانا پڑے

اور چاہے اپنے ہی ملک میں رہ کر حصول دولت اور معاشی و مادی ترقی کے لئے ناجائز ذرائع اور غیر قانونی راستے ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑیں۔

والدین اپنے بچوں میں ایک بلند آدرش (Ideal) کا تصور، بے غرضی اور قوم و ملک کے لئے ایثار و قربانی کے جذبات کیا پیدا کریں گے حرماں نصیبی تو یہ ہے کہ یہ کام اکثر اساتذہ نے بھی کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جامعات کے اساتذہ جن کی بنیادی ذمہ داری تدریس و تحقیق ہوتی ہے دونوں اعتبار سے بالعموم اپنے فرائض کی تکمیل میں ناکام ہیں۔ تدریس ہی کا معاملہ لیجئے۔ یونیورسٹی کے ایک استاد کا اصل کام یہ ہے کہ وہ طلباء و طالبات میں علم کی پیاس (Thrust of Knowledge) پیدا کرے۔ نئی معلومات، نئے تصورات سے واقفیت کی لگن اور نئی تحقیق اور نظریات سے آگہی کی تڑپ کو جنم دے۔ انہیں نئی نئی کتابوں سے نہ صرف متعارف کروائے بلکہ ان کتابوں کو پڑھنے کی ترغیب بھی دے۔ اگر وہ سیڑھیوں، لان اور کینٹین میں بیٹھے بے مقصد و بے معنی گپ شپ میں مصروف ہوں تو انہیں وقت کی اہمیت کا احساس دلا کر لائبریری کا راستہ دکھائے کیا ہمارے اساتذہ کی اکثریت یہ کر رہی ہے؟ اکثر سرکاری جامعات میں طلباء لائبریری میں وقت گزارنے کے بجائے سڑکوں پر کرکٹ کھیل رہے ہوتے ہیں، کیمپس پکنک پوائنٹ کا منظر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ جامعات کی مرکزی لائبریریز اور شعبوں کی سیمینار لائبریری میں اتنے طلباء و طالبات دکھائی نہیں دیتے جتنے کینٹین اور لابیز اور راہداریوں اور میدانوں میں خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے ہیں جو طلباء و طالبات شعبے کی سیمینار لائبریری میں جاتے بھی ہیں ان میں سے اکثر وہاں سنجیدگی اور انہماک سے پڑھنے کے بجائے باتوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

دیکھا جانا چاہئے کہ اس میں علمی ذوق ہے یا نہیں۔ اس موقع پر میں وہ واقعہ سنانا چاہتا ہوں جو مجھے علامہ سید سلیمان ندوی کے عالم فاضل صاحب زادے ڈاکٹر سلمان ندوی نے سنایا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی علی گڑھ میں لیکچرار ہونے کی درخواست لے کر سرسید کے پاس پہنچے۔ سرسید نے انہیں انٹرویو کے لئے اگلے دن اپنے کتب خانے میں طلب کیا۔ نوجوان شبلی نعمانی اگلے روز سرسید کے کتب خانے پہنچے تو سرسید انہیں وہاں بٹھا کر تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ شبلی نعمانی کی نظر الماریوں میں رکھی کتابوں پر پڑی تو ان کی علمی جستجو جاگ اٹھی اور وہ ان کتابوں میں ایسا محو ہوئے کہ انہیں سرسید کی واپسی کا بھی ہوش نہ رہا۔ سرسید آئے اور انہوں نے شبلی نعمانی سے فرمایا کہ "تمہارا تقرر ہو گیا، کل سے آ جاؤ۔" مولانا شبلی نے تعجب سے پوچھا "اور وہ انٹرویو؟" سرسید نے مسکرا کر فرمایا "انٹرویو ہو چکا۔"

یہ تھے ہمارے بزرگ جو اساتذہ کا تقرر ان کا علمی ذوق دیکھ کر کرتے تھے اور آج جامعات کے سلیکشن بورڈ کا معیار تقرری یہ ہے کہ کون سا امیدوار فرفر انگریزی بولنے پر قادر ہے۔ سو اگر یہی معیار ہے تو پھر ایئر لائن کی ایئر ہوسٹس اور تھری اور فور سٹار ہوٹلز کے ویٹر اس معیار پر سب سے زیادہ پورے اترتے ہیں۔ تعلیم و تعلم کا منصب انہیں ہی کیوں نہ سونپ دیا جائے؟ ایک استاد کی تقرری کے بعد اس کی نگرانی کا نظام بھی ہونا چاہئے کہ آیا وہ خود مطالعے کا شوقین ہے یا نہیں، تحقیق میں مگن ہے یا نہیں؟

(ڈاکٹر طاہر مسعود کا کالم سے اقتباس)

O

زندگی میں کامیاب لوگ بھی اپنی ازدواجی زندگی میں ناکام نظر آتے ہیں۔

پاگل

پاگل خانے کے ایک کمرے میں سب پاگل ناچ رہے تھے۔ بس ایک پاگل سب سے الگ چپ کرکے بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر سمجھا کہ وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر: تم ڈانس کیوں نہیں کر رہے؟

پاگل: ارے بے وقوف، کبھی دولہا بھی ناچتا ہے!

''لوٹا''

ہمارے یہاں ذاتی مفادات کی خاطر سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے والے کو ''لوٹا'' کہا جاتا ہے گزشتہ برسوں میں جب یہ لفظ سیاستدانوں کا تمسخر اُڑانے کے لئے بہت زیادہ استعمال کیا جانے لگا تو جناب ایس ایم ظفر نے ایک جگہ بات کرتے ہوئے اس کی تاریخ بتائی، میں اسے دہرائے دیتا ہوں۔ 1930ء کے لگ بھگ مولانا ظفر علی خاں نے ایک شخص ڈاکٹر عالم کو لوٹا کہا تھا۔ وہ پہلے پہل ایک جماعت اتحاد المسلمین کے رکن تھے پھر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے مسلم لیگ بھی چھوڑ دی اور کانگریس سے جا ملے۔ مولانا نے انہیں اپنے اشعار اور دیگر تحریروں میں ڈاکٹر عالم لوٹا کا خطاب دیا۔ یہ ڈاکٹر عالم تقسیم ہند کے بعد اس خطاب کا داغ ماتھے پر سجائے ہندوستان چلے گئے وجہ یہ تھی کہ لاہوریے انہیں لوٹا کہہ کر چھیڑتے تھے۔

پنجاب اسمبلی کے سیاستدانوں کی حالت زار بھی کچھ ایسی تھی۔ جو غلام حیدر وائیں مرحوم کو وزارت عظمٰی سے ہٹانے کے لئے راتوں رات جناب منظور وٹو سے مل گئے اور پھر وٹو صاحب سے گلوخلاصی کے لئے چودھری پرویز الٰہی کی گود میں جا بیٹھے۔ ووٹ دینے والے عوام اور دوسری طرف اخبارات بھی انہیں لوٹا کہنے لگے۔ ان کا عظیم کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے دو ہفتوں کے اندر دو مرتبہ وفاداریاں تبدیل کیں۔ انعام یہ تھا کہ انہیں لوٹے کا خطاب مل گیا بلکہ اس کارنامے کو تو عالمی ریکارڈ کے طور پر گینز بک میں درج کیا جانا چاہئے تھا۔

ویسے اگر کسی کو لوٹا کہا جائے تو وہ سیاستدان نہ بھی ہو تو ناراض ہو جاتا ہے۔ لوٹے کی حالت ہی کچھ ایسی ہے۔ یہ مٹی یا دھات کا بنا گول برتن ہے جس کے آگے ایک ٹونٹی لگی ہوتی ہے۔ اسے بعد از پاخانہ صفائی ستھرائی کے لئے بیت الخلاء میں لے جایا جاتا ہے۔ لہٰذا کوئی بھی نہیں چاہے گا کہ اسے لوٹا کہا جائے۔ دوسری طرف اس کا تعلق ''لوٹنا'' (لوٹ پوٹ ہونا) سے بھی ہے اور یہ بھی کوئی قابل فخر حالت نہیں۔ مٹی، غلاظت یا گندگی میں لوٹ پوٹ ہونا تو جانوروں کا کام ہے اور جانور بھی وہ جنہیں عموماً حقارت یا تمسخر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جیسے گدھا اور خچر وغیرہ لیکن لوٹا کا ماخذ ''لوٹنا'' ہی ہے۔ پلیٹس کی ڈکشنری میں بھی یہی درج ہے۔ لوٹنا کا مطلب پہلو بدلنا دائرے یا چکر میں گردش کرنا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں نے یہی کنایہ استعمال کیا تھا۔ ان کی مراد یہ تھی کہ ڈاکٹر عالم نے سیاسی قلابازیاں کھائیں اور وہ سیاسی بدعنوانی کے کیچڑ میں لوٹ پوٹ ہوئے۔ دراصل قدیم زمانے میں ایک برتن استعمال ہوتا تھا جس کا پیندا نہیں تھا۔ ''لوٹا'' اس کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ اس کا بھی پیندا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا یہ زمین پر ٹک نہیں سکتا تھا۔ ادھر ادھر لڑھک جاتا تھا۔

(''لفظوں کی کہانی، لفظوں کی زبانی'' خالد احمد کی کتاب، ترجمہ: شیراز راج سے اقتباس)

شبِ تاب

جاوید راہی

شبو کی معصومیت اور خوبصورتی، ثریا بیگم کی بھرپور جوانی نے چودھری کے دل پر زبردست وار کیا۔ اس نے شاطرانہ چال چلتے ثریا بیگم کو اپنا تماش بین کر دیا اور مقامی تھانے میں جا کر ثریا بیگم کے طوائف بننے کی درخواست جمع کروا دی۔

ایک عورت کی کہانی، جس نے انتقام کی آگ میں سب کچھ جلا ڈالا

اسٹیشن کا پورا احاطہ برقی روشنیوں کے سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ کراچی ایکسپریس دو نمبر پلیٹ فارم پر تو ایک منٹ رکی ... اپنی اگلی منزل پہنچنے کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔

چند مسافر اتر کر اسٹیشن کے گیٹ سے باہر ... بیٹھ ... کے آخری بینچ پر کالی چادر میں لپٹی ایک جوان اور خوبصورت عورت ... بچی اور کچھ سامان کے ہمراہ بیٹھی شاید کسی کا انتظار کر رہی تھی۔

قلی ایک طرف آ تو دوسری بار اس کے قریب سے گزرا اور ایک بھرپور نظر اس پر ڈالتے آگے گزر رہا تھا کہ اس خاتون نے سر کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ تیزی سے مڑا اور قریب آ کر بڑے میٹھے لہجے میں بولا ”جی آپ نے کونسی گاڑی میں جانا ہے؟“

"نہیں۔ میں نے کہیں نہیں جانا آپ سے پوچھنا تھا کہ اس وقت چائے اور ساتھ میں کچھ کھانے کو مل جائے گا؟"۔

"جی مل جائیگا۔ اسٹیشن پر کیک رس بسکٹ وغیرہ ہی چائے کے ساتھ لاتے ہیں"۔ اس بار اکو نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تھا۔ گورا چٹا رنگ، موٹی موٹی آنکھیں، خوبصورت ناک اور ہونٹ زیور اور لباس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی کھاتے پیتے گھر کی تھی۔ دونوں بچوں کا لباس بھی ان کی حیثیت ظاہر کر رہا تھا۔ اکو نے دونوں کو اپنی ماں کی ممتا میں سمٹتے پا کر اس خاتون کے ہاتھوں میں پکڑے دو سو روپے لئے اور ٹکٹ گھر والی سائیڈ کی جانب چل پڑا۔

زیادہ دیر نہ لگی وہ چائے کے برتن اور کھانے کیلئے بسکٹ وغیرہ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ چائے اور بسکٹ وغیرہ سے فارغ ہو کر اس خاتون نے خاموشی توڑی۔ "کیا یہاں کسی محفوظ جگہ پر رہائش مل سکتی ہے؟"

اس کی زبان سے یہ جملہ سن کر اکو کو آس پاس کا منظر گھومتا ہوا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر ریل کی پٹڑی پر اچھال دیا ہو۔

"جی میں کچھ سمجھا نہیں؟" اکو نے تذبذب کے سے انداز میں پہلو بدلتے جواباً پوچھا۔

"میں اپنے گھر سے آگئی ہوں دونوں بچوں کو ساتھ لیکر"۔ اس نے دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لگاتے کہا۔

"یہاں تو شاید آپ کو کوئی ایسا ٹھکانہ نہ مل سکے۔ میرا گھر ہے تو بس سر چھپانے کا بہانہ مگر آپ کو وہ سب کچھ میسر ہو گا جو ایک غریب کی چھت کے نیچے ہوتا ہے"۔ اکو نے کچھ سوچتے ہوئے اس خاتون کو اپنے گھر میں رہنے کی آفر کر دی۔

وہ چند پل سوچتی رہی پھر اس نے اکو کے ساتھ چلنے کیلئے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اکو نے اس کے پاس پڑا اٹیچی اور دو بڑے بڑے بیگ سنبھالے اور ان کو ساتھ آنے کا کہا۔

ان کو واپسی والا گیٹ ٹکٹ گھر کے عقب میں تھا اس طرف آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی اس لئے اکو [illegible] ان کو ساتھ لے جاتے کسی نے نہ دیکھا۔ باہر آ کر اس نے چنگ چی میں سامان رکھا اور ان کو سوار ہونے کا کہا۔ خود لڑکے کو لیکر اگلی سیٹ پر آ بیٹھا اور وہ دونوں ماں بیٹی اٹیچی کو سنبھالتی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

سارا [illegible] ہوئے [illegible] پر چنگ چی رکشہ [illegible] پھر اکو کے بتاتے ہوئے پتہ پر آگے بڑھ رہا تھا۔ ریلوے پھاٹک کراس کر کے اکو نے ٹیکسی اسٹینڈ والی گلی کے اندر جانے کو کہا۔ رکشے والے نے مین روڈ چھوڑ کر رکشہ گلی کے اندر موڑ لیا۔ کچھ دور تک تو رکشہ آسانی سے چلتا گیا لیکن آخر کار رکشے والے کو ہاتھ کھڑے کرنا پڑے۔

اکو نے اٹیچی سر پر رکھا اور ایک بیگ کندھے پر لٹکاتے لڑکے کا ہاتھ تھام کر چلنا شروع کر دیا۔ ایک گلی چھوڑ کر دوسری گلی کے کونے کے چھوٹے سے مکان کے باہر رک کر اس نے دروازہ کھٹکھٹاتے آواز دی "اماں دروازہ کھولو"۔

"آئی بیٹا!"

اندر سے نحیف آواز گونجی، پھر دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر اماں نے سر باہر نکالتے پہلے اپنے بیٹے اور پھر ان تینوں کو حیرت سے دیکھا۔

"اماں راستہ تو چھوڑو" اکو نے اپنی والدہ کو ایک طرف کرتے ان کو اندر آنے کا کہا۔

وہ تینوں اکو کے پیچھے چلتے اندر آگئے دو کمروں کا چھوٹا سا پرانی طرز کا مکان تھا۔ دونوں ماں بیٹے

اکیلے ہی رہ رہے تھے۔ چھوٹی بہن کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے گھر سدھار گئی تھی۔ والد کو مرے تیسرا سال ہو رہا تھا۔ باپ قلی تھا اب بیٹا اس کے بعد لال پگڑی اوڑھے اسٹیشن پر قلی رجسٹرڈ تھا۔ اماں کھانستی ہوئی ان کے قریب آئی اور بڑی محبت سے تینوں کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے اکو کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھا؟

''اماں یہ لوگ کچھ دن ہمارے گھر بطور مہمان رہیں گے''۔

''جی بسم اللہ۔ مہمان تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتا ہے''۔ کہتے ہوئے وہ کپھر کے نیچے پڑے چولہے کی طرف ہو گئی۔

صبح کی سفیدی پوری طرح پھیل چکی تھی اکو نے اس خاتون اور دونوں بچوں کی طرف دیکھا جن کے چہروں پر پھیلی پریشانی نمایاں دکھائی دے رہی تھی

''اماں تم چائے بناؤ میں ناشتہ لاتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے اکو ان کو کمرے میں بٹھا کر خود باہر نکل گیا۔

اپنی بساط کے مطابق وہ اچھا ہی ناشتہ لایا تھا تینوں بے صبری سے ناشتہ کر رہے تھے۔ دونوں ماں بیٹا ان کو دیکھ کر کسی بھی نتیجہ پر نہیں پہنچے تھے۔ اکو نے اپنا کمرہ ان کو دے دیا۔ خود اپنی اماں کے کمرے میں شفٹ ہو گیا۔ کمرے کیا تھے بس سر چھپانے کا آسرا تھا۔

ناشتہ کے بعد وہ تینوں بے خبر ہو کر سو گئے۔ اکو ان کے کھانے کا بندوبست کرنے نکل گیا۔ دونوں ماں بیٹے نے مل کر کھانا تیار کیا اور ان کے جاگنے کا انتظار کرنے لگے۔

''بیٹا! یہ آخر ہیں کون؟ دیکھنے میں تو کسی بڑے گھر کے لگتے ہیں''۔

''ماں جی مجھے تو خود ابھی تک ان کے ناموں کی خبر بھی نہیں۔ اسٹیشن پر پریشان حال بیٹھے تھے اس سے پہلے کہ کسی مصیبت میں پڑتے میں انہیں اپنے ساتھ لے آیا۔ اماں تمہیں تو اسٹیشن کے ماحول کا پتہ ہی ہے''۔ اکو نے بڑے اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی والدہ کو سمجھایا۔

''بیٹا تم نے بہت اچھا کیا جو ان کو گھر لے آئے۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ان سے بات کرتے ہیں''

''میرا بھی یہی خیال تھا''۔ اکو نے ماں کی بات پر سر ہلاتے جواب دیا۔

دوپہر ڈھلتے وہ جاگ گئے۔ یہ شکر تھا کہ پچھلے سال اکو نے ڈھنگ کا واش روم اور چھت پر بنوایا تھا اپنی شادی کیلئے کیونکہ اس کی ماں کئی ایک جگہ پر بات چلا رہی تھی۔

تینوں باری باری نہا کر کپڑے تبدیل کر کے برآمدے میں آگئے تو ماں جی نے کھانا لگا دیا۔ آج مدت کے بعد گھر میں رونق تھی، ورنہ اکو باہر سے کھا کر آتا ماں جی اپنے لئے تھوڑا بہت پکا لیتیں یا آس پڑوس سے کوئی کھانا دے جاتا۔

تینوں خاموشی سے کھانے میں مصروف تھے برتن اُٹھاتی ماں جی کا ہاتھ بٹاتے وہ خاتون مخاطب ہوئی۔

''میرا نام ثریا ہے، بچی کا نام شاہدہ اور بیٹے کا نام شاویز۔ ہم بہاولپور کے رہائشی ہیں ان کے والد کا نام محمد اقبال ہے اور وہ محکمہ شاہرات میں بطور آفیسر تعینات ہیں''۔ یہ بتا کر ثریا ماں جی کے ساتھ برتن صاف کرنے میں مصروف ہوئی۔

شاہدہ اور شاویز دونوں اُٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔ ثریا چائے بنانے کیلئے چولہا جلانے لگی تھوڑی دیر بعد ثریا نے چائے بنا کر سب کو دی اور اکو کے قریب آ بیٹھی۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہے جو آپ نے سہارا

دیا ورنہ پتہ نہیں کہاں دھکے کھانے پڑتے؟۔‘‘ ثریا کا لہجہ رقت آمیز تھا۔

’’کوئی بات نہیں بیٹی۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ سبب بھی خود ہی پیدا کرتا ہے مگر اتنا بڑا اقدام تم نے اُٹھایا کیوں ہے؟‘‘ اکو کی والدہ نے براہ راست ثریا سے سوال کیا۔

’’ماں جی تقدیر نے زندگی کے ساتھ جو بھی سلوک کیا وہ میرا مقدر تھا۔ میرے ساتھ بچے بھی دربدر ہو گئے۔ اقبال کے ساتھ شادی میں نے اپنی مرضی سے کی تھی۔ میرے والدین میرے آگے بے بس ہو گئے تھے۔ پہلے چند سال تو وہ میرے ساتھ بڑا اچھا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کے رویہ میں فرق آنا شروع ہو گیا۔

شاہدہ کے بعد شاویز پیدا ہوا اُسی دوران مجھے اقبال کی دوسری شادی کا پتہ چلا۔ میں نے بڑے تحمل سے اسے کہا کہ اقبال اگر تم نے دوسری شادی کر لی ہے تو اسے گھر لے آؤ میں اس کے ساتھ گزارہ کر لوں گی۔ جب تم کئی کئی دن تک گھر نہیں آتے ہو تو بچے مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ میں ان کو ڈھنگ سے کوئی جواب نہیں دے پاتی مگر اس نے بجائے کوئی بات کرنے کے اُلٹا میرے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی اور کہا کہ میں نے تمہیں اتنی اجازت نہیں دی کہ تم براہ راست میری نجی زندگی میں کوئی دخل اندازی کرو اور ہاں کان کھول کر سن لو تم اپنے گھر اور اپنے بچوں تک خود کو محدود رکھو ورنہ انہیں ساتھ لو اور اپنے والدین کے گھر چلی جاؤ مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔

اقبال اپنا سامان اُٹھا کر گھر سے چلا گیا۔ میں کئی دن انتظار کرتی رہی فون بھی نہیں سنتا تھا ایک دو بار آفس کا ملازم کچھ پیسے دے گیا اور بس۔ بڑی جدوجہد کے بعد میں نے پتہ لگا لیا کہ وہ کہاں رہ رہا تھا۔ بچوں کو اسکول بھیج کر میں اس فلیٹ پر پہنچ گئی۔ کال بیل پر دروازہ کھولنے والی لڑکی سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہی وہ بدبخت ہے جس نے یہ آگ لگائی ہے۔ اُسے بھی خبر ہو گئی کہ میں اقبال کی بیوی ہوں۔ اس نے مجھے اندر آنے کا کہا۔ میں چلتی ہوئی اس کے پیچھے اس کے بیڈ روم تک آ گئی سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر اقبال کی بڑی سی تصویر کونے میں پڑی تھی۔ میرے جسم پر جیسے کسی نے کھولتا پانی انڈیل دیا۔

آپی میں نے ان کو بار بار کہا ہے کہ گھر بچوں میں جائیں مگر وہ مجھے بھی ڈانٹ کر چپ کروا دیتے ہیں۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا کہتے کونے میں پڑی چھوٹی فریج سے ٹین پیک کوک نکالتے ایک خود لی اور دوسری میری سامنے رکھ دی۔ میں بغور اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ وہ خاصا قیمتی سوٹ پہنے ہوئے اور سونے سے پیلی ہو رہی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اقبال اس پر دل کھول کر خرچ کر رہا تھا گھر کا خیال جتنا انہیں تھا اس میں ہمارا گزارہ ہی ہو رہا تھا۔

میں نے اپنے اندر کے طوفان کو چھپاتے اسے مخاطب کیا۔ آپ کا نام؟

ناہید۔ اس نے ڈبہ اپنے ہاتھ میں گھماتے اپنا نام بتایا۔

دیکھو ناہید اقبال کو میں نے فری ہینڈ دے دیا ہے کہ آپ اور ہم اکٹھے ایک ہی چھت کے نیچے رہ سکتے ہیں اگر آپ چاہو تو وہ مان جائیں گے بچوں کو بہت ضرورت ہے باپ کے سایہ کی۔ میں نے اُسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

ٹھیک ہے آپی وہ آتے ہیں تو میں بات کروں گی۔ ناہید نے روایتی انداز میں مجھے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اُٹھی اور واپس گھر آ گئی۔ وہ آنسو

جو میں نے وہاں روک رکھے تھے مسہری پر گرتے بے اختیار میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔

شام کو اقبال نے فون کیا اور جو اس کے منہ میں آیا کہہ دیا کہ تمہاری جرأت کیسے ہوئی جو تم نے میرا پیچھا کیا اور گھر کی دہلیز سے قدم باہر نکالا۔ وہ غصہ میں تھا اور میں صرف سوری اقبال، سوری اقبال کے سوا اور کوئی جواب نہ دے پائی۔ انہوں نے فون بند کر دیا۔

میں نے بہت کوشش کی کہ وہ واپس گھر آجائیں مگر ان کا دل پتھر ہو چکا تھا۔ میری تو جیسے انہیں ضرورت نہیں تھی مگر بچوں کو بھی انہوں نے لاوارث کر دیا۔ میں کب تک یہ سب سہتی جب اس نے مجھے اپنے دل سے ہی نکال دیا تو میں کیوں اس کی دنیا میں رہتی اور میں نے اس فیصلہ کے باوجود دو تین بار اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ جواب میں اس نے یہ کہہ کر فون کاٹ دیا کہ مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ مجھے تو ان دونوں بچوں پر بھی یقین نہیں۔ جو میرے لئے اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کو چھوڑ سکتی ہے وہ میری غیر موجودگی میں کیا کچھ نہیں کرتی ہوگی؟۔

اقبال کے منہ سے ایسی غلیظ گفتگو کی مجھے بالکل توقع نہیں تھی مگر اس کے سر پر ناہید کا بھوت سوار تھا شاید وہ اُس وقت اس کے قریب ہی ہو جو وہ اس کو خوش کرنے کیلئے مجھ پر ایسی گندی گفتگو کے کوڑے برسا رہا تھا"۔

اتنا بتاتے بتاتے ثریا بیگم سسک اُٹھی۔ دونوں ماں بیٹے نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ جب تک تمہارا دل چاہے اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر اپنے بچوں کے ساتھ رہو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

اکو قلی جس آبادی میں رہتا تھا اس کی آخری دیوار نئی آبادی کے ساتھ ملتی تھی۔ یہ ریڈ لائٹ ایریا تھا جو بلدیہ کے ریکارڈ میں نئی آبادی "چکلہ" کے نام سے موسوم تھی۔

اوپر چھت پر چار پائیاں لگا دی گئی تھیں کیونکہ گرمیوں کے موسم میں آس پاس کے لوگ چھتوں پر ہی زیادہ تر سوتے تھے۔ شام ڈھلتے ہی نئی آبادی کی روشنیاں جاگ اُٹھیں۔ سازوں اور گھنگھروؤں کی جھنکار پر ثریا بیگم بُری طرح چونکی تو اکو قلی نے بتایا کہ یہ یہاں کا بازار حسن ہے۔ شروع دن سے ہی یہ چلا آرہا ہے۔ اہل محلہ نے بہت کوشش کی اسے ہٹانے کی مگر یہ لوگ عدالتوں تک پہنچ گئے اور یہ آج تک شریفوں کے محلہ کے ساتھ اپنا بازار سجائے ہوئے ہیں۔

اوپر چھت پر کھڑے کھڑے بازار میں بیٹھی طوائفیں اور وہاں آنے جانے والے لوگ صاف دکھائی دیتے۔

شارہ نے بڑی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ کر اپنے بھائی شاویز کو مخاطب کیا۔

"شاویز یہ جو عورتیں دروازوں کے باہر کرسیوں پر بیٹھی ہیں یہ کیا کر رہی ہیں؟ کبھی دروازہ بند کر لیا تھوڑی دیر بعد کھول لیا اور پھر کسی اور کے ساتھ جا کر دروازہ بند کر لیتی ہیں۔"

"مجھے کیا معلوم؟ ہوگا ان کو کوئی گھر کا معاملہ"۔ شاویز نے ایک دروازہ کھلتے اور ساتھ والا بند ہوتے دیکھ کر جواب دیا۔

روز رات کے پچھلے پہر سے لیکر رات گئے تک یہ سلسلہ دیکھتے ثریا بیگم بھی بڑی دیر تک اس صورتحال کا مشاہدہ کرتی جیسے اپنے اندر کوئی بہت بڑا فیصلہ کرنے میں مصروف تھی۔

جو تھوڑی بہت رقم وہ ساتھ لائی تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئی تھی۔ اب جو زیورات اس کے پاس تھے ان میں سے ایک چین اور لاکٹ فروخت ہو

گئے۔ اکو قلی اور ثریا بیگم اوپر چھت پر الگ الگ چارپائی پر بیٹھے دیوار کے دوسری طرف بند ہوتے، کھلتے دروازوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔

''اکو'' ثریا نے اسے مخاطب کیا۔

''ہاں بولو''

''یہ دھندا کرنے والیوں کو پولیس پکڑتی نہیں؟''

''نہیں ان کو سرکار نے دھندا کرنے اور مجرہ کرنے کا لائسنس جاری کر رکھا ہے یہ لوگ اس حدود کے اندر رہتے یہ کام کرتے ہیں باقاعدہ ایک قانون ہے ان سب کیلئے۔'' اکو قلی نے بڑے عالمانہ انداز میں اپنی معلومات دہرائیں۔

''تم کبھی گئے ہو اُدھر؟'' ثریا نے آنکھوں سے اشارہ کرتے پوچھا۔

''ہاں کبھی کبھار چلا جاتا ہوں جب ضرورت ہوتی ہے''۔ اس بار اکو کے اندر کا قلی کروٹ لے کر اُٹھا۔ ''کیوں؟ خیر ہے تم کیوں پوچھ رہی ہو یہ سب کچھ؟''

''کئی دنوں سے میرے اندر ایک عجیب طرح کی جنگ جاری ہے۔ میں اقبال کو بتانا چاہتی ہوں کہ جب عورت انتقام لینے پر آجائے تو وہ تمام حدیں پار کر جاتی ہے''۔

''میں کچھ سمجھا نہیں؟'' اکو نے چونک کر پوچھا۔

''میں اس بازار میں رہنا چاہتی ہوں''۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟'' اکو نے برہمی کا اظہار کرتے ناگواری چہرے پر سجاتے اسے ڈانٹا۔

''اکو تم میری زندگی کے نشیب و فراز سے واقف نہیں ہو۔ میں نے اقبال کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اس کی خدمت اور اس کی عزت کی حفاظت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی مگر مجھے دیا کیا اس نے؟'' یکدم اس کی آواز بھرا گئی۔

اکو نے اسے دلاسا دیا اور بولا ''تم اپنا خیال بتاؤ میں پھر ہی کوئی مشورہ دیتا ہوں''۔

''تم نے مجرے کی بات کی ہے میں شاہدہ کو باقاعدہ مجرے کی تربیت دلوانا چاہتی ہوں''۔ ثریا نے اپنا فیصلہ اسے سنایا تو اکو گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ پل خاموش رہنے کے بعد بولا ''میں اس آبادی کے چودھری دارا سے بات کروں گا''

دوسرے دن اکو نے چکلہ کے چودھری سردار عرف دارا سے بات کر کے ثریا بیگم کو اس سے ملوا دیا۔

شاہدہ کی معصومیت اور خوبصورتی، ثریا بیگم کی بھرپور جوانی نے چودھری کے دل پر زبردست وار کیا۔ اس نے شاطرانہ چال چلتے ثریا بیگم کو اپنا گھر پیش کر دیا اور مقامی تھانہ میں جا کر ثریا بیگم کے طوائف بننے کی درخواست جمع کروا دی۔

استادوں کے زیر سایہ ماں بیٹی نے چند دنوں میں ہی رقص اور گانے میں مہارت حاصل کر لی۔

پہلی بار جب دونوں ماں بیٹی اپنی بیٹھک میں سج دھج کر بیٹھیں تو تماش بینوں کا رش لگ گیا۔ شاہدہ کی آواز اچھی تھی پھر چکلہ میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ یہ کوئی بڑے گھر کی شریف زادی ہے جس نے اپنی مرضی سے طوائف بننا پسند کیا۔ اس کو مکمل حمایت حاصل تھی دارے کنجر کی جو اسے اپنی بیٹی بنا کر اپنے گھر لایا تھا۔

شاہدہ کے حسن کا چاروں جانب بہت چرچا تھا۔ شہر کے بڑے بڑے تو تڑ خان شاہدہ کی زلف کے اسیر ہو چکے تھے جب شاہدہ اپنی آواز کا جادو جگاتی تو نوٹوں کے انبار لگ جاتے اس کے ایک ٹھمکے پر جیبوں سے نوٹ نکل کر بیٹھک کی دیواروں سے ٹکرانے لگتے۔

شاویز کے خون میں بے غیرتی کے ذرات

شامل تو ہو گئے مگر اندر سے اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون اکثر بے غیرتی پر غالب آجاتا اور وہ اپنی ماں اور بہن پر برس پڑتا مگر دونوں اس کی ایک نہ چلنے دیتیں۔

شاہدہ کی نتھ اتروائی کی رسم شہر کے بڑے نامی گرامی بدمعاش اسلم لون والے کے ہاتھوں انجام پائی۔ لاکھوں کی رقم پاس آگئی۔ خریداری کے انبار لگ گئے۔ اسلم آتا تو ڈھیروں ضروریات زندگی کا سامان ساتھ لاتا۔ بدمعاش تھا، ذرا ذرا سی بات پر چھری پستول نکال لیتا مگر شاہدہ کی زلفوں کا اسیر ایسے ہوا کہ قدموں کی مٹی جا بنا۔

شہر میں ناجائز فروشی، جوا اور غنڈہ گردی سے کمایا ہوا پیسہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ ایک دو بار اسلم نے دبی زبان میں شاہدہ کو مجرہ بند کرنے کی بابت کہا مگر ثریا کی ایک ہی دھمکی کے ہاتھوں چت ہو گیا کہ تمہارے جیسے بے شمار تماش بین ہیں میری شہزادی کا خرچہ اٹھانے والے، تم مت آیا کرو میرے گھر۔

اسلم کی بولتی بند ہوگئی۔ اس کی غیر موجودگی میں کئی ایک سرمایہ دار دو چار گھنٹے گزار جاتے۔ اگر کوئی شکایت ہوتی بھی تو اسلم کی جرأت نہ پڑتی کہ شاہدہ سے یا ثریا بائی سے اس کا ذکر کرتا۔

ثریا بائی اتو قلی کو بھی کبھی کبھار کچھ نہ کچھ دیتی رہتی کیونکہ اس کی احسان مند تھی جس کی بدولت وہ بازار حسن میں راج کر رہی تھی۔

پورے شہر میں شاہدہ اسلم کے حوالے سے جانی جاتی تھی۔ روز شام کو پشاوری تانگہ میں ماں بیٹی بن ٹھن کر نکلتیں اور شہر کی سڑکوں پر خود کی نمائش کرتیں۔

دوسرے تیسرے دن کا یہ دورہ ان کا کاروباری دورہ ہوتا تھا۔ ان کے دام فریب میں شہر کے باذوق حضرات پھنستے، نکلتے رہتے تھے۔

شاویز آج بھی اپنی والدہ اور بہن سے بُری طرح اُلجھا تھا۔ بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ شاہدہ کے منہ پر پڑنے والے تھپڑ نے اس کے رخسار پر خاصا نشان بنا دیا تھا۔ ثریا بیگم نے آپے سے باہر ہوتے اپنے بیٹے کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔

شاویز بدزبانی کرتا ہوا گھر سے باہر نکل کر قریبی دواخانہ پر آبیٹھا جہاں وہ حکیم کے پاس دن بھر بیٹھتا تھا۔ یہاں بیٹھنے پر ماں بیٹی کو اعتراض ہوتا تھا کیونکہ ان کے خیال میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ وہ ہی اسے ان کے بارے میں بھڑکاتا رہتا تھا۔ ایک دو بار شاویز نے اسلم سے اور دوسرے ایک دو پکے گاہکوں سے بھی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہاں کے ماحول نے شاویز کو نشہ کا عادی بنانے کے ساتھ ساتھ جوا کھیلنے کی لت میں بھی ڈال دیا تھا۔ اس کے اخراجات بڑھ رہے تھے مگر ثریا بیگم اس کو مناسب خرچہ دیتی تھی۔

لڑائی جھگڑا وہ جان بوجھ کر مول لیتا۔ کئی بار تھانہ کی یاترا کر آیا تھا اس لئے اس کے اندر سے پولیس کا خوف نکل چکا تھا۔

رات گئے تک وہ دواخانہ کے باہر تھڑے پر بیٹھا رہا جب بازار بند ہوا تو ثریا بیگم کو شاویز کی فکر ہوئی۔ دونوں ماں بیٹی گھر سے نکل کر باہر سڑک پر آئیں تو انہیں شاویز دواخانہ کے تھڑے پر بیٹھا ملا۔ بڑی مشکل سے دونوں نے اسے منایا اور لے کر گھر آگئیں۔

اُدھر آخر کار اقبال کو اپنی بیوی، بیٹی اور بیٹے کا پتہ چل گیا کہ بازار حسن میں اس کی عزت کا جنازہ نکالے ہوئے بدکاری کا دھندہ کر رہے ہیں۔ اقبال نے اپنی عزت کے خوف سے ثریا اور بچوں کے گھر سے جانے کی اطلاع تک پولیس کو نہیں دی تھی۔ تین سال بعد کسی جاننے والے نے بازار حسن میں ثریا

بیگم اور شاہدہ کو دیکھا اور اقبال کو آ کر بتایا۔

وہ چاہتا تو پولیس کو اپنے ساتھ لا سکتا تھا مگر اس نے دانشمندی کا مظاہرہ کیا اور اکیلا ہی ان کے پیچھے چلا آیا۔ بازار حسن جنرل بس اسٹینڈ کے ایک جانب تھا۔ اقبال نے ہوٹل میں کمرہ لیا اور شام کے ڈھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

بازار حسن کی تاریکی اجالے میں ڈوب گئی تو وہ کمرہ لاک کر کے نکلا اور ریڈ لائٹ ایریا کے اندر آ گیا۔ اسے ثریا بیگم کو تلاش کرنے میں دقت نہ ہوئی دونوں ماں بیٹی بیٹھک میں بن سنور کر بیٹھی گانا سننے والوں کے انتظار میں تھیں۔ اقبال پر نظر پڑتے ہی دونوں پتھر کی طرح ساکت ہو کر رہ گئیں۔

تینوں ایک دوسرے کی طرف جس انداز میں دیکھ رہے تھے انکی کیفیت کو محسوس کرنا قدرے مشکل نہ تھا۔

دونوں یکدم اٹھیں اور اسے اندر رہائش کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اقبال ان کے پیچھے اندر چل پڑا۔ شاویز بیڈ پر لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا جونہی باپ پر نظر پڑی تو جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

کمرے میں چاروں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اقبال نے خاموشی توڑی۔

"ثریا مجھے اتنی بڑی سزا دے ڈالی مری چھوٹی سی غلطی کی۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے اسے بھی چھوڑ دیا۔ تمہارا کہاں کہاں پتہ نہیں کیا مگر تقدیر نے مجھے اس دن کیلئے زندہ رکھا ہوا تھا۔ کاش میں اس لمحہ کو دیکھنے سے پہلے ہی مر چکا ہوتا"۔

اقبال کی آنکھوں کے بند ٹوٹ چکے تھے۔ ثریا بیگم کے دل میں کسی جگہ چھپا اقبال کیلئے پیار چھلک پڑا اور وہ اقبال کے قریب آتے اُسے دلاسا دینے لگی۔ دونوں بچے اپنے والد کے ساتھ لگ کر بلک بلک کر رو رہے تھے۔ ان کو روتے دیکھ کر چودھری دارا گھر کے اندر آیا تو اقبال پر نظر پڑتے وہ بھی ٹھٹک گیا۔

ثریا بیگم نے دارے کو بتایا کہ یہ اقبال ہے۔

عمریں چھپانے والے ہوجائیں ہوشیار

عمر بتانے کے معاملے میں بہت سے لوگ محتاط انداز اختیار کرتے ہیں اور خواتین تو عمر کے معاملے میں بہت ہی زیادہ حساس ہوتی ہیں لیکن اب عمر چھپانے والے لوگ ہوشیار ہوجائیں کیونکہ مائیکرو سافٹ نے ایک ویب سائٹ متعارف کرا دی ہے جس پر تصویر ڈال کر عمر کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔ اس ویب سائٹ کو "ہاؤ ڈو آئی لک" کا نام دیا گیا ہے جس میں آپ تصویر کو اپ لوڈ کر کے کسی کی بھی عمر کا پتا چلا سکتے ہیں۔ اس ویب سائٹ کو پہلی مرتبہ کمپیوٹر ڈیولپرز کی سالانہ کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ ویب سائٹ چہرے پر 27 اہم فیچرز کو نوٹ کرتی ہے جن میں ناک کے سات اہم پوائنٹس، ہونٹوں کے چھ مقامات، آنکھوں اور بھنوؤں کے کئی مقامات شامل ہیں جو عمر رسیدگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

(مرسلہ: صائمہ اسلم۔ کراچی)

دارا نے اسے روایتی انداز میں لیا۔ جب اچھی طرح اندر کے غبار ڈھل گئے تو اقبال نے ثریا بیگم سے واپس گھر چلنے کی بات شروع کی مگر اس نے یہ کہہ کر اس کی پیشکش کو رد کر دیا کہ اب ہم شریف لوگوں میں واپس نہیں جاسکتیں اگر شاویز جانا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

"بیٹی تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ابو جی یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" شاہدہ نے اپنی والدہ کی طرف داری کرتے اقبال کو جواب دیا۔

"ابو جی چلیں" ۔شاویز نے اپنے والد کا ہاتھ تھامتے اسے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ اقبال اپنے بیٹے کے ساتھ اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ دونوں چلتے ہوئے ہوٹل کے کمرے میں آگئے۔

شاویز باپ سے مل کر اپنے آپ کو بڑا محفوظ پا رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے دُکھ سناتے سناتے سو گئے تھے۔

صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر شاویز نے اقبال سے اجازت لی اور اپنی والدہ اور بہن کو سمجھانے بازار حُسن کی طرف چل پڑا۔

ثریا بیگم نے شاویز پر نظر پڑتے ہی برجستہ کہا "ایک رات بھی نہیں کاٹ سکے ہو اپنے باپ کے ساتھ؟"

"نہیں ماں یہ بات نہیں۔ تمہیں بھی اس حقیقت کا علم ہے کہ سارا کیا دھرا تمہارا اپنا ہے۔ ہمیں گھر سے بے گھر کیا اور شرافت کی دنیا سے نکال کر گندگی کے ڈھیر میں لا پھینکا۔"

شاہدہ نے پھنکار کر اپنے بھائی کی طرف دیکھا اور غرا کر بولی" یہ تقریر بند کرو اگر یہاں رہنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ اپنا بوریا بستر اُٹھاؤ اور چلتے جاؤ ہمارے گھر سے۔"

"تم بکواس بند کرو گی؟ ۔ میں اماں سے بات کر رہا ہوں۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے شاویز۔ اگر تمہیں یہاں رہنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ یہی صلاح میری بھی ہے"۔

"ماں آپ اتنی پتھر دل مت بنو۔ ابو تمام رات اپنے کیئے پر نادم رہے ہیں اور وہ آپ دونوں کو اس کے باوجود واپس لے جانے کیلئے تیار ہیں۔ اس گھناؤنی زندگی سے نکل کر آپ ہمارے ساتھ چلیں۔" اسی اثناء میں شاہدہ آپے سے باہر ہو گئی اور اس کو گھر سے نکل جانے کا کہا۔

شاویز اس کے ہتک آمیز رویہ سے دلبرداشتہ ہو کر اپنے اوپر والے کمرے کی طرف بھاگا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں چمکتا ہوا تیز دھار خنجر تھا۔ اس سے پہلے کہ ماں بیٹی سمجھتیں شاویز نے بھرپور وار کرتے ہوئے شاہدہ کے پیٹ میں خنجر گھسیڑ دیا دوسرا وار ثریا بیگم پر کیا۔ دونوں گر کر تڑپ رہی تھیں جب تک وہ ٹھنڈی نہ ہو گئیں وہ ان کے سر پر سوار رہا جب اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ زندگی کی بازی ہار چکی ہیں تو وہ خنجر لہراتا ہوا باہر نکلا۔ جس کی بھی نظر اس پر پڑی وہ بھاگ کر اِدھر اُدھر ہو گیا۔ باہر سڑک پر آ کر اس نے تانگہ روکا اور تھانہ کا بتا کر بیٹھ گیا۔

انسپکٹر رشید مرتضیٰ تھانہ کے بڑے سے دالان میں موجود تھا۔ شاویز نے خنجر اس کے سامنے رکھتے گرفتاری دیکر اپنی ماں اور بہن کو قتل کرنے کا اعتراف کر لیا۔

پوسٹ مارٹم کے بعد اقبال دونوں کی لاشیں وصول کر کے اپنے ساتھ لے گیا اور اپنی بیوی اور بیٹی کے قتل کا مقدمہ اپنے بیٹے کے خلاف درج کرنے کی درخواست تھانہ سٹی میں پیش کر دی۔

● کرنل محمد خان

موتیا

"لیکن کچھ اس ایذا کا بھی خیال ہے جو موتیا کے ماں باپ کو پہنچی ہے؟" اس فقرے پر میں ذرا چونکا دیکھا تو موتیا کی ماں کی آنکھوں میں آنسو اُبڈ آئے۔ اگلے لمحے میں اس کی پلکیں آنسو نہ تھام سکیں اور ایک کربیے کے عالم میں اس کے منہ سے نکلا "اے کاش میری بیٹی تو یہاں نہ آئی ہوتی۔"

تقسیم ہند سے پہلے کا قصہ، دو دلوں کی داستان جو ایک ملاقات میں ہی ختم ہوگئی

پروفیسر اعجاز حسین جنہیں ہم چچا کہتے ہیں، کوئی ساٹھ برس کے پیٹے میں ہیں لیکن کبھی جوان بھی تھے اور جوان بھی ایسے رعنا، خوب رو اور خوش پوش کہ جس بستی سے گزر جاتے وہاں کی حسینوں میں مدتوں ہل چل رہتی۔ ان کے شباب کا ایک قصہ بڑی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ یعنی ان کا اور ایک ہندو لڑکی موتیا کا رومان۔ ہمیں ارمان تھا کہ یہ داستان ہم خود چچا کی زبانی سنیں کہ وہ غضب کے داستان گو بھی تھے اگرچہ بظاہر کم گو تھے۔ ایک دن چچا خلاف معمول موج میں تھے ہمیں شرارت سوجھی، چچا سے کہا۔ "چچا: آپ کی موتیا کا قصہ تو کچھ فرضی سا لگتا ہے وہ ہندو تھی آپ مسلمان۔ اپنوں کو چھوڑ کر اس کی آنکھ بھرے شہر میں آپ ہی سے کیوں لڑی؟"

عام حالات میں چچا ایسے سوال گول کر جاتے

تھے لیکن آج کا سوال صرف سوال ہی نہیں چیلنج بھی تھا، چچا بول اُٹھے۔ ''برخوردار اگر بھرے شہر میں موتیا کی آنکھ ہم سے لڑی اور ہماری موتیا سے تو اس کی ایک خاص وجہ تھی اور وہ یہ کہ ہم دونوں کے سوا بھرے شہر میں کسی کو آنکھ لڑانے کا سلیقہ ہی نہ تھا۔''

''لیکن اتنا بڑا سنگین واقعہ کب اور کیسے ہوا؟'' ہم نے سراپا اشتیاق بن کر پوچھا۔

چچا کی طبیعت آج بلاشبہ رنگ پر تھی۔ ایک سکون بخش کش کے بعد حقے کی نے ایک طرف کرتے ہوئے بولے۔'' بھئی قصہ تو ہم سناتے ہیں لیکن درمیان میں ٹوکنا مت۔ اس طرح کہانی میں روانی نہیں آتی۔''

ہم تینوں شنوندگان یعنی نعیم، نیاز اور میں نے بہ صمیم قلب خاموش رہنے کا اقرار کیا اور چچا نے داستان کا آغاز کیا۔'' یہ قیام پاکستان سے تقریباً ایک سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ہم نے تازہ تازہ ایم اے پاس کیا تھا اور ایک انٹرمیڈیٹ کالج میں لیکچرر مقرر ہوگئے تھے۔ یہ کالج سرکار نے ایک پس ماندہ علاقے کی اشک شوئی کے لئے ایک درماندہ سے قصبے بالا پور میں کھول رکھا تھا۔ جہاں پہنچنے کے لئے تہذیب اور فیشن کو گاڑی سے اُتر کر کئی میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے دوپٹے ابھی تک بے تحاشا سینوں پر پھیلے ہوئے تھے اور ایک قمیض کی کشادگی میں سارا کنبہ سما سکتا تھا۔ سارے شہر میں کوئی ایسا دوپٹا نہ تھا جو کسی مرمریں گردن میں حمائل ہو یا کوئی ایسی قمیض جو کسی سیمیں کمر میں پیوست ہو۔''

''رہے مرد تو پہلی نگاہ پر موہنجوداڑو کے مہاجر نظر آتے تھے۔ ہمارے کالج کے اکثر استادوں کا بھی ایک پاؤں ابھی پتھر کے زمانے ہی میں تھا۔ فقط پرنسپل صاحب جو ولایت سے ہوآئے تھے رنگ و بو کی دنیا دیکھ چکے تھے لیکن سکھ ہونے کی وجہ سے آنکھ لڑانا ان کے مشاغل میں سے نہ تھا۔ کم از کم بالاپور میں ہمارے مقابلے میں ان کی رقیبانہ جسارت بے کار تھی۔ کچھ یہ بھی کہ پانچ بچوں کے باپ تھے اور ان کے غنچہ ہائے امید کھل چکے تھے ادھر ہم خود بچے تھے اور ہمارے گلوں میں ابھی رنگ بھرنا باقی تھا۔''

''ہم سیدھے لاہور سے ایم اے اقتصادیات کرکے آئے تھے، ایم اے کرنے کے باوجود ہم اقتصادیات کا تو کچھ نہ بگاڑ سکے لیکن ہماری نفاست طبع نے فیشن کے نصیب سنوار دیئے چنانچہ اقتصادیات میں تو ہماری شہرت نے کبھی گھر کی چار دیواری سے باہر نہ جھانکا لیکن ملبوسات کی دنیا میں ہمارا ذکر ان درباروں تک پہنچ گیا جہاں ہم خود نہیں پہنچ پائے تھے۔ اہل بالاپور کی آنکھیں ہم نے پہلے ہی روز خیرہ کردیں۔ ہم جب بھی اپنے مکان سے نکلتے بالاپور کے لوگ ہمیں اور ہمارا ملبوس دیکھنے کے لئے رُک جاتے اور ہم نظریں جھکائے خلق خدا سے خراج وصول کرتے گزر جاتے۔ اِدھر اُدھر ہمیں دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ کچھ دیکھنے ہی کو نہ تھا ہوسکتا تھا کہ کسی مقامی گدڑی میں بھی کوئی لعل ہو لیکن کون گدڑی کھولتا اور لعل ٹٹولتا۔ مگر ایک دن وہ کس قدر تقدیر ساز دن تھا ہم نے مکان سے نکل کر گلی میں قدم رکھا ہی تھا کہ ہمارے سامنے سے ایک بے گدڑی کا لعل گزرا' یعنی گدڑی کی جگہ دھانی شیفون کا دوپٹا ایک مختصر سی ریشمی شلوار اور مختصر تر ریشمی قمیض اور تین کپڑوں کے اندر ایک سرو قامت اور مہ طلعت نسل گزرتے گزرتے ہم پر ایک غلط انداز سی نگاہ ڈالی اور بس ایک ہی نگاہ میں ہماری یکتائی کا خاتمہ کردیا ہمیں محسوس ہوا کہ بے شک بالاپور میں ہمارے سوا کوئی اور بھی ہے اور ہمی اس قصبے کے لاشریک خراج گیر نہیں۔''

ہم نے اپنے نوکر راجو سے پوچھا۔ وہ دیہاتی عشق بازوں کی زبان میں کہنے لگا۔''نیا مال ہے

لاہور یا دلی سے آیا معلوم ہوتا ہے۔" راجو ہمارا نوکر بھی تھا اور بچپن کا ساتھی بھی لہٰذا بے تکلف تھا۔

خدا جانے اس روز ہم کیوں دن بھر بے قرار سے رہے۔ پچھلے پہر جب راجو یہ معلوم کر کے لایا کہ لڑکی ہندو ہے اور نام اس کافرہ کا موتیا ہے تو ہماری بے قراری کو قطعاً افاقہ نہ ہوا۔

دوسرے روز ہم کالج سے واپس آ رہے تھے کہ سامنے سے پھر وہی بت طناز آتا دکھائی دیا۔ اب کے نہ صرف آسمانی رنگ کا سوٹ زیب تن تھا بلکہ اس کا سراپا ہی افلاکی نظر آتا تھا۔ مقابلے میں یوں محسوس ہوا کہ ہم اپنے ایم اے اور فیشن کے باوجود محض ارضی قسم کی نباتات ہیں یعنی از قسم شلغم و کدو۔ پاس سے گزرتے ہوئے ہمیں دیکھا بھی لیکن نہ ان گلابی ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی نہ ان شرابی آنکھوں نے پیغام دیا۔ مفت میں راہ چلتے ہمارا صبر و قرار لٹ گیا۔

جب یوں بیٹھے بٹھائے ہمیں بیماریٔ دل نے آلیا اور راجو نے ہمارا کام تمام ہوتے دیکھا تو بے چارہ وفا کا مارا سرہانے بیٹھ گیا اور ہمارا دردِ دل بٹانے لگا لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ ہماری زندگی اسی مسیحا نفس کی محتاج ہے تو کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچنے کی ترکیبیں سوچنے لگا اور اسی تگ و دو میں اسی مہرو تک جا پہنچا۔ اسی مہرو سارے شہر کی خالہ تھی اور کہا جاتا تھا کہ سارے شہر کا درد اس کے جگر میں ہے۔ گویا ایک معزز شہری ہونے کے اعتبار سے ماسی مہرو کی کسی رگ میں ہمارے درد کا شائبہ بھی تھا۔ راجو نے اپنے زعم میں ماسی کی اسی رگ پر ہاتھ رکھا کیونکہ واپس آیا تو خوشی سے ناچ رہا تھا بولا "ماسی سب مشکلیں آسان کر دے گی۔"

راجو ہمارا غم خوار ضرور تھا اور بظاہر خیر بھی اچھی لایا تھا مگر سادہ لوح تھا ہمیں خدشہ ہوا کہ ماسی ہماری عاشقانہ بدحالی کا قصہ سن کر اسے عام نہ کر دے ہم عشق بھی کرنا چاہتے تھے اور حجاب میں بھی رہنا چاہتے تھے۔ چنانچہ کسی قدر تشویش کے ساتھ راجو سے پوچھا۔ "راجو! ماسی کے سامنے ہمارے عشق سے زیادہ پردہ تو نہیں اٹھایا؟"

"نہیں بادشاہو! میں نے تو آپ کا نام ہی نہیں لیا۔" صرف اتنا پوچھا تھا کہ ماسی یہ جو ہندو لڑکی ہے نا موتیا یہ کیسی لڑکی ہے۔"

ہم نے راجو کے سوال پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس سوال سے ہمارے وقار کو تو کوئی آنچ نہ آسکے گی لیکن موتیا کے ہاں ہمارا نام بھی رجسٹر نہیں ہوگا۔ ہم نے کہا "راجو تمہارا سوال ہے تو ڈپلومیٹک لیکن اس سوال میں ہم کہاں ہیں؟ ماسی تو یہ سمجھے گی کہ یہ سوال ہماری خاطر نہیں رفاہ عامہ کے لئے پوچھا گیا ہے اور بالفرض وہ جواب لے آئی کہ موتیا ایسی نہیں ویسی لڑکی ہے تو اس کا ہمیں کیا ثواب ملے گا؟" راجو نے کچھ سمجھ کر سر ہلایا گویا کہتا ہو "صفر۔"

لہٰذا "راجو میاں!" ہم نے کہا۔ "کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ ماسی پر ہمارا حالِ دل بھی واضح ہو جائے لیکن زیادہ تہ تک بھی نہ پہنچ سکے۔"

راجو جھٹ بولا۔ "تو موتیاں والیو! پھر بذریعہ ڈاک عشق کرو۔" راجو ہم سے دل لگی بھی کر لیتا تھا۔

ہم نے کہا "دیکھو راجو! یہ ہنسی کا مقام نہیں جاؤ اور بذریعہ ماسی ہی ہماری خاطر ایک ضمنی سوال کر آؤ۔"

راجو اس دوسری مہم پر جاتے ہوئے بہت خوش نہ تھا لیکن لوٹا تو ہنستے ہنستے کہنے لگا۔ "ماسی مہرو کے ساتھ وکیلوں کی سی چال چلی ہے۔"

"مثلاً کیسے۔"

"میں نے کہا" ماسی دوسری بات یہ ہے کہ خدا جانے ہمارے پروفیسر صاحب ہر وقت موتیا کی تعریف میں شعر کیوں پڑھتے رہتے ہیں۔" کیا غضب کا سوال کیا تھا راجو نے، ہمیں محسوس ہوا کہ

اب راز محبت اور عزت سادات دونوں محفوظ ہیں لیکن یہ نہ سوچا کہ ہم اقتصادیات کے ایم اے میں تو ماسی عشقیات کی پی ایچ ڈی ہے وہ تو راجو کی شکل دیکھ کر ہمارے دل کا بھید پا گئی تھی۔

دوسرے روز ہم گھر کے صحن میں بیٹھے تھے کہ ماسی مہرو دروازے سے داخل ہوئی۔ راجو اتفاق سے گھر میں موجود نہ تھا۔ اس سے پہلے ہماری نگاہیں ماسی سے چار ضرور ہوئی تھیں لیکن ہم کلامی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ماسی کچھ کہنے کو بے تاب تھی لیکن ہم سے براہ راست بات کرنے سے جھینپ رہی تھی آخر راجو کو نہ پا کر پوچھنے لگی۔ ''راجو گھر میں نہیں؟''

ہم نے سوچا ضرور خوش خبری لائی ہے لیکن مزید سوچا کہ اگر اس خوش خبری کا اظہار راجو کی موجودگی ہی پر منحصر ہے تو ہماری خوشی باسی ہو جائے گی جی چاہا کہ کاش ماسی کو بتا سکیں کہ اس موضوع پر ہم سے براہ راست بھی بات ہو سکتی ہے اور یہ کہ اس سے ہماری بے ادبی کا کوئی خدشہ نہیں' اور چھوٹی موٹی بے ادبی سرزد ہو بھی گئی تو ہم بخوشی برداشت کر لیں گے لیکن یہ سب کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔

آخر ماسی بولی۔ ''کب تک آئے گا؟''

''کون؟ راجو؟ وہ شاید کل تک بھی نہ آئے اس لئے اگر کوئی پیغام ہے تو ہمیں بتا دو ہم راجو کو پہنچا دیں گے۔''

''پیغام تو ہے مگر؟.....''

''ہاں' ہاں کہہ دو ہم راجو کو آتے ہی بتا دیں گے۔''

''نہیں' راجو ہی آپ کو بتائے تو اچھا ہے؟''

''گویا پیغام ہمارے نام ہے؟''

''ہے تو سہی۔''

''کس کا ہے؟''

''موتیا کا۔''

''موتیا؟ کون موتیا؟''

ہم اپنے وقار کو آخری سہارا دے رہے تھے لیکن دانائے راز ماسی کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا' بولی۔ ''وہی موتیا جس کے لئے شعر پڑھتے رہتے ہو۔''

اب وقار کی حفاظت بے کار تھی ہم نے ماسی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور کہا۔ ''کیا کہتی تھی موتیا' ماسی؟''

''ہاں' اس طرح پوچھو نا!'' ماسی کی آنکھ اور زبان میں ایک واضح بے باکی نظر آنے لگی۔

ہم نے وہی سوال دہرایا۔ ''اچھا کیا کہتی تھی؟ بولو بھی ماسی!''

''ڈھولے گاتی تھی۔''

''کس کے۔''

''تمہارے۔''

''سچ؟''

''جان دیتی ہے تم پہ۔''

ہم خوشی سے بے ہوش ہو گئے اور ٹیکنی کلر میں خواب دیکھنے لگے۔ جاگے تو ماسی جا چکی تھی اور راجو سامنے کھڑا ہنس رہا تھا ظاہر تھا کہ راجو اور ماسی باہم نوٹ ملا چکے ہیں۔ راجو نے ہمیں چھیڑنے کی خاطر گنگنانا شروع کر دیا۔ ''پیا من کو جانا۔'' اس پر ہم نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا کہ راجو بہر حال نوکر ہے اب ہمارے محبت کے معاملات میں حصہ نہیں لے گا' ہمارا رابطہ براہ راست ماسی مہرو سے قائم ہو چکا ہے چنانچہ اس کے بعد ہم نے راجو سے اپنی گفتگو غیر عاشقانہ باتوں تک محدود رکھی۔ مثلاً چائے لاؤ' برتن اٹھاؤ وغیرہ۔

ہمیں اب ماسی سے باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کرنے کی بے تابی تھی لیکن ماسی مہرو بھی ترسانے کی غرض سے دوسرے روز سہ پہر سے پہلے نہیں آئی۔

''ماسی! موتیا اور کیا کہتی تھی؟''

کہتی تھی ''اُتے خدا دسدا تھلے اک دم ماہیے دا۔''

''یعنی ہمارا دم؟''

''نہیں' کالے چور کا۔''

''نہیں ہمارا۔'' ہم نے ماسی کی واضح بے ادبی برداشت کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں' تمہارا نہیں تو اور کس کا؟''

ہمارے دماغ کے مختلف گوشوں میں چھوٹے چھوٹے قمقمے جگ مگا اُٹھے ہم نے وفور اشتیاق میں کہا ''ماسی موتیا سے کب ملاقات ہوگی؟۔''

''ملاقات؟ وہ تو نہیں ہوسکتی۔''

''ہوں؟ کیوں نہیں ہوسکتی؟''

''وہ ایسا ہی کہتی تھی کہتی کہ پتہ چل گیا تو گھر والے مار ڈالیں گے۔''

''ماسی! وہ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں مل سکتی؟ میں صرف اسے قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''قریب سے دیکھنے ہی کو ملاقات کہتے ہیں وہ نہیں ہوسکتی۔''

''ماسی ایک دفعہ اسے کہہ کر تو دیکھو۔ اُسے کہو کہ میری بات سن جائے میں اسے صرف دو لفظ کہنا چاہتا ہوں دو نہیں' ایک' دو تین' چار' پانچ' بس پانچ لفظ۔'' میں نے فقرے کے الفاظ دل میں گنتے ہوئے کہا۔

''پھر؟''

''پھر وہ بے شک نہ ملے۔''

''اچھا دیکھوں گی۔''

''ماسی! اتنے لمبے مستقبل کا صیغہ مت استعمال کرو جو کچھ دیکھنا ہے' ابھی دیکھو' آج ہی دیکھو اور ہمیں آ کر بتاؤ۔'' ماسی چل دی۔

ایک دن گزر گیا پھر ایک دن اور گزر گیا۔ ماسی نظر نہ آئی بھئی تم بھی جوان ہوا گر کبھی عشق کیا ہے تو ہماری بے تابی دل ہمارے اندیشہ ہائے دُور دراز ہمارے وسوسوں اور ہمارے بیم و رجا کا تمہیں کچھ اندازہ ہوگا۔ عشق کی اس منزل میں بھوک اور نیند حرام ہوجاتی ہے اور جنگل کی طرف نکل جانے کو جی چاہتا ہے ہم نے جنگل کا رُخ تو نہیں کیا لیکن وہ تمام علامات عشق جو حکما کے نزدیک گھر کے اندر ظاہر ہوسکتی ہیں ہم میں ظاہر ہونے لگیں۔

تیسرے روز غروب آفتاب کے وقت ہم غم محبت سینے سے لگائے بیٹھے تھے کہ اچانک دستک کے بغیر دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ بتاؤ تو بھلا کون تھا؟''

''ماسی مہرو۔'' نیاز جھٹ بول اٹھا۔

''اوں ہوں۔'' چچا نے سر ہلایا۔

''راجو؟'' میں نے بتانے سے زیادہ پوچھا۔

''ارے بھائی ماسی اور راجو کا گھر میں آنا بھی کوئی آنا ہے۔'' چچا کسی قدر جوش سے بولے۔'' یہ خود موتیا تھی' ہاں موتیا! اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہیں آتا تھا۔ ہمارے گھر میں موتیا یہ وہ خدا کی قدرت تھی جس کے متعلق غالب نے شاعری تو کی ہے لیکن غالباً بھی دیکھی نہ تھی ہم نے بچ بچ دیکھی اور دیکھتے ہی ہمارے دل کے تار سے نغمہ پھوٹا۔

''یہ نصیب اللہ اکبر''

لیکن جب موتیا کا چہرہ غور سے دیکھا تو ہمارا نغمہ اللہ اکبر ہی پر رُک گیا موتیا کے چہرے پر ہراس تھا اسے کوئی بے پناہ کشش کھینچ تو لائی تھی لیکن کمرے میں قدم رکھتے ہی جیسے اسے کسی غلطی کا احساس ہوا ہو جیسے اس کی حیا کی حس بیدار ہوگئی ہو۔ اس کے منہ سے صرف تین الفاظ نکلے جنہیں وہ غالباً ساری راہ زیر لب دہراتی آئی تھی۔

'کیا حکم ہے؟'' یہ ہمارے بلاوے کا جواب تھا اور پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہہ پاتا بولی۔ ''اب میں جاتی ہوں۔'' اور دروازہ کھول کر ہوا ہوگئی۔

محبت یا چشم زدن سے کم تو وقت میں آخر ہوگئی

تھی۔

باہر نکل کر دیکھا تو موتیا کے پیچھے کوئی آدمی جا رہا تھا۔ اس آدمی نے موتیا کو نکلتے دیکھ لیا ہے یہ اس کے گھر والوں کو تو نہیں بتائے گا کیا وہ بے چاری کو ایذا دیں گے؟ میرے دل میں ہزار شکوک ابھرے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد میرے دوست اکرم آئے اور بولے سنا ہے تمہارے گھر موتیا آئی تھی ہندو مشتعل ہو رہے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ فکر مت کرو مولوی عبدالغفور جانبازوں کی ایک جماعت لے کر تمہاری حفاظت کو آ رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کافروں کی کیا جرأت کہ ہمارے غازی کو چھیڑیں۔"

میرا سر چکرا گیا۔ مجھے ہندوؤں کے اشتعال کی واجبی سی فکر ضرور تھی لیکن اس خیال سے کانپ اٹھا کہ جملہ جاں بازان شہر اپنے غازی کی حفاظت کو بڑھ رہے ہیں ہماری رسوائی کا اس سے زیادہ عظیم الشان اہتمام اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایک خیال ہمارے ذہن میں رہ رہ کر ابھرنے لگا اپنے بزرگوں کی عزت کا خیال! وہ سنیں گے تو کیا کہیں گے، پھر اپنے شریکوں کی چہ مے گوئیوں کا خیال! وہ سنیں گے تو کیا کیا نہ کہیں گے۔ بے شک عشق کرنا عیب نہیں لیکن عاشقی میں اناڑی پن بڑی نالائقی ہے اور یہ نالائقی ہم سے ہو گئی تھی نظیری کا مصرع بار بار کانوں میں گونجتا۔

ناموس صد قبیلہ زیک خامئی تو رفت

ادھر باہر گلی میں چند لونڈوں نے نعرہ بلند کیا۔

"ہمارا غازی زندہ باد!"

یہ مولوی عبدالغفور کے جیش کا نابالغ ہراول تھا۔

میں نے اکرم سے کہا۔"اکرم! جاؤ مولوی صاحب کو روکو اور انہیں کہہ دو کہ موتیا کی کہانی کسی دشمن کی ہرزہ سرائی ہے اور افواہوں پر کان دھرنا شرعاً بھی روا نہیں اور ہاں یہ بھی پتہ کر لو تا کہ موتیا کس حال میں ہے؟" اکرم بولا۔"اگر موتیا کی کہانی محض افواہ ہے تو اس کا حال پوچھنے کی بے تابی کیوں؟"

"بھئی! سمجھتے کیوں نہیں؟ افواہ تمہارے لئے نہیں، مولوی صاحب کے لئے ہے۔ انہیں روکو اور موتیا کی خبر لاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد اکرم مولوی صاحب کی کامیاب ناکہ بندی کرنے کے بعد لوٹے اور بہ مشکل یہ مبارک خبر سنا ہی چکے تھے کہ ملک گھسیا خان تشریف لے آئے اور ابتداء ایک پرجوش مبارک باد سے کی مبارک باد کی شان نزول پوچھی تو بولے۔"تم نے مسلمانوں کی عزت رکھ لی۔"

شان نزول فوراً سمجھ میں آ گئی ملک صاحب کے گنوار پن کی لو بہت دبیز تھی لہٰذا عافیت اسی میں تھی کہ ان کے ساتھ بحث کے بجائے اتفاق کیا جائے۔ عرض کیا ملک صاحب یہ خاکسار کس قابل ہے بس تمنا تھی کہ کوئی خدمت اسلام کر جاؤں، سو کر دی۔"

"شاباش اس کا اجر تمہیں خدا دے گا۔"

"کاش یہ سعادت میری جگہ آپ کے حصے میں آئی ہوتی۔"

"تم دعا کرو۔" یہ کہتے ہوئے مجھے ایک رازدارانہ آنکھ ماری۔"

میں ملک صاحب کو دیکھتا اور سوچتا کہ کیا انسانی دماغ احساسات لطیف سے اس قدر عاری بھی ہو سکتا ہے لیکن کتنے آدمی ہیں جو یہ کمی محسوس کرتے ہیں؟ کسی کو جسمانی خراش آ جائے تو ہماری تعزیرات میں اسے ضرب شدید کہتے ہیں لیکن ذہنی چوٹ کا تعزیرات میں کہیں ذکر ہی نہیں، حالانکہ سنگین ترین جرم وہ بدنی زخم نہیں جو تیز دھار آلے سے آتا ہے بلکہ وہ ذہنی گھاؤ ہے جو تند زبان سے واقع ہوتا ہے۔

آخر مبارک باد کا فریضہ ادا کرنے کے بعد ملک

صاحب رخصت ہونے لگے میں نے گہری سانس لی اور پیشتر اس کے کہ اخوت کا مارا کوئی اور قدر دان مبارک باد کا بوجھ ہلکا کرتا میں نے دروازہ بند کر کے بتی گل کر دی اور بستر پر دراز ہوگیا۔ لیکن نیند کہاں‘ وہی دل جو چند ساعت پہلے گزرگاہ خیال سے مینہ و ساغر تھا۔ اب گوناگوں وسوسوں کی آماجگاہ تھا۔ کہیں وہ ظالم اس بے چاری کو ستا نہ رہے ہوں۔ لیکن آخر اس کا جرم کیا ہے؟ اس نے فقط ایک لمحے کے لئے میرے کمرے میں جھانک کر دو لفظ ہی تو کہے تھے اور اگلے لمحے غائب ہوگئی تھی۔ کیا کسی سے بات کرنا جرم ہے‘ کیا وہ محتسب کسی سے بات نہیں کرتے؟ نہیں وہ موتیا کو کچھ نہیں کہیں گے۔

دوسرے دن کالج میں چھٹی تھی صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ موتیا کے باپ کو اشتعال ضرور آیا تھا لیکن اس نے خاموشی سے فقط پرنسپل سے جا کر شکایت کی اور میرے تبادلے کا مطالبہ کیا۔

کوئی دوپہر کا وقت تھا کہ چپڑاسی پرنسپل صاحب کا سلام لے کر آیا۔ پرنسپل صاحب میرے قریب ہی رہتے تھے خوش مزاج آدمی تھے معمول سے زیادہ مسکرا کر ملے اور ابتدائی علیک سلیک کے بعد ہماری گفتگو شروع ہوئی ”لالہ لونڈیا مل کہتے ہیں کہ کل ان کی لڑکی تمہارے مکان پر گئی تھی۔“

”جی ہاں‘ ٹھیک کہتے ہیں۔“

”کیسی لڑکی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”اچھی ہے؟“

”جی ہاں‘ بہت۔“

”کس لئے گئی تھی۔“

”کیا مطلب؟۔“ میں نے بلا بھیجا تھا۔“ ”کچھ بات کہنا تھی۔“

”پھر کہہ دی۔“

”کہنے کا موقع ہی نہیں ملا‘ وہ آئی اور چل دی۔“

”اسے بھی تم سے محبت ہے؟“

”آثار تو ایسے ہی ہیں۔“

”شادی کرلو گے؟“

”دل و جان سے۔“

”مگر تم مسلمان ہو۔“

”جہانگیر بھی مسلمان تھا۔“

”مگر وہ بادشاہ بھی تھا۔“

”یہ معمولی سی کمی ضرور ہے۔“

پرنسپل صاحب ہنس دیئے اور بولے ”یہ کمی تو شاید مستقبل قریب میں پوری نہ ہو سکے خیر چائے تو پیو۔“

پرنسپل صاحب پر ولایت کی تعلیم نے نہایت صحت مند اثر کیا تھا۔ چائے پینے کے دوران کہنے لگے۔ ”لالہ جی تمہارے تبادلے پر مصر ہیں لیکن مجھے یہ نہیں بتا سکے تمہارا قصور کیا ہے۔ کل کسی نیک بخت نے میرے صحن میں جھانک لیا تو میرے تبادلے کا تقاضا ہونے لگا اور اگر اس پھرتی سے تبادلے شروع ہوگئے تو گورنمنٹ کے کالج چلنے سے رہے میں لالہ جی کو سمجھا دوں گا۔“

پرنسپل صاحب کی ملاقات تو حسب معمول خوش گوار تھی لیکن ہمارا دل ہمارے رومان کی طرح نہایت شکستہ حالت میں تھا اب وہ گلی جس سے موتیا گل کترتی گزرتی تھی سونی پڑی تھی۔ موتیا کو سلام بھیجنے کی حسرت تھی لیکن اب پیام بری کون کرتا؟ ماسی روپوش ہو چکی تھی اور راجو کی وہاں تک رسائی نہیں تھی۔

تیسرا دن تھا‘ پچھلے پہر صحن میں بیٹھا تھا کہ دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی باوقار سی خاتون داخل ہوئی قریب آئی تو میں تعظیماً کھڑا ہوگیا۔ خاتون کسی تمہید کے بغیر بولی۔ ”بیٹا! مجھے پہچانتے ہو؟“

”نہیں۔“ میں نے کسی قدر معذرت کے لہجے میں کہا۔

”میں موتیا کی ماں ہوں۔“

ایک لمحے کے لئے میرا دماغ جواب دے گیا ذرا سنبھلا تو کرسی پیش کی لیکن اس نے کرسی پر توجہ نہ

دعا تقدیر بدل دیتی ہے (حدیث رسول)

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور ایمان افروز پیشکش

شائع ہو گیا ہے

- مسنون دعائیں۔
- عظیم پیغمبران خدا کی وہ دعائیں جو نسل انسانی کے لیے نجات اور عزیمت کا باعث بنیں۔
- خالق کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہ کی تمام مسنون دعائیں جو رحمت اللعالمینؐ کی ذات برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی دعائیں۔
- آئمہ کرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دعائیں۔

جدید دنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے
پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تشفی آمیز
روحانی اور ایمانی علاج

سیارہ ڈائجسٹ ۲۴۴ مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔
فون نمبر: ۶۲۳۵۴۱۲

دی میرے منہ سے نکلا موتیا تو خیریت سے ہے؟''
''موتیا کی خیریت کی بہت فکر ہے؟''
''مجھے ڈر تھا' آپ اسے ایذا نہ پہنچائیں۔''
''ہم اور موتیا کو ایذا؟ موتیا ہماری بیٹی ہے۔''
''شکریہ۔''
''لیکن کچھ اس ایذا کا بھی خیال ہے جو موتیا کے ماں باپ کو پہنچی ہے؟'' اس فقرے پر میں ذرا چونکا دیکھا تو موتیا کی ماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اگلے لمحے میں اس کی پلکیں آنسو نہ تھام سکیں اور ایک گریے کے عالم میں اس کے منہ سے نکلا:
''اے کاش میری بیٹی تو یہاں نہ آئی ہوتی۔''
میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ میری زبان گنگ تھی مجھے اس وقت تک اگر کسی کی رسوائی کا خوف تھا تو وہ اپنی اور اپنے خاندان کی رسوائی تھی موتیا اور اس کے ماں باپ کی بدنامی میرے ذہن میں نہیں آئی تھی اب میرے کانوں میں نظیری کا پورا قطعہ گونجنے لگا جو مجھ سے زیادہ موتیا پر صادق آتا تھا۔

رفتی بہ بزم نکونامی تو رفت
ناموس صد قبیلہ زیک خامی تو رفت
اکنوں اگر فرشتہ شو گو بدست پرسود
در شہر صد حکایت بدنامی تو رفت

میں اسی سوچ میں تھا کہ موتیا کی ماں چل کھڑی ہوئی جاتے جاتے میری طرف دیکھا اور ایک کرب انگیز لہجے میں کہا۔''ہر گھر میں موتیا کا چرچہ ہے اور جب تک تم یہاں موجود ہو رہے گا۔''
میں نے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔''آپ اطمینان رکھیں میں کل شام سے پہلے یہاں سے چلا جاؤں گا۔
موتیا کی ماں کا چہرہ کھل اٹھا، دروازے سے نکلنے لگی تو ممنونیت میں اس کے منہ سے دعا نکلی،
''جیتے رہو بیٹا! بھگوان تمہارا بھلا کرے۔''
کوئی گھنٹے بھر بعد میرے دوست اکرم آئے اور آتے ہی بولے''سنا ہے تمہارے گھر موتیا کی ماں آئی تھی اور تم نے ہندوؤں سے صلح کر لی ہے۔''
''پھر؟''
''مولوی عبدالغفور بڑے مشتعل ہو رہے ہیں' تمہارے خلاف فتویٰ دینے والے ہیں۔''
''میرا قصور؟۔''
''مولوی صاحب کے پاس چشم دید شہادت پہنچی ہے کہ موتیا کی ماں کو تمہارے گھر کے دروازے پر دیکھا گیا اور تمہیں دعا دیتے سنا گیا۔
''دعا لینا کب سے گناہ ٹھہرا ہے؟''
''میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باہر دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے چند لونڈے یک زبان ہو کر بولے۔''ہمارا غدار مردہ باد!''
دوسرے روز ہم بالاپور سے اپنی درخواست پر تبدیل ہو کر ایک دوسرے شہر میں پہنچ گئے اور فتوے کی زد سے نکل گئے۔ وہاں دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ہمارے نام ایک اجنبی سا خط آیا۔ کھول کر دیکھا تو فقط اتنا لکھا تھا
''پردیسی نال نہ لائیے یاری توڑی لکھ سونے دا ہووے!''
پردیسی لاکھ سونے کا ہو اس سے محبت مت کرو۔
یہ موتیا کا خط تھا جہاں فتویٰ نہ پہنچ سکا تھا عشق پہنچ گیا۔ موتیا کی محبت کو بظاہر خاندان کی بدنامی کا احساس نہیں تھا میرے پہلو میں بھی دل تھا۔ بے اختیار بھر آیا چاہا کہ جواب میں اسی شعر کا دوسرا مصرع لکھ بھیجوں اور کلیجا چیر کر کاغذ پر رکھ دوں۔
''پر اک گلوں پردیسی چنگا جد یاد کرے تاں رووے!''
(لیکن ایک طرح پردیسی ہی اچھا ہے کہ یاد کرتا ہے تو رو دیتا ہے)۔
لیکن قلم اٹھایا تو ایک بے بس ماں کی روتی آنکھیں سامنے آ گئیں اور قلم رکھ دیا۔''
ہم تینوں نے دیکھا تو چچا کی اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ کہانی ختم ہو چکی تھی ہم خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

نشاط بابا

● نوشابہ اختر

اور پھر ایک دھماکہ ہوا۔ ایک انہونی جس کا تصور کرنا بھی ہمارے لئے گناہ سے کم نہ تھا۔ یہ ایک سربمہر خط تھا جو دہئی سے ابا جانی کو موصول ہوا۔ کتنی ہی دیر وہ خط کو سامنے رکھے گہری سوچ میں ڈوبے رہے کہ کھولوں یا نہ کھولوں میرا دہئی میں کون ہے جس کا سربمہر خط مجھے ملے۔ لیکن پھر جب اُلٹ پلٹ کر غور کیا تو منجانب نشاط بابا لکھا تھا۔

ایک شخص کی عبرت انگیز کتھا جو لالچ کے ہاتھوں ذلت و بربادی کا شکار ہوگیا

سرور' انبساط' مسرت' خوشی' یہ سب احساسات لفظ نشاط میں ایسے ہی چھپے ہوئے ہیں جیسے خوشبو پھول میں اور چوزہ انڈے میں چھپا ہوتا ہے اور نشاط بابا میں یہ سب کچھ ہی موجود تھا۔ مسکراتا چہرہ' بولتی آنکھیں ہر ایک سے محبت بھری گفتگو' ہمدردی اور مدد اور یہ ساری خوبیاں مل کر ان کے چہرے کو بڑا پیارا سا تقدس دیتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

یہ سال 1977ء تھا۔ جب ہمارے ہمسائے میں ایک نیا خاندان آکر آباد ہوگیا۔ ٹرک سے سامان اُترنا شروع ہوا تو ایسے جیسے کسی نے خزانوں کے منہ کھول دیئے ہوں۔ بڑے بڑے ٹرنک' نئی قسم کی کرسیاں اور میزیں۔ نواڑ کے بنے پلنگ' بان کی نئی چارپائیاں اور بھی بہت کچھ۔

جب تک ان کا سامان سیٹ نہ ہوا اماں جانی

ان کے لئے کبھی دال چاول' کبھی آلو گوشت اور ڈھیروں روٹیاں بھجواتی رہیں۔ موسم چونکہ اچھا تھا گرمی بہت زیادہ نہیں تھی اس لئے انہیں شاید اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یا شاید وہ لوگ اتنے بامروت اور حیادار تھے کہ انہوں نے بھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔

اور تیسرے روز صبح صبح جب گھنٹی بجی تو دروازے پر نشاط بابا اپنی پوری مسکراہٹوں کے ساتھ جگمگا رہے تھے اور ان کے ہاتھوں میں ایک بہت خوبصورت خوان پوش کے نیچے ایک طشتری مہک رہی تھی۔ اسی مسکراہٹ کے ساتھ اُن کے لب ہلے۔

''بیٹا یہ لے جایئے اور نوش فرمایئے۔ پسندیدگی کا اظہار ضرور کیجئے گا۔ پکانے والی کا حوصلہ بلند ہوتا ہے۔''

اتنی نستعلیق گفتگو اور میرے اندر پھوٹتی پھلجھڑیاں بات تو بہت بُری ہے لیکن میں نے اسی لب ولہجے میں اماں جانی سے جب ساری بات کی تو وہ بھی اپنی مسکراہٹ روک نہ سکیں مگر ساتھ ہی ڈانٹ بھی پلادی کہ کسی کی نقل نہیں اُتارتے۔

''جس کی چاہے قسم لیجئے اماں جانی! مگر آپ شکر اور مرچ کو تو نہ ملایئے ہمارے منہ کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔''

میں نے طشتری ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا اور بھاگ کر پیچھے بھی ہٹ گئی ورنہ ایک زور دار دھماکہ ضرور ہوجاتا۔

بریانی واقعی شاندار تھی اور ہم نے بھی جی بھر کے تعریف کی کیونکہ انہوں نے تو ہمارے دال چاول اور آلو گوشت کو بھی مرغ مسنجن بنا کے کھایا تھا۔

نشاط بابا کے گھر میں جتنا سامان آیا تھا افرادی گنتی بھی اس لحاظ سے برابر ہی تھی۔ چھوٹی سی ناک میں بڑا سا کوکا پہنے ان کی دلہن تھیں۔ جو گیارہ بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی دلہن ہی کہلاتی تھیں کیونکہ انہیں دلہن کہنے والی ان کی ساس حیات تھیں جو اس عمر میں بھی آدھا گھونگھٹ لٹکائے رکھتی تھیں۔ سطوت' فرحت کے بعد شجاعت' رفاقت' استقامت پھر روبینہ' نگینہ' سفینہ' اس کے بعد عماد' معاذ اور پھر فل سٹاپ کے لئے ارباز۔

سکینہ بی بی جو دراصل مسز نشاط بابا تھیں جب روٹیاں پکانے لگتیں تو چاروں طرف پکتی روٹی کی مہک مسکرانے لگتی اور انہیں گھنٹوں گزر جاتے روٹیاں پکتی ہی چلی جاتیں۔ کیونکہ اتنے بڑے ''ٹبر'' کے ساتھ ان کے ہاں مہمانوں کی آمد بھی بہت زیادہ تھی کبھی بڑا سا دیگچہ یا پتیلا نہاری کی سدا بہار خوشبو پھیلانے لگتا اور کبھی حلیم کی مہک چاروں طرف عود کر آتی اور جس روز بمبئی بریانی بن جاتی تو سارا محلہ ہی خوشبو گزیدہ بن جاتا۔

دراصل یہ وہ دور تھا جب حلیم' بریانی اور نہاری لاہوریوں کی خوراک نہیں بنا تھا۔ شاید کہیں کہیں یہ پکوان پک رہے تھے مگر ہم جیسے عام گھروں میں نہیں اور یعنی ایک پلیٹ جو پلیٹ کم اور ڈش زیادہ ہوتی ہمارے آنگن میں بھی خوشبو پھیلانے آجاتی۔ اماں جانی بھی تو کسی سے کم نہ تھیں کبھی کچریلا' کبھی گاجر کا حلوہ کبھی ساگ اور مکئی کی روٹی ادھر بھیجی جاتی۔ مگر ہمیں سختی سے اس بات کی ممانعت تھی کہ ان کے گھر اول تو کھانے کے اوقات میں جانا ہی نہیں اور اگر کبھی اتفاق سے وہاں ہوں تو ان کے دسترخوان پر ہاتھ صاف کرنے نہیں بیٹھ جانا۔ اور اس حکم کی تابعداری انتہائی دشوار تھی کیونکہ چاچی سکینہ جنہیں دراصل ہم سب بالی سکینہ کہتے تھے اپنی مسکراہٹوں کے سائے تلے ہمیں کچھ نہ کچھ تو کھلا ہی دیتی تھیں۔

نشاط بابا کا کاروبار پہلے تو کسی کے پلے ہی نہ پڑا کہ وہ کیا کرتے ہیں کیونکہ اکثر وہ ہفتوں کے لئے غائب ہوجاتے تھے اور گھر میں بھی کوئی فکرمند نہ ہوتا بھائیوں کے گونجدار قہقہے' باجیوں کی کھسر پھسر

اور دبی دبی ہنسی اور چھوٹے بچوں کے معصوم سے جھگڑے چلتے ہی رہتے۔ نہاریاں اور حلیمیں اور بریانیوں کے بڑے بڑے پکوان پکتے رہتے۔

اور پھر جب نشاط بابا کی آمد ہوتی تو رونقیں اور بھی بڑھ جاتیں۔ پتہ نہیں ان کی شخصیت میں کیا خصوصیت تھی کہ پورا محلہ ہی جاگ اُٹھتا۔ محلہ کی بہتری کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ گلیاں صاف ستھری اور روشنی کا نظام بہتر ہوگیا۔ رات کو چوکیدار قائم کرنے کے لئے بہت تھوڑا سا چندہ جمع کرکے چوکیدار کا انتظام کردیا گیا۔ محلے کی مسجد میں ایک پڑھے لکھے قاری صاحب بلا لئے گئے۔ یعنی یوں سمجھیں کہ باقاعدہ طور پر بچوں کے لئے علیحدہ وقت مقرر کردیا گیا اور تعلیم قرآن بہت اچھے طریقے سے دی جانے لگی۔ گورنمنٹ سکول تو تھا ہی اور اس میں اساتذہ بھی بہترین تھے۔ یعنی اگر آج میں اپنی شخصیت کی تکمیل کو والدین کے بعد کسی کا مرہون منت سمجھتی ہوں تو وہ میرے بہترین اساتذہ تھے۔

کردار سازی اس وقت کے اساتذہ کا بہت بڑا کمال تھا جو آج کہیں نظر نہیں آتا۔ دراصل اس وقت والدین بھی بچوں کو استاد کے حوالے کرکے پُرسکون ہوجاتے تھے۔ دخل درمعقولات کہیں نہیں تھی آج کا استاد اگر کسی بچے کو اس کے لباس یا اس کی کسی اور بات پر سرزنش کرتا ہے تو والدین اس کا بُرا مناتے اور کہہ دیتے ہیں کہ آپ کا کام پڑھانا ہے اور بس جبکہ اس وقت معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ سکول اور کالج کردار سازی کی ایسی بھٹی تھے جن میں سے طالب علم کندن بن کر نکل رہے تھے۔

بہرحال ہمارا محلہ ایک مثالی محلہ تھا جہاں سب لوگ ایک خاندان کی طرح تھے۔ دُکھ سُکھ کے ساتھی اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے سوچ کر قدم اُٹھانے والے۔

پھر ایسا ہوا کہ سلوت باجی اور فرحت باجی اپنے پیا دیس سدھار گئیں۔ کئی روز محلہ جگمگاتا اور گنگناتا رہا۔ ڈھولک کی تھاپ پر محلے کی ساری بچیاں خوشیوں کے گیت گاتی رہیں۔ دو باراتیں ایک ساتھ آئیں اور دو دلہنیں ایک ساتھ بابا کا آنگن سونا کرکے چلی گئیں۔ بہرحال یہ تو ہونا ہی تھا۔ بیٹیاں تو بابل کے آنگن میں رحمت کی مہمان بن کر اُترتی اور وقت آنے پر اپنے اصل ٹھکانے کی طرف پرواز کر جاتی ہیں۔

اس کے ایک سال بعد شجاعت بھائی بیرون ملک تعلیم مکمل کرنے کے لئے پرواز کرگئے اور یقیناً سال بھر بعد ہی رفاقت بھیا آرمی جوائن کرکے کاکول اپنی ٹریننگ کے سلسلے میں پردیسی ہوگئے۔

تین کے ٹرائی اینگل میں پیچھے رہ جانے والے استقامت بھائی بڑے ڈانواں ڈول سے پھرتے اور اپنے روشن مستقبل کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے مارتے آخر ایک روز بیرون ملک روانہ ہوگئے۔

وہ آنگن جو جوان قہقہوں سے گونجتا تھا اور کنواری ہنسی سے مسکراتا تھا اُداس اُداس سا ہوگیا کیونکہ روبینہ، نگینہ اور سفینہ ابھی لڑکپن کی سیڑھیوں پہ بیٹھی تھیں حالانکہ ان کے اندر بھی بہت سی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ ہماری آپس کی دوستیاں بھی تھیں پھر اماں جانی ہمیں ان کے ساتھ مل بیٹھنے سے روکتی بھی نہیں تھیں کیونکہ ان کی زبان دانی اماں جانی کو بہت پسند تھی اور چاہتی تھیں کہ ہمارا بھی اردو دانی پر عبور حاصل ہوجائے۔

وقت گزرتا رہا ہم لوگ بھی سکولوں سے کالج اور کالجوں سے یونیورسٹیوں کی رونق بنتے رہے۔ لیے سے نشاط بابا اپنے بزنس کے سلسلے میں اکثر افغانستان جاتے رہے کیونکہ ان کا خشک میوے کا کاروبار تھا۔ جو وہ آہستہ آہستہ دبئی منتقل کر رہے تھے کہ یہاں تو سال بھر میں چار ماہ ہی یہ کاروبار چلتا تھا۔ سال کے باقی مہینوں میں نشاط بابا کپڑے کا

کام کرتے جو تھوک کا کام ہوتا تھا اور انہیں بہت فائدہ بھی ہوتا تھا۔

اتنی بہت سی خوبیوں کے مالک نشاط بابا ایک بند کتاب کی طرح تھے۔ ان کی ذات کے بہت سے پہلو سب کی نظروں سے اوجھل تھے۔ ڈرائی فروٹ کا کاروبار ان کے لئے بہت سود مند تھا۔ کوئی دکان وغیرہ ان کی ملکیت میں نہیں تھی۔ بس تھوک کا کام تھا۔ سامان ٹرکوں سے آتا منڈی جاتا اور نشاط بابا فارغ۔ ابا جان نے ایک بار ان سے کہا بھی کے نشاط بابا آپ کے پاس یہاں کچھ تو پراپرٹی ہونی چاہئے نا۔ ماشاء اللہ آپ کے بچے ہیں یہ چھوٹا سا گھر سب کو تو نہیں سمیٹ سکتا۔

اور وہ ہنس دیئے...... بڑے بھائی! جیسے ہم نے اپنی دنیا آپ بسائی یوں ہی یہ سب بھی کرلیں گے۔ ہم نے پڑھا لکھا دیا اب اپنا مستقبل خود ہی بنائیں۔

اور یوں اپنا مستقبل بنانے کی شروعات شجاعت بھائی اور استقامت بھائی نے کی۔ جنہوں نے دیار غیر میں اپنے لئے شریک حیات تلاش کرکے اپنے اپنے گھر بسا لئے۔ دادی ماں تو یہ خبر سنتے ہی بستر سے جالگیں اور پھر کبھی اُٹھ نہ سکیں۔ سکینہ چاچی تو ایک گہرا سمندر تھیں اوپر سے پرسکون اور تہہ میں پریشانیوں کے طوفان وہ تو مسکراتے ہوئے بھی ایسے لگتا رو پڑیں گی۔ دو بیٹوں کے دیار غیر میں شادی کر لینے کے غم کو سینے میں ہی کہیں دفن کر دیا اور امی جان کے استفسار پر بولیں۔

جی بھابی جی! نصیب کا لکھا کون کاٹ سکتا ہے یہ تو کاتب تقدیر کے قلم سے نکلا ہوا وہ تیر ہے جسے ہم نے خوشی خوشی سینے میں اُتارنا ہے۔ رب انہیں خوش رکھے بس آپ بھی دعا کریں۔

اور امی جان افسردہ سی واپس لوٹ آئیں۔ کیونکہ بیٹوں کے سر پر سہرا دیکھنے کا ارمان تو ہر ماں کو ہوتا ہے ہر بہن چاہتی ہے کہ "ویر میرا گھوڑی چڑھیا"

گا کر بھائی سے نیگ حاصل کرے۔ نشاط بابا کے احساسات کیا تھے کوئی بھی نہ جان سکا نہ ان کے چہرے کے تاثرات بدلے اور نہ انداز گفتگو۔ بہرحال اس گھر میں کسی قسم کی فوری تبدیلی نہ آئی اور وقت گزرتا گیا۔

جب بھی نشاط بابا کا ڈرائی فروٹ آتا وہ ساتھ والے تین چار گھروں میں کشمش، بادام، اخروٹ اور انجیر سے بھری ایک ایک پلیٹ ضرور بھیجتے۔ امی جان کے استفسار پر ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

بھابی جی! یہ میرے بیٹوں کا حق ہے اور میرے رزق کی برکت کا نیک شگون، انکار نہ کیجئے گا۔

اور ان کا طرز تکلم ایسا ہوتا تھا کہ اگلا بندہ لاجواب ہی ہو جائے۔

پھر ایک روز عجیب تماشا ہوا۔ ایک کار گلی میں آ کے رُکی: اور اس میں سے شجاعت بھائی اور استقامت بھائی اپنی اپنی دلہنوں کے ساتھ برآمد ہوئے۔ گوری چٹی وہ دلہنیں بھلا ہماری دلہنوں کا مقابلہ تو کیا کرسکتی تھیں لیکن ان کا لباس ان کی بولی ہم سب کے لئے ایک عجیب سا تجربہ تھا۔ انگلش میں بات تو ہم بھی کرسکتے تھے لیکن ان کے لب و لہجے سے کچھ پلے پڑتا تو جواب دیتے۔

سکینہ چاچی نے ان کا استقبال ضرور کیا۔ ان کی پسند کا کھانا بھی انہیں کھلایا۔ لیکن بیٹوں کے سروں پر دست شفقت نہ پھیر سکیں اور پھر تنہائی میں بہت روئیں اور یوں دو روز کے بعد ہی وہ دونوں بھائی واپس لوٹ گئے شاید پھر کبھی نہ آنے کے لئے۔

یہ بڑی افسردہ سی خبر تھی۔ جس نے ہم سب کو کئی روز افسردہ ہی رکھا۔ لیکن پھر سب اپنے اپنے شب و روز میں مگن ہوگئے۔ سکینہ چاچی کے علاوہ، جو ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی طرح ڈگمگاتی پھر رہی تھیں۔

نشاط بابا کی اولاد بہت لائق فائق تھی۔ سارے

ہی بچے پڑھائی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ روبینہ، نگینہ اور سفینہ نے ماسٹرز کے بعد ٹیچرشپ کو ترجیح دی۔ روبینہ نے تو پی ایچ ڈی بھی کرلیا۔ سکینہ چاچی اب اس انتظار میں تھیں کہ اچھے رشتے آئیں تو وہ ان کے فرائض سے بھی سبکدوش ہوں نشاط چاچا کے وہی شب و روز تھے۔ کبھی تو پندرہ روز بعد آجاتے اور کبھی مہینہ دو مہینہ بعد آتے لیکن ان کے گھر میں روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔

اسی دوران عماد اور معاذ نے انجینئرنگ میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور اماں کی منت سماجت اور رو رو کر بُرا حال کرنے کی وجہ سے انہوں نے پاکستان میں ہی نوکریاں تلاش کرنا شروع کردیں۔

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وقت نے ایک عجیب سی کروٹ لی۔ سالہاسال سے بنی حیاداری، مروت، اخوت اور احساس ذمہ داری کی دیوار میں شگاف پڑ گیا۔ شادی کے انتظار میں بیٹھی روبینہ اپنے بالوں میں اُترتی چاندی کا سامنا نہ کرسکیں اور اپنے کالج کے کلیریکل شاف میں سے ایک بہت بڑی عمر کے شادی شدہ تین بچوں کے باپ کی دلہن بن گئیں۔ نشاط بابا کی بہترین رشتوں کی آس میں ڈولتی کشتی ڈگمگا گئی اور چاچی سکینہ کی سسکیوں میں اضافہ ہوگیا۔ وہ جو بیٹوں کے بیرون ملک شادیوں کی وجہ سے دیمک زدہ کواڑ بنی کھڑی تھیں ڈھے گئیں اور ایک روز رات ہی رات میں راہی ملک عدم ہوگئیں۔

دادی ماں کی موت کے بعد سکینہ بی بی کی موت نے نشاط بابا کی کمر خمیدہ کردی۔ وہ گھر جو محبت بھری خوشبوؤں سے مہکتا رہتا تھا۔ سنسناہٹوں کی ردا اوڑھ کر ٹھٹھرتی ہوئی رات کی طرح سر شام ہی سو گیا اور شاید سکینہ چاچی کی موت نے انہیں ایک اور حادثے کا سامنا کرنے سے بچالیا۔ معاذ اپنی بہت سے اعلیٰ کارکردگی کے اسناد کا بوجھ شاید اٹھا ہی نہ سکا اور وہ

چار انٹرویوز میں ناکامیوں کے بعد نشے کی بُری لت میں گرفتار ہوگیا۔ اتنی مضبوط شخصیت کے معاذ کو کس چیز نے ڈبویا سبھی انگشت بدنداں تھے۔ ناکامی کا بوجھ ایسا بھی بھاری نہیں تھا جو کشتی کو ڈبو ہی دیتا۔ یا تو کسی کی دشمنی تھی اور یا کوئی بُرا دوست۔ کچھ بھی کسی کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

یہ دو حادثات روبینہ کی ایک ادھیڑ عمر شادی شدہ اور بہت ہی کم پڑھے لکھے شخص سے شادی اور معاذ کی بھاری سی شخصیت جو نشے کی دلدل میں اُتر کر تہس نہس ہو چکی تھی، معمولی حادثے تو نہیں تھے۔ سارے محلے میں عجیب و غریب چہ میگوئیاں ہورہی تھیں۔ کوئی کہتا نشاط بابا نے کہیں اور بھی شادی کررکھی ہے اس لئے گھر سے دُور دُور رہتے ہیں اور بچوں کی بے راہ روی کی وجہ بھی ان کا اکثر غیر حاضر رہنا ہے۔ کوئی کہتا وہ تو بہت بڑے سمگلر ہیں اور حرام کی کمائی آخر رنگ لے ہی آئی۔ بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں مگر نہ ابا جانی نے نشاط بابا کی بُرائی کی اور نہ ہی ہم نے اماں جانی کے منہ سے ان کے خلاف کوئی بات سنی۔ ہاں سکینہ چاچی کی وفات کے بعد جیسے اماں جی نے اپنا اصول بنالیا تھا کہ ابا جانی کے حکم سے ہر روز شام کے وقت ان کے گھر ضرور جاتیں نگینہ اور سفینہ سے بہت پیار بھری باتیں کرتیں ایک بار جب میں ان کے ساتھ تھی تو وہ انہیں کہہ رہی تھیں۔

بیٹے! زندگی میں اونچ نیچ تو آتی ہے دن بھر میں کبھی دھوپ ہوتی ہے اور کبھی چھاؤں یہی انسان کا جیون ہے۔ جو اپنی زندگی کی ڈور رب کے حوالے کردیتے ہیں تا انہیں ضرور ایک روز بہترین نعم مِلتا ہے اور اس صبر و سکون کا صلہ ہوتا ہے۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ روبینہ اگر والدین کی رضا سے کوئی قدم اٹھاتی تو وہ نیک نامی کا پرچم جو آپ کے والد نے بلند کر رکھا ہے سرنگوں نہ ہوتا۔ بہرحال

اب آپ لوگوں نے جو بھی کرنا ہے اپنے والد کی رضا سے کرنا ہے بے صبری کا مظاہرہ بھی نہ کرنا۔

امی جان انہیں اور بھی دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتی رہیں اور وہ دونوں روبینہ اور معاذ کے غلط افعال کی وجہ سے اپنی ڈگمگاتی کشتی کو سنبھالنے کا وعدہ کر کے جیسے پرسکون ہو گئیں۔

اس گھر سے لوٹ کر میں خود بہت افسردہ تھی۔ کیا یہ سب تقدیر کا لکھا ہے یا اس کی ڈور کسی نامعلوم ہستی کے ہاتھوں گم گشتہ راہ ہو گئی ہے۔ میرا دماغ الجھتا رہا۔

معاذ کا علاج بھی ہو رہا تھا۔ حماد جیسے اس گھر کا سربراہ بن چکا تھا اور باز بھی اپنے تعلیمی مراحل کے آخری دور میں تھا کہ ایک رات کی صبح تاریکیوں کی چادر اوڑھے نمودار ہوئی کہ سفینہ رات کے اندھیروں میں سایہ بن کر اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ کہاں گئی کس کے ساتھ گئی کسی طرح بھی یہ عقدہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ بینک ڈرافٹ بھیجنے والے نشاط بابا اس المیے کے بعد بھی نہیں آئے۔

ساری رسوائیاں سمیٹ کر ایک روز حماد اپنے باقی خاندان کو لے کر کہیں چلا گیا۔ کہاں؟ نہ اس نے بتانا ضروری سمجھا اور نہ ہی ہم میں سے کسی نے کچھ پوچھا۔ لیکن اتنے سالوں کی رفاقت، دوستی، محبت آنسو بن کر سب کی آنکھوں سے نکل رہی تھی۔ اور وقت رخصت جیسے اماں جانی ان سب کو پیار کر کے روئی ہیں۔ انہیں تو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

بہرحال 1977ء میں ہمارے ہمسائے میں آباد ہونے والا یہ مسرور سا خاندان جیسے گمنامی کے جنگل سے نکل کر آیا تھا ایسے ہی دنیا کے جنگل میں کہیں گم ہو گیا۔

لیکن یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ بہت عرصہ ہم سب اُداس رہے۔ انہیں ان کی ساری اچھائیوں کے ساتھ یاد بھی کرتے رہے لیکن بہرحال انسان اپنے وقت کے تقاضوں سے سمجھوتا کر ہی لیتا ہے۔

ایک مختصر سی فیملی اس گھر میں آ کر رونق افروز ہو گئی۔

اور پھر ایک دھماکہ ہوا۔ ایک ایسی انہونی جس کا تصور کرنا بھی شاید ہمارے لئے گناہ سے کم نہ تھا۔

اور یہ ایک سربمہر خط تھا جو دبئی سے ابا جانی کو موصول ہوا۔ کتنی ہی دیر تو وہ اس خط کو سامنے رکھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے کہ کھولوں یا نہ کھولوں میرا دبئی میں کون ہے جس کا سربمہر خط مجھے ملے۔ لیکن پھر جب اُلٹ پلٹ کر غور کیا تو منجانب نشاط بابا لکھا تھا اور تعجب کی بات یہ تھی کہ دبئی کی کسی جیل کی مہر تھی۔

بہرحال خط کھولا گیا اور ابا جان جوں جوں اس کو پڑھ رہے تھے ان کا دلی اضطراب ان کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ ہم سب پتھر کے بُت بنے "ہمہ تن" بیٹھے تھے۔ کہ وہ خط لڑھک کر ابا جان کی گود سے نیچے گرا اور ابا جان انا للہ و انا الیہ راجعون کہتے ہوئے حیرانگی اور دُکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے جانے کہاں دیکھے جا رہے تھے۔

کیا ہوا۔ کچھ بتایئے تو سہی۔ امی جان نے بے چینی سے ان کا بازو پکڑا تو وہ خط میرے ہاتھ میں تھما کر جائے نماز بچھا چکے تھے۔

خط کی عبارت کچھ یوں تھی۔

محترم بڑے بھائی! السلام علیکم!

آپ کو بڑے بھائی کہتے ہوئے جس ندامت، شرمندگی اور احساس گناہ کی دلدل سے اپنا سر ابھار رہا ہوں، بتا نہیں سکتا۔ آپ جیسی معزز، مقدس، شریف النفس اور اعلیٰ ظرف ہستی کو میرے جیسا سیاہ کار گناہگار اور ذلیل انسان کس منہ سے بڑا بھائی کہہ رہا ہے لیکن یہ سب آپ کو لکھ کر میں اس احساس ندامت اور گناہ کے بوجھ کو شاید کچھ کم کر سکوں یا میری یہ تحریر کسی بھی انسان کے کسی بھی وقت کام آ سکے۔

آپ کے محلہ میں اور آپ کا ہمسایہ بن جانا شاید میری زندگی کا خوشگوار ترین واقعہ تھا کہ قدم قدم پر مجھے آپ کی شفقتوں، محبتوں اور بہترین نصیحتوں کا سہارا ملتا رہا۔ میرے بچے آپ کی ہمسائیگی اور آپ کی بہترین اولاد کے ساتھ مل بیٹھ کر بہترین انسان بننے لگے میں جو ایک عام سا آڑھتی تھا ہمسایہ ملک سے خشک میوے کی تجارت کرتا تھا اور یقین جانیں وہ تجارت اتنی بابرکت تھی کہ گیارہ بچوں کی اتنی بڑی فیملی میں کبھی کم نہ پڑی۔ نہ ہی کبھی سکینہ بی بی نے مجھ سے مزید کا تقاضا کیا اور نہ ہی گھریلو ضروریات کی طرف سے مجھے کوئی پریشانی ہوئی۔ ہم سب قناعت کا لبادہ اوڑھے اپنی ضروریات کو اپنی حدود کے اندر رکھتے ہوئے بہت ہی خوش باش زندگیاں گزار رہے تھے۔ بڑی بیٹیوں کی سادگی سے ہونے والی شادیاں، بڑے بیٹوں کا تعلیم کے میدان مار لینا اور پھر بیرون ملک چلے جانا سب کچھ آپ کے سامنے ہی ہو رہا تھا۔ آپ خوش تھے کہ میرے جیسا بندہ آپ کا دست راست بن کر محلے کے پیچیدہ مسائل حل کر رہا ہے۔ دراصل بڑے بھائی وہ میں نہیں تھا وہ آپ تھے۔ جو مجھے اس نیک کام میں کریڈٹ دے رہے تھے۔ لیکن اس وقت تک میرے گھر میں حلال رزق کی برکتیں تھیں میرے ایک ایک روپے کو جو رب کی راہ میں جا رہا تھا رب ہزاروں کے حساب سے گن رہا تھا اور یہی گنتی دراصل ان برکتوں اور رحمتوں کا باعث تھی ورنہ میں تو گنہگار بندہ تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ کیا یہ تقدیر کا لکھا تھا؟ مگر نہیں یقیناً یہ میرے نفس کا گھناؤنا پن تھا کہ میں راستی کے سبزہ زاروں سے نکل کر گناہوں کی سیاہ دلدل میں جا گھسا۔

میرا کاروبار ایک شراکت دار کے ساتھ تھا۔ میں ادھر سے سامان ادھر لے جاتا اور بڑی امانت و دیانت کے ساتھ وہاں سے میوہ کی پیٹیاں لے کے آتا۔ اس میں میرا آدھے کا ساجھا تھا۔ آدھا مال میں جوں کا توں یہاں کے ساجھے دار کو پہنچا دیتا تھا۔

پھر پرسکون سمندر میں لالچ کا ایک بھاری پتھر آن گرا اس بار جب میں نے پیٹیاں کھولیں تو ایک پیٹی میں سفید پاؤڈر کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بھی موجود تھیں۔ جن کی تعداد تو بہت زیادہ نہیں تھی لیکن جن کی مالیت بہت زیادہ تھی۔ میں سوچ کے سمندر میں بیٹھا ڈگمگا رہا تھا، اگر یہ مال ساجھے دار کو واپس دے دیتا تو راز کے افشا کی وجہ سے وہ میرے ساتھ کوئی بھی سلوک کرسکتا تھا۔ اور دوسری صورت میں معاشرے میں بیٹھے موت کے سوداگر مجھ اس کے عوض بہت بھاری رقوم دے سکتے تھے۔

بڑے بھائی یہ تقدیر کا لکھا نہیں تھا۔ تقدیر نے تو مجھے بڑے مقدس اور معزز سٹیٹس سے نواز رکھا تھا۔ یہ میرے اپنے نفس کی شیطانیت تھی کہ میں نے دوسرا راستہ اختیار کر کے موت کی سوداگری شروع کردی اور پھر رب ذوالجلال کا فرمان ہے کہ تم نیکی کی راہوں پر چلو گے تو میں تمہارے لئے اس کے راستے کشادہ کرتا جاؤں گا لیکن جب ڈگمگا کر قعر مذلت میں گرنا چاہو گے تو نفس تمہیں بار بار ملامت کرے گا اگر تم نے اس ملامت کو مثبت انداز میں لے کر میری طرف لوٹنے کی کوشش کی تو توبہ کا دروازہ کھلا پاؤ گے۔ لیکن میں نے اس کھلے دروازے کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں قناعت کی اس ردا کو جس نے ہمیں عزت نفس، رزق حلال اور فقر پاکیزگی دے رکھا تھا تار تار کرتے ہوئے میں نے موت کا سودا گر بننا قبول کرلیا۔ شاید تین جوان بچیوں کی شادیوں کا خیال تھا یا بیٹوں کی اعلیٰ تعلیم کا احساس لیکن پر میں وہی تو تھا جس نے ایک بار آپ سے کہا تھا، بڑے بھائی اگر مجھ جیسے سیلف میڈ آدمی کے بچے اتنے اعلیٰ مرتبت بن سکتے ہیں تو پھر یہ بھی سب کچھ کرلیں گے۔

لیکن میں نے اپنا یہ مان خود ہی توڑ دیا۔ اور آپ جیسے ذی علم انسان تو جانتے ہی ہیں کہ گناہ کرنے والا انسان بڑے اطمینان سے اپنے گرداگرد گناہوں کے دھاگے بنتا چلا جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ دھاگے اتنے مضبوط ہیں کہ انہیں کوئی توڑ یا کھول بھی نہیں سکتا۔

پہلا پتھر جو ہماری پرسکون زندگی میں گرا وہ غیر مسلم لڑکیوں سے شجاعت اور استقامت کی شادیاں تھیں اور پھر رزق حرام نے اپنا آپ دکھانا شروع کر دیا۔ سکینہ بی بی مرحومہ مجھے بار بار ایک ہی بات کہتی تھی آپ کا ہمارے درمیان ہونا ضروری ہے ہمیں اتنی دولت کی اتنی زیادہ رقوم کے ڈرافٹس کی قطعاً ضرورت نہیں لیکن مجھ جیسا نابکار ان کی سچی زبان کو سمجھ ہی نہ سکا۔ دراصل میرے ساتھی دار پر یہ راز کھل چکا تھا کہ میں مال میں خورد برد کر کے اس سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے اس سے سمجھوتے کے لئے اسے یقین دہانی بھی کروائی کہ یہ راز بہت سے پردوں میں چھپا رہے گا اور وہ مجھے اس بہتی گنگا سے ہاتھ دھو لینے دے لیکن وہ ایک بڑا پکا آدمی تھا اور جانے کب سے یہ کاروبار کہاں کہاں تک گزر رہا تھا میری دوڑ تو صرف دبئی تک تھی۔

بڑے بھائی مکافات عمل تو شروع ہو چکا تھا۔ بیٹوں کی غیر مسلم لڑکیوں سے شادیاں، بیٹی کا ایک ادھیڑ عمر شادی شدہ آدمی سے شادی کر لینا اور پھر معاذ کا موت کے پھندے میں پھنس جانا، رفاقت کا میرے ساتھ کچھ رابطہ تھا اور وہ مجھے اس راستے سے ہر صورت ہٹانا چاہتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ خطوط پکڑے گئے اور وہ معصوم بیٹا میرے گناہوں کی سزا پاتے ہوئے کورٹ مارشل کئے جانے کے بعد تفتیشی مراحل کے اذیت ناک دور میں سے گزر رہا ہے۔

بڑے بھائی! موت کا سوداگر تو میں تھا۔ میری اولاد کیوں ان اذیتوں سے گزری۔ سوچتا ہوں شجاعت اور استقامت کی شادیوں کو اگر میں معمولی حادثہ نہ سمجھتا تو شاید حالات اس اذیت ناک موڑ تک نہ آتے لیکن میں نے تو یہ معمولی بات ہی بھی اور ٹال گیا۔ ایک سوچ کی نہج پر میرے رب نے مجھے ڈالا تھا۔ مجھے راہ راست پر لانے کی پہلی کوشش میرے رب نے کی تھی۔ لیکن میں نفس کے شکنجے میں

انسانی احساسات کا پتا چلانے والی عینک کی تیاری

اگر آپ اپنے اردگرد موجود لوگوں کے احساسات اور جذبات جاننا چاہتے ہیں تو اس کے لئے پریشان ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں کیونکہ مائیکروسافٹ نے ایک ایسی عینک کی تیاری پر کام شروع کر دیا ہے جسے پہن کر آپ اپنے اطراف میں موجود لوگوں کے موڈ اور ان کے احساسات کے بارے میں پتہ لگا سکیں گے۔ امریکہ کے پیٹنٹ اینڈ ٹریڈ مارک آفس کے مطابق مائیکروسافٹ اس وقت ایک ایسے چشمے کی تیاری میں مصروف ہے جس کو پہن کر آپ اپنے اردگرد موجود لوگوں کے احساسات کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ جدید ترین ٹیکنالوجی کا شاہکار یہ نظام ایک عینک، سر پر پہنے جانے والے ایک شفاف ڈسپلے اور ایک سینسر پر مشتمل ہوگا جو اپنی مقررہ حد میں آنے والے انسانوں کے صوتی اور بصری تاثرات بھانپ لیتا ہے۔ یہ نظام اپنے مائیک، کیمرے اور دیگر حساس سینسرز کو استعمال کرتے ہوئے انسانی چہرے کے تاثرات، حرکات، انداز گفتگو اور ماحول میں ہونے والی تبدیلیاں مثلاً درجہ حرارت اور آواز کی کوالٹی کو بھی سمجھ سکے گا۔

پھنستا چلا گیا۔ دولت ہی میرا ایمان بن گئی۔ میں کروڑ پتی ہوں بڑے بھائی کروڑ پتی بلکہ اس سے زیادہ کچھ۔ مگر دولت نے مجھے کیا دیا.... رسوائیاں' جگ ہنسائی' اولاد کا گہرا زخم جو میں لے کر موت کی گہری وادی میں اترنے والا ہوں قبر کی تاریکی اور عالم برزخ میرا منتظر ہے۔ جہاں میں روز کئی بار مروں گا کہ جانے میری اس سوداگری نے کتنے گھروں کے چراغ بجھا دیے ہیں۔ میں اپنے بیٹے کا بھی قاتل ہوں میرے ہاتھ کس کس کے خون سے رنگے ہوئے ہیں میں رب کو اس کا حساب نہیں دے سکوں گا۔ مجھے اپنے جرم کی سزا مل رہی ہے جو یہاں ایک بار اور وہاں بار بار ملے گی۔ آپ سے میری صرف یہ التجا ہے کہ میرے بچوں کے حق میں دعا ضرور کیجئے گا وہ تو ناکردہ گناہوں کی سزا پا رہے ہیں میں تو اس اذیت کو ساتھ لے کر تختہ دار پر لٹکنے والا ہوں نہ ختم ہونے والی ایک سزا پانے کے لئے۔

آپ سے ایک درخواست ہے بڑے بھائی! میرا یہ خط پڑھ کر پھاڑ نہ دیجئے گا۔ اس کو سارے ملک کے درودیوار پر لگا دیں۔ سارے اخباروں میں چھپوا دیں کہ شاید کوئی دوسرا موت کا سوداگر عبرت پکڑ لے۔ کسی کا بھی بھلا ہو جائے۔ شاید کوئی بھی یہ جان سکے کہ میں جو اتنا عزت دار' اتنا قناعت پسند تھا جب دولت ایمان بیچ کر دولت دنیا حاصل کرنے کے لئے میدان میں اترا تو مجھ سے کیا کیا چھن گیا۔ میں تباہی و بربادی کے کس گہرے دلدل میں اترتا چلا گیا۔

میں نے بڑی منتوں کے بعد یہ کاغذ اور قلم حاصل کیا تھا۔ میری اس تحریر کو کئی بار پڑھا جائے گا اور پھر آپ کی طرف ارسال کیا جائے گا مجھ جیسے گنہگار کے لئے آپ دعا کریں گے نا؟ مگر کون سی دعا۔

دو روز بعد جمعہ ہے دبئی کی سب سے بڑی مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مجھے کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے گا۔ سر قلم کرتے وقت مجرم کے چہرے کو سیاہ ٹوپی سے ڈھانپ دیا جاتا ہے لیکن میں نے ان سے التجا کی ہے کہ مجھے ننگے منہ سب کے سامنے لے جایا جائے تاکہ ہر جاننے والا نشاط بابا پر تھوک سکے اسے گالی دے سکے اس پر پتھر مار سکے۔

یہ تو دنیا کی عدالت ہے بڑے بھائی' اور میں جو اب اپنے ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا ہوں جو مجھے بار بار ڈنگ مار رہا ہے اور جسے میں نے خود دولت کے انبار کی چادر میں لپیٹ کر سلا دیا تھا وہ ایک مسلسل عذاب ہے۔

دروازے پر کھڑا جیلر مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اجازت چاہتا ہوں ایک بہت بڑا گنہگار نشاط بابا۔

....

یہ خط چند سطور کی تحریر نہیں تھی ایک دھماکہ تھا جس نے ہم سب کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ ہمارے کچھ بھی نہ تھے مگر ہم سب ان کے لئے رو رہے تھے بلکہ امی جان نے ان کے ایصال ثواب کے لئے ختم قرآن بھی کروایا۔ ابا جان نے اہل محلہ کو ان کے اس گھناؤنے فعل کے متعلق کبھی کچھ نہ بتایا اور آج میں ان کی خواہش اور نشاط بابا کی وصیت کے مطابق یہ سب لکھ رہی ہوں کہ شاید موت کے سوداگر اس کو پڑھ کر اس اندوہناک کاروبار سے خود کو روک سکیں۔

اور قرآن جو حکمتوں کا مجموعہ ہے نشاط بابا کے اس اقرار کو پوری حکمتوں کے ساتھ بیان کرتا ہے سورۃ النسا کی آیت نمبر 79 پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ ترجمہ: جو پہنچتی ہے تم کو کسی قسم کی بھلائی سو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو پہنچتی ہے کسی قسم کی برائی سو تمہارے نفس کی طرف سے ہے اور اس نفس امارہ کو نکیل ڈالنا ہی اصل جہاد ہے۔

سمندر..... اللہ تعالیٰ کی نعمت

شفیق احمد مشرقی

ماہرین ارضیات کو وثوق ہے کہ سمندر مستقبل میں انسان کی رہائش گاہ بھی ہوگا۔ سمندر میں کارخانے، زرعی علاقے و دیگر انسانی سرگرمیوں کے مراکز بھی ہونگے۔ فرق صرف یہ ہوگا سمندر میں کھلی فضا کے بجائے مضبوط تر پلاسٹک یا کسی بلٹ پروف مادے کے بنے ہوئے بڑے بڑے کمرے ہونگے جن کے اندر یہ تمام اہتمام ہوگا۔

ی ''SEA'' چھوٹے سمندر کو کہا جاتا ہے۔ جیسے ہمارا بحیرہ عرب ہے اور اوشین بڑے سمندروں کو کہا جاتا ہے جس طرح بحراوقیانوس و بحر ہند ہیں خلاء سے کرہ ارض کو دیکھا جائے تو یہ آبی سیارہ محسوس ہوتی ہے۔ تقریباً چوتھائی حصہ پانی لہٰذا اس سیارے کو زمین نہیں بلکہ سمندر ہی کہنا چاہیے۔ بڑے سمندروں یعنی اوشین نے کرہ ارض کا تقریباً 364 ملین 36 کروڑ 40 لاکھ مربع میل کا رقبہ گھیر رکھا ہے۔ جبکہ ان کی اوسط گہرائی 38000 میٹرز تک ہے۔ ایک یہ دلچسپ بات انہیں جھیلوں' دریاؤں سے ممتاز کرتی ہے کہ سارے سمندر کھارے ہوتے ہیں کیونکہ ان میں نمک کی خاصی مقدار ہوتی ہے۔ یہ وہی نمک ہے جس کو ہم اپنی خوراک میں استعمال کرتے ہیں اس کا کیمیائی نام سوڈیم کلورائیڈ ہے۔

ان حقائق سے یہ محسوس نہیں کرنا چاہئے کہ سمندروں میں فقط پانی اور نمک ہی پایا جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ کرہ ارض کا دریائے وولگا ہی ہر سال 600 ٹن سونا بحیرہ کیسپئن میں لاکر ڈال دیتا ہے۔ یاد رہے کہ کیسپئن عموماً چھوٹے سمندر کو کہا جاتا ہے۔

سمندری دنیا کے حقائق کا تجزیہ کرتے ہوئے آپ کسی ساحل سمندر پر کھڑے ہوکر بہت دور تک جہاں سمندر و آسمان گلے ملتے نظر آرہے ہوں دیکھیں۔ وہاں تک دیکھنے پر آپ کو سوائے سمندر کے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ مگر آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ سمندر محض پانی کا ذخیرہ نہیں ہے بلکہ اپنے اندر ایک عظیم کائنات سموئے ہوئے ہے۔ جس میں وسیع براعظم' وادیاں' کوہستانی چٹانیں' مونگے کے چٹانی سلسلے' لاتعداد آبی مخلوقات جن میں مچھلیوں کے علاوہ ایسی نباتات شامل ہیں جو صرف سمندر میں ہی پائی جاتی ہیں ان کے رنگ و شکلیں قطعی منفرد و قدرت خداوندی کا شاہکار ہوتے ہیں جس میں اہم بات یہ ہے کہ سمندر کی گہرائیوں میں آتش فشاں پہاڑ و معدنی ذخائر بھی ہیں چونکہ سمندر کرہ ارض کا تین چوتھائی حصہ ہیں لہٰذا ماہرین ارضیات کو وثوق ہے کہ سمندر مستقبل میں انسان کی رہائش گاہ بھی ہوگا جس کے ساتھ سمندر میں کارخانے' زرعی علاقے و دیگر انسانی سرگرمیوں کے مراکز بھی ہونگے۔ فرق صرف یہ ہوگا سمندر میں کھلی فضا کے بجائے مضبوط تر پلاسٹک یا کسی بلٹ پروف کی طرح کے مادے کے بنے ہوئے بڑے بڑے کمرے ہونگے جن کے اندر یہ تمام اہتمام ہوگا۔ ماہرین ارضی نے انکشاف کیا ہے کہ دنیا کا آٹھواں گمشدہ براعظم بھی سمندر کی تہہ میں پایا جاتا ہے جو یورپ و براعظم شمالی اور جنوبی امریکہ کے درمیان کہیں گم ہوا تھا۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ اب بھی اس براعظم کی عظیم الشان عمارتوں کے آثار کم گہرے پانیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ گمشدہ براعظم جس کو اٹلانٹس کا نام دیا جاتا ہے اپنے دور کی عظیم الشان تہذیب کا مرکز تھا۔ ہزاروں سال قبل اپنی سرعت انگیز ترقی کے دوران پراسرار طور پر غرق ہوا اور اپنے پیچھے لاتعداد سوالات چھوڑ گیا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ایک روز اس راز سے پردہ ضرور ہٹے گا کہ ایک عظیم تہذیب کا مرکز اٹلانٹس کیونکر غرق ہوا؟

آپ اپنے خطہ خاک یعنی اس براعظم کو جس پر آپ رہائش پذیر ہیں انتہائی پرسکون پاتے ہیں لیکن آپ کو علم نہیں کہ ہمارے براعظم کسی ٹھوس جگہ پر قائم نہیں ہیں اس قدر تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہمارے کرہ ارض کے پیٹ میں کھولتا ہوا لاوا بھرا ہوا ہے لہٰذا ہمارے خشکی کے خطے درحقیقت عظیم جزائر کی سی حیثیت رکھتے ہیں جو اس کھولتے لاوے کے اوپر تیر رہے ہیں۔ خشکی کے ان عظیم خطوں کی موٹائی 96 کلومیٹر تک ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ براعظم قریباً سات انچ سالانہ کی رفتار سے ایک دوسرے سے دور کھسک رہے ہیں۔ آپ کو پیاس لگے تو آپ پانی پیتے ہیں لیکن یہ پانی آتا کہاں سے ہے؟ دریا' جھیل' تالاب وغیرہ...... بلکہ آپ اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھئے کہ جس نے بنجر زمین کے نیچے کھولتے ہوئے لاوے کیساتھ پانی کے سمندر بھی پھیلا رکھے ہیں! سوال یہ ہے کہ زیرزمین پانی کے لامتناہی ذخیروں کیساتھ سطح زمین پر صحراؤں' نخلستانوں و شہروں کیلئے دریا اور جھیلیں نہ ہوتیں تو حضرت انسان سمیت جملہ مخلوق کہاں جاتی اور کیا کرتی؟ انسان سمندر کا کھارا پانی کب تک اور کتنا پی سکتے؟ آخر یہ کس قدر روح افزا حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔

میٹھا پانی انسان کیلئے کتنی قابل ستائش نعمت

"فرشتہ"

ایک 75 سال کی عورت نے اشتہار برائے رشتہ دیا۔ تین دن بعد اس کے گھر پر ایک خط آیا۔ لکھا تھا:

"آپ اشتہار میں "ف" لکھنا بھول گئیں۔ ...آپ کو رشتہ کی نہیں فرشتہ کی ضرورت ہے"

ہے۔ دنیا بھر میں جتنے دریا ہیں ان کے مدمقابل دریائے ایمزون دنیا کا طویل ترین دریا ہے جس میں سب سے زیادہ چھوٹے دریا آ کر گرتے ہیں۔ اندریں حالات دنیا بھر کے دریاؤں میں میٹھے پانی کی جتنی مقدار ہے اس کا پانچواں حصہ دریائے ایمزون میں دستیاب ہے۔ دریاؤں کے بعد ہماری زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس کا تعلق سمندر سے نہ ہو خوراک، رہائش، کاروبار، زراعت، صحت، تفریح و بجلی کی پیداوار فضا کی صفائی و تازہ پانی کے حصول تک کوئی شعبہ نہیں جہاں ہم سمندر سے بے نیاز ہوسکیں۔ اس میں اہم واقعہ یہ ہے جوہری و اپنی گندگی کو ٹھکانے لگانے کیلئے بھی فی الحال سمندر سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔ تاہم سمندری نعمتیں تیل، معدنیات، مچھلی، حیوانات کے بحری نباتات تک کو انسانی خوراک کیلئے کئی ملین ٹن تک استعمال کیا جاتا ہے! ماہرین کا کہنا ہے کہ مستقبل میں دنیا بھر کے انسانوں کی خوراک کے حصول کیلئے سمندری مخلوق و بحری نباتات پر انحصار کیا جائیگا۔ اس میں اہم بات یہ ہے کہ انسانوں کے لیے یہ سمندری خوراک ایسی ہوگی جس کیلئے ماضی میں کسی نے کسی قسم کی محنت نہیں کی ہوگی۔ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی نعمت کیا ہوسکتی ہے؟

سمندری نعمتوں کا شمار کرتے ہوئے وہیل مچھلی کے جگر سے نکالے جانیوالے تیل کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے کیونکہ یہ تیل سینے کے امراض کیلئے قدرت کا بڑا عطیہ ہے۔ اس تیل کی خاطر اس نایاب مچھلی کا اس قدر شکار کیا گیا کہ اس کی نسل ہی ختم ہونے کا خطرہ پیدا ہونے لگا ہے۔

دیگر سمندری نعمتوں میں سچے موتی، سیپ، گھونگھے، جھینگے نمایاں ہیں۔ جھینگے کا سوپ تو کئی ممالک کیساتھ پاکستان میں بھی دستیاب ہے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے سمندر اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ شفاخانہ بھی ہے کیونکہ سچے موتی، سیپ و سمندری جھینگے کئی ادویات میں استعمال ہوتے ہیں۔ سمندر ماحولیاتی آلودگی سے نجات کا وسیلہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سمندروں سے بادل اٹھا کر مینہ برساتا ہے تو فضا کی آلودگی صاف ہوجاتی ہے۔ سمندر سے سورج و نباتات سبھی ملکر ہمارے لئے صاف ہوا و ماحول کا اہتمام کرتے ہیں مگر سمندروں کو ہم آلائشوں کا گودام بنا رہے ہیں ہماری اس بے توجہی کا نتیجہ ہمارے لئے المناک ہوگا۔ لہٰذا متعلقہ اداروں و شہریوں کو اس معاملے میں فوری احتیاط برتنا چاہئے کیونکہ سمندر ہماری مستقبل کی رہائش گاہ بھی ہیں۔ آپ کو یاد رہے کہ مستقبل میں جب موجودہ ذرائع آب ناکافی ہونگے تو سمندر ہمارے لئے میٹھے پانی کا وسیلہ ہوگا! شمسی توانائی سے سمندری پانی سے میٹھے پانی کے حصول کے نئے منصوبے بن رہے ہیں۔ یہ میٹھا پانی ظاہر ہے کہ ہمارے لئے بڑی نعمت ہوگا۔ سمندر جس قدر بڑا خزانہ ہے اس کے استعمال کیلئے بھی ہمیں فہم و فراست کو بروئے کار لانا چاہئے۔

حسن کا عذاب
نواز خان

چھوٹے چھوٹے صحنوں والے گھروں کی کانوں اور سرکنڈوں کی بنی ہوئی چھپر جیسی چھتیں جل کر گر چکی تھیں۔ باہر اور اندر کی دیواریں دھوئیں کی کالک سے کالی ہو گئی تھیں۔ گندم کی فصل کٹنے کے بعد کھیتوں میں اکا دکا نظر آنے والے توڑی کے گٹھوں کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے۔ جس طرح گھوڑوں نے انہیں کھدیڑ دیا ہو۔ لکڑی کے ٹوٹے دروازے چوکاٹھوں سے جھول رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے اس گاؤں پر جنوں نے حملہ کر دیا اور جاہی مچا کر رکھ دی ہو۔ فیض موچی کا گھر بھی اسی طرح برباد نظر آتا تھا۔ نمبردار اس گھر کے صحن میں کھڑا ہو کر مجھے بتا رہا تھا کہ ڈاکو اس طرف سے آئے تھے۔ میں نے اسے کہا کہ خاموش ہو جائے۔ وہ میری بات سمجھ گیا اور مجھے ایک طرف آنے کا اشارہ کیا۔ چھوٹے سے صحن کے ایک طرف پسار تھی' پرانے زمانے کے دیہات میں رہنے والے جانتے ہوں گے "پسار" کسے کہتے ہیں۔ یہ گھر کی نکڑ میں چھوٹا سا کچا کمرہ ہوتا ہے جس میں چارپائی وغیرہ بچھا دی جاتی ہے اور فالتو سامان رکھ دیا جاتا ہے۔ "پسار" کے اندر فیض موچی کی لاش پڑی تھی۔ لاش چارپائی سے نیچے گری ہوئی تھی چہرے کا ایک حصہ گوشت کا لوتھڑا بن چکا تھا۔ شاید ڈاکوؤں نے اسے گولی مارنے کے بجائے بندوق کے بٹ مارے تھے۔ لاش اس انداز میں پڑی تھی جس طرح کسی کھڑے ہوئے آدمی کو سامنے سے دھکا دیکر پیچھے کی طرف گرا دیا جائے۔ فیض موچی ابھی جوان ہی تھا۔ بڑی دردناک موت مرا۔ میں نے اس کی لاش سیدھی کی کہیں گولی کا نشان نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ وہ لاش اُٹھوا لے۔ میں نے اسے پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجنا تھا۔ نمبردار مجھے گاؤں کے دورے پر لے گیا اس گاؤں کے صرف فیض موچی والے گھر کے حصے پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا باقی گھر محفوظ تھے البتہ خوف کی فضا تھی۔ گلیوں میں مکانوں کے دروازے بند تھے کبھی کسی دروازے کی اوٹ سے کوئی عورت جھانکتی اور پھر دروازہ بند کر لیتی، بہت کم مرد باہر پھرتے نظر آئے۔ گاؤں کے سرسری دورے کے بعد ہم نمبردار کے گھر کی بیٹھک میں چلے گئے۔ میں نے اس سے حملے کی بابت پوچھنا شروع کر دیا نمبردار عمر رسیدہ آدمی تھا۔ بہت سے لوگ تو اس گاؤں میں اس کے سامنے پیدا ہوئے اور جوان ہوئے تھے، وہ مجھے بتا رہا تھا:

"ثریا اس علاقے کی بڑی طرح دار لڑکی رہی ہے وہی فیض موچی کی بیوی ہے۔ ابھی ایک ہی اس کا بچہ ہے خیر جس زمانے کی بات کر رہا ہوں ثریا جوانی چڑھ رہی تھی اور گاؤں کے گھبرو اس کے پیچھے کتوں کی طرح بھوترے پھرتے تھے۔ انہیں میں سے ایک جھما نائی بھی تھا جسے لوگ جھما کانا کہتے تھے۔ کانا نہیں تھا صرف ایک آنکھ ذرا سی چھوٹی تھی ثریا کے عشق میں ایسا غرق ہوا کہ نائی والا کام چھوڑا اور ہر وقت ثریا کے پیچھے رہنے لگا۔ ثریا اسے بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔

فیض اس کی برادری کا تھا اور ثریا کے ماں باپ اسے فیض سے ہی بیاہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جھما نائی مایوس ہو کر باغی ہونے لگا اور اس نے بدمعاشی میں پیر رکھنا شروع کر دیا۔ اس نے ثریا کو کئی بار اٹھا لے جانے کی دھمکیاں بھی دیں اور فیض کو کئی بار مارا پیٹا بھی تھا۔ ثریا کے گھر والوں نے خیریت اس میں سمجھی کہ ثریا کا ڈولا گھر سے اٹھا دیں انہوں نے فیض سے دو بول پڑھائے اور انہیں گاؤں کا وہ مکان لے دیا جو آپ دیکھ چکے ہیں اور جس کی پسار میں فیض کی لاش پڑی ہے۔ فیض موچی کے ثریا کے ساتھ بیاہ کے دو سال بعد ثریا نے لڑکے کو جنم دیا۔ شادی کے

توڑ دوں گا۔"

"وہ......وہ جناب چھیے نائی کے دماغ میں پتہ نہیں یہ کیسے آ گیا تھا کہ ثریا کو پیراں اس کے پاس نہیں آنے دیتا اور دیکھیں جی میں اب کیا بتا سکتا ہوں؟"

میں چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سلیم خان کے پاس پہنچ گیا مجھے قریب پا کر وہ چارپائی پر ٹانگ سیدھی کر کے بیٹھ گیا ایک دم میرا ہاتھ گھوما اور سلیم کو لگنے والے تھپڑ کی تڑاخ کی آواز سے نمبردار کا جسم بھی ہلا۔ وہ تیزی سے ہماری طرف آنے لگا میں نے اسے اشارہ کر کے وہیں روک دیا۔ دوسرے تھپڑ سے قبل ہی سلیم خان کی ہکا بکا آنکھوں میں میں نے دیکھ لیا کہ وہ اب مزاحمت نہیں کرے گا۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ کوئی تھانیدار پیراں کے کسی خاص کارندے کو یوں اپنے پاس بلا کر تھپڑ مار سکتا ہے۔

میں پھر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا اور سلیم خان سے کہا کہ شروع ہو جاؤ اس نے جو کچھ سنایا اس سے میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ میں نے سلیم سے کہا کہ وہ حویلی چلا جائے وہ اس علاقے سے باہر نہ جائے مجھے اس کی دوبارہ ضرورت پڑ سکتی ہے۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر کے اور نمبردار کو کچھ ہدایات دے کر میں بلال شاہ اور اے ایس آئی واپس تھانے کی طرف چلے۔ راستے میں ہم لوگ زیادہ خاموش ہی رہے تھانے پہنچ کر بلال شاہ میرے پاس آ بیٹھا۔ اس پر ایک خاص قسم کی مایوسی اور خاموشی طاری تھی۔ اسے ابھی تک جوہر کھولنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے اس کا موڈ دیکھ لیا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ بہت سنجیدہ ہوتا تھا۔

"کیوں بلال تمہارا کیا خیال ہے۔"

مجھے تو معاملہ بڑا الجھا لگ رہا ہے جی، چھیے کو غرض تھی تو ثریا سے۔

مان لیا کہ وہ قتل بھی کر سکتا ہے اب ڈاکو بھی بن چکا ہے پر جیسا کہ زمیندار نے پچھلے سال کے واقعہ کا ذکر کیا ہے چھیے نے موچی کو اس وقت بھی قتل نہ کیا جب موچی اور ثریا دونوں اس کے گلے پڑ رہے تھے اُلٹا چھیے نے پیراں کی حویلی پر گولیاں چلا دیں اور پھر سلیم خان چوکیدار کا بیان بھی ہے کہ ثریا پر پیراں کا بڑا سایہ ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس میں کوئی تیسری پارٹی بھی ہے بات صرف ثریا اور چھیے کی نہیں ہے۔

بلال نے بالکل صحیح سوچا تھا۔ میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا کہ اس میں تیسرا فریق بھی ملوث ہے۔ اور وہ ہے پیراں دتہ۔ وہ کس طرح اور کہاں تک اس سارے جھگڑے میں شامل تھا اس کا مجھے جلد ہی پتہ چل جانا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو موچی کی لاش کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لانے بھیجا ہوا تھا اور وہ کسی بھی وقت آنے ہی والا تھا۔ میرے اور بلال کے باتیں کرتے کرتے وہ آ گیا۔ فیض کی یہ رپورٹ بہت ہی چونکا دینے والی تھی اسے پڑھ کر مجھے لاش خیالوں میں نظر آنے لگی۔ میں نے آپ کو پہلے نہیں بتایا جب میں نمبردار کے ساتھ لاش کے پاس پہنچا تھا تو اس وقت مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ سیدھے سیدھے قتل اس طرح نہیں ہوتے بلکہ لاش خود بولتی ہے جسم کٹے پھٹے ہوتے ہیں یا گولیوں کے چھید صاف نظر آتے ہیں فیض کی لاش پر تو کوئی نشان ہی نہ تھا صرف ہونٹوں کی ہلکی سی سوزش اور نیلاہٹ اور ماتھے پر معمولی سا گومڑ جسے کوئی تفتیشی پولیس افسر ہی دیکھ سکتا تھا۔ عام آدمی اس کا دھیان ہی نہ کرتا۔ رپورٹ میں لکھا تھا کہ مرنے والے کے معدے میں زہر کے اجزاء تھے۔ اور ماتھے پر کسی کند چیز سے ضرب لگی ہے بہرصورت

کتیں ماری گئی یا تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ تھانیداروں والا رویہ رکھوں۔ میں تو تم سے اس لئے ہمدردی کر رہا ہوں کہ تمہارا گھر والا مارا گیا ہے اب سیدھی طرح بتا دو کہ ڈاکے کی رات کیا ہوا تھا۔ ورنہ میرا ہاتھ اُٹھ گیا تو تم نے دوسرا تھپڑ بھی نہیں کھانا۔"

وہ ایک دم کی پکر وڑ عورت بن گئی۔ "منشی لیس جی ڈاکہ تو میرے گھر جسے نے مارا تھا۔ میری فیض کے ساتھ شادی سے پہلے ہی کتوں کی طرح میرے پیچھے پھرتا تھا۔ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں کہ اس کا ساتھ دیتی میرا خاوند شریف آدمی تھا وہ تو اپنی جان سے گیا ہے۔ پر اسے اس دنیا سے پار کرنے والوں کو پار کرنا کسی اور کا کام ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ اس رات ہوا کیا۔ یہ بھی بتا دیتی ہوں رات ہم میاں بیوی اپنے گھر کے صحن میں تھے باہر سے گھوڑوں کا شور اُٹھا۔ میرا گھر والا چند مہینے سے بیمار تھا اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے اب اس نے کئی بار مجھے کہا کہ وہ بچے گا نہیں۔ میں اُٹھ کر شوہر کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی بچہ میرے پاس تھا اس وقت دیوار سے کئی آدمی نے چھلانگ اندر ماری اور سیدھا فیض کی طرف آیا میں یہی سمجھی کہ حملہ کرنے والے ڈاکوؤں میں سے کوئی ہوگا یا ہوسکتا ہے خود جسا ہی ہو لیکن وہ جسا نہیں تھا وہ تو کوئی اور دی تھا اس نے فیض کی گردن پکڑ لی میں نے بچے و چارپائی پر چھوڑا اور اس آدمی کے بال پکڑ کر پیچھے کھینچا پر وہ تو فیض سے چمٹ ہی گیا تھا اس وقت وڈیں کے گھوڑے میرے گھر کے اندر آ ...

"کون ہے وہ؟"

"یہ بات رہنے دیں میں نے آپ کو پہلے ہی بتایا ہے کہ میں نے حساب چکانے ہیں۔"

جس طرح یہ عورت بات کر رہی تھی اس طرح تو میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے سختی کرنے کا ارادہ کر لیا اگرچہ عورت پر ہاتھ اُٹھانا مردوں کا کام نہیں ہوتا۔ پر وہ اپنے خاوند کے قتل کے کیس میں میری تفتیش کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہی تھی حالانکہ خود اسے پورا تعاون کرنا چاہئے تھا۔ دوسرے یہ بات میری برداشت سے باہر ہوتی ہے کہ انسپکٹر نواز خان کو کوئی بے وقوف بنائے۔ میں نے برداشت کی کوشش کی تھی لیکن یہ عورت مجھے شاید بے وقوف سمجھتی تھی۔ میرے ایک ہی تھپڑ نے اس کے ہوش و حواس ٹھکانے لگا دیئے۔

"میرا خیال میں خود پہلے تمہارا دماغ درست کردوں تاکہ تم کسی ... سے حساب کرسکو۔" میں نے دوسرے تھپڑ کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اس کا بچہ رونے لگا۔ میرا دل میری مٹھی میں آ گیا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اب وہ خود بھی رونے لگی کافی دیر رونے کے بعد بولی "تھانیدار صاحب! میرا یہ بچہ ویراں کی حویلی میں پہنچا دیں میں کسی ادھر آ گئی تو سے لوں گی۔"

"تم خود اس بچے کو ویراں کے پاس کیوں نہیں لے جاتی؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر کہنے لگی، "اچھا ؟ ...

ہم ایک بار پھر چوپال میں تھے۔ نمبردار کو بلایا اور پیراں کے گھر کی ڈیوڑھی میں جا پہنچے۔

پیراں کے چھ سات کامے باہر بیٹھے تھے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور ایک بھاگ کر چارپائی لے آیا۔ دوسرا اندر حویلی کی طرف بھاگا۔ میں نے چارپائی لانے والے سے کہا کہ رہنے دو پیراں کو بتاؤ کہ میں آیا ہوں۔ اندر جانے والا نوکر بھاگتا ہوا باہر آیا اور کہنے لگا پیراں صاحب نے کہا ہے کہ اندر آجائیں اس زمیندار کی بیٹھک بھی جاگیرداروں جیسی تھی۔ دیواروں پر بارہ سنگھوں کے سر لٹکے ہوئے تھے۔ اس علاقے میں تو یہ شکار ملتا نہیں تھا پتہ نہیں وہ کن جنگلوں میں شکار کھیلتا ہوگا یا اس نے خرید کر لٹکائے ہوئے تھے۔ ایک طرف دیوار سے بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ نوکر نے کمرے تک ہمیں پہنچایا۔ یہاں ایک قد آور سرخ و سفید چہرے پر بڑی بڑی کالی مونچھوں والا نوجوان بیٹھا تھا۔ بڑا بارعب آدمی تھا۔ اس نے دو قدم آگے بڑھ کر میرے اور بلال کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

"پیراں کی خوش بختی ہے کہ خان صاحب میرے گھر آئے ہیں۔" اس کی بڑی بھاری آواز تھی۔ اس نے ہمیں ایک طرف دیوان پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود موڑھے نما کرسی پر بیٹھ گیا۔ پاس کھڑے کامے سے کہا کہ جاؤ جا کر لسی پانی کا انتظام کرو پھر وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ "خان صاحب کیسے تکلیف کی آپ نے۔"

"پیراں تمہارے گاؤں میں ڈاکہ پڑا ہے جس میں ایک غریب موچی مارا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ صرف ڈاکہ نہیں تھا۔ اس میں تم پر بھی وار ہوا ہے۔ ثریا ہے تو غریب اور اس کا خاوند موچی تھا پر وہ ایسی شکل والی ہے کہ تمہارے گاؤں والے تو جوان مشکل سے ہی خود کو سنبھال سکتے ہیں۔ فیقی نے

پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے پاس آگئی ہے وہ جیسے کانے یا اس کے کسی آدمی کے ہاتھ سے نہیں مرا، کیا کہتے ہو؟"

پیراں کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ میرے لئے یہی کافی تھا۔ اب وہ میری مٹھی سے باہر نہیں نکل سکتا تھا وہ کچھ دیر مجھ سے نظریں چراتا رہا پھر اپنی بھاری آواز میں بولا۔

"کیا ضروری ہے کہ میں تمہاری اس تفتیش کا جواب دوں؟ اور پھر خان صاحب آپ کس چکر میں میرے ہی گھر میں بیٹھ کر مجھ پر شک کر رہے ہو؟"

"پیراں میں نے کب کہا کہ میں تم پر شک کر رہا ہوں؟ یہ شک تم کہاں سے درمیان میں لے آئے ہو میں نے تو تم سے سیدھا سادا سوال پوچھا ہے۔ ڈاکو فیقی موچی کے گھر آئے اور پھر پلٹ کر تم پر جا پڑے تم اتنے چو۔۔۔ پتہ تو نہیں ہو کہ تمہیں وجہ کا پتہ نہ ہو۔"

پیراں کی مونچھیں کانپنے لگیں۔ "تمہیں اس میں کیا نظر آتا ہے؟"

"مجھے اس میں یہ نظر آتا ہے کہ ثریا میرے تھانے میں ہے اور کہہ رہی ہے کہ اس کا بچہ تمہارے حوالے کر دیا جائے وہ کہیں جا رہی ہے آ کر لے گی۔" میں نے اسے یہ نہیں کہا کہ وہ اس سے حساب چکانے کی بات بھی کر رہی تھی۔

پیراں نے آواز بلند کر کے گالی دی "حرامزادی" پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا میری حویلی کے اندر بیشمار لوگ پلتے ہیں وہ اپنا بچہ یہاں روٹی پانی کے لئے رکھنا چاہتی ہے تو بھیج دے پر تم یہ بات مجھے بتانے کے لئے یہاں آئے ہو؟ تمہیں اس عورت اور بچے کا کیا درد آ گیا ہے؟"

وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ میرا بھرپور مکا اس کی گردن پر پڑا۔ اس کی آنکھیں ذرا جھپک سی گئیں۔

وہ دھڑام سے موڑھے پہ گرنے کے انداز میں بیٹھ
گیا۔ اس کا کا لسی کا جگ لے کر اندر آ چکا تھا۔ جگ
اس کے ہاتھ سے نیچے جا گرا۔ اس نے یہ نظارہ پوری
زندگی میں نہیں دیکھا ہوگا شاید اسے یہ بھی یقین نہ ہو
کہ کوئی آدمی پیراں کو مکا مار سکتا ہے۔ پتہ نہیں اسے
کیا ہوا کہ وہ دیوار پر ٹنگی ہوئی بندوق کی طرف
بڑھا۔ اس کا ارادہ دیکھتے ہی بلال شاہ اس کے سر پر تھا
اور پھر ایسے نظر آتا تھا کہ کوئی آدمی فرش پر چھریاں
کھاتا ہوا چیخیں مار رہا ہو۔ پیراں اٹھ کھڑا ہوا تو واز
خان تم اس حویلی سے زندہ باہر جانا چاہتے ہو یا
نہیں؟"

بلال شاہ نے ہاتھ روک لیا اور پیراں کی طرف
دیکھنے لگا۔ پیراں نے میری توقع سے بڑھ کر پھرتی
کا مظاہرہ کیا۔ سیاہ رنگ کا چھوٹا سا پستول اس کے
ہاتھ میں نظر آنے لگا۔ بلال شاہ نے میری طرف
دیکھا۔ بیٹھک کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا
شاید باہر موجود نوکروں نے اندر کی صورت حال کا
اندازہ کر لیا تھا۔ بیٹھک اب ہمارے لیے چوہے
دان بن گئی تھی۔ لسی لانے والا وہ خبیث آدمی تھا بلال
کی مار کے باوجود نہ صرف ٹانگوں پر کھڑا تھا بلکہ اس
کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ ... زخمی تھی۔ اور
پیراں نے پستول میری طرف ... مجھے ایک منٹ کی
دیوار کی طرف کھسک رہا تھا۔ ... کرنا کیا چاہتا ہے۔ اب
دیر ہو گئی تھی یہ سمجھنے میں کہ وہ ... جیب میں ڈال
وقت تک پیراں پستول کرتے کی جیب میں ... اس کا نوکر چاقو سیدھا
دیوار سے بندوق اتار چکا تھا۔ پیراں غصے میں
کیے بلال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ... بھی سنبھال لوں گا
اگل رہا تھا۔ اس حرامزادی کا بچہ ... نے بندوق کو لا کی تھی
... لوں اس ... فوراً نیچے جھک گیا

چہرے کے پاس سے گزرا۔ اگر یہ مجھے لگ جاتا تو
میرا چہرہ شناخت کے قابل نہیں رہتا تھا۔ مجھے خود پہ
غصہ بھی آ رہا تھا۔ مجھے شروع سے ہی شک تھا کہ
پیراں کا کوئی نہ کوئی ہاتھ ہے اس واردات میں۔ مجھے
یہاں خالی ہاتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے جھک کر
پیراں کی طرف دوڑ لگائی اور بھیڑو کی طرح اس کے
پیٹ میں ٹکر مار دی۔ پیراں ڈکرا کر دوہرا ہو گیا اور
بندوق کھڑاک کی آواز کے ساتھ فرش پر جا گری۔ ٹکر
مار کر میں نے بلال شاہ کی طرف دیکھا، وہ نوکر چاقو
کھولے بلال کے قریب آ چکا تھا۔ بلال دونوں ہاتھ
کبڈی کھیلنے کے انداز میں پھیلا کر ٹانگیں چوڑی کیے
کمر سے جھکا اس نوکر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی
ٹانگ ہوا میں اچھلی اور چاقو کا وار پورا ہونے ...
پہلے ہی چاقو نوکر کے ہاتھ سے نکل کر دور جا ...
اب بلال چھلانگ مار کر اس پر سوار ہو چکا تھا ...
نوکر کی چیخیں پہلے سے بھی زیادہ خوفناک ...
مجھے حیرت تھی کہ باہر سے کوئی آدمی اندر ...
تھا۔ میں بلال کے ہتھوڑے نما مکے نوکر ...
رہا تھا اور اس کا فائدہ اٹھا کر پیراں کھ ...
چاقو اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ اب ...
سے کوئی غلطی ہوئی تو اس نے ...
رہا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ چھالی ...
قریب آنے دیا۔ پیراں غلط ...
چیز میری برداشت سے باہر تھی ...
ہتھوڑے کی طرح کا گھونسہ ...
کلائی میرے شکنجے میں تھی ...
عین اسی وقت ...
بہت سے آدمی ...
دروازے سے ... کسی نے ...
ہتھا سے ... کھول ...
ہاتھوں میں لاٹھ ...

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش
شرعی احکام
شائع ہو گیا ہے
قیمت 175 روپے
عبادات سے معاملات تک اور معاشرت سے لیکر سیاسیات تک
تبلیغی نصاب، قرآنی آیات اور صحیح احادیث کی روشنی میں
★ اسلامی ضابطہ حیات جس کی روشنی میں آپ اپنے شب و روز گزار سکتے ہیں۔
★ آخرت کا توشہ، دلوں کی بیماریوں کے لیے شفا۔
★ نیکیوں کی طرف رہنمائی اور گناہوں سے بچنے کے طریقے۔
★ ایسے سنہری حروف جنہیں پڑھ کر آپ اپنے اخلاق و کردار کی کوتاہیوں کو دور کر سکتے ہیں۔
سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور فون: 37245412

اپنی سوچوں سے باہر نکلا اور پیراں کی طرف دیکھ کر اس سے صاف سوال پوچھا۔ ”دیکھو پیراں چودھری تھے تم حویلی میں، اب تم میرے تھانے میں بیٹھے ہو تم علاقے کے بادشاہ ہو سکتے ہو لیکن جہاں تم بیٹھے ہو یہاں میرا سکہ چلتا ہے اور میں تمہیں تمہاری بیٹھک میں چھیتی لگا سکتا ہوں تو یہاں مجھے کون روک سکتا ہے۔

اگر تمہیں کوئی غلط فہمی ہے کہ تمہارے پاس دولت ہے یا کسی بڑے پولیس افسر سے یارانہ ہے تو میرا نام نواز خان ہے اور اسے ہمیشہ یاد رکھنا۔ جتنی دیر اس تھانے میں ہو اس نام کو ذہن میں رکھو مجھے ٹھیک طرح بتا دو فیض کو تم نے قتل کرایا ہے؟“ پیراں کرسی پر کبھی ایک طرف کروٹ لے کر بیٹھتا کبھی دوسری طرف۔ میں نے ثریا کو اس کے سامنے لانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی کسی سپاہی کو آواز ہی دینے والا تھا کہ بلال شاہ تیزی سے اندر آیا۔ اس کے چہرے پر جیسے زلزلہ آیا ہوا تھا۔

”خان صاحب وہ...... بلال شاہ بات کرتے کرتے رُک گیا پھر بولا۔ ”وہ صرف بچہ یہاں رہ گیا ہے“۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا، تیزی سے باہر نکلا محرر سے پوچھا کہ ثریا کدھر گئی ہے؟ وہ بہت گڑبڑایا ہوا تھا۔

”وہ جناب آپ اندر اس آدمی سے پوچھ گچھ کر رہے تھے، ثریا یہاں ہی تھی میرے پاس۔ آپ جس آدمی کو یہاں لائے ہیں اسے دیکھتے ہی اس نے بچہ یہاں فرش پر کھیلنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود غسل خانے کا راستہ پوچھ کر چل پڑی۔ کہہ رہی تھی ابھی آتی ہوں۔ میں تو غسل خانہ بھی دیکھ آیا ہوں وہاں نہیں ہے۔“ مجھے محسوس ہوگیا کہ ثریا اب میرے ہاتھ سے گئی وہ پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ بچہ پیراں کو دے دو میں پھر آ کر لے لوں گی۔ اب اس نے دیکھا کہ پیراں یہاں آ گیا ہے تو بچہ یہیں چھوڑ کر نکل گئی ہے۔ میرا پارہ چڑھ گیا میں اپنے کمرے میں واپس آیا اور پیراں سے کہا کہ وہ صاف صاف بات کرے۔ میں اس کی مار مار کر ٹانگیں توڑ دوں گا اس میں میری نوکری بھی جاتی ہے تو جائے۔ اس نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے اور آنکھوں میں آنسو لا کر کہنے لگا، پتہ نہیں کیا بات ہے یہ عورت مجھے بدنام کرتی پھرتی ہے۔ مجھے اس سے کیا لینا ہے؟ بہرحال میں علاقہ چھوڑ کر تو نہیں جا رہا۔ میرے بندے آپ کے پاس ہیں مجھے جانے دیں میں زیادہ سے زیادہ کل تک ثریا کو یہاں پیش کردوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ بڑا زمیندار ہے اور میں اس کی بات پر بھروسہ کر کے اسے جانے دیتا ہوں مگر یہ قتل کا معاملہ ہے اسے کل یہاں خود تھانے آنا پڑے گا ورنہ میں حویلی آیا تو اس کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ پیراں بڑی جلدی میں تھانے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے بلال شاہ سے کہا کہ چوکیدار کے جسم کے نیچے والے حصے کو چھوڑ کر باقی جہاں چاہے ٹھکائی کرو چوکیدار سمجھ گیا کہ اس بار اس کا حشر ٹھیک نہیں ہوگا۔ بلال کے آگے بڑھنے سے پہلے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا کہ وہ سب کچھ بتانے کو تیار ہے اس پر رحم کریں۔ میں نے بلال کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا چوکیدار شروع ہوگیا۔

”جناب میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ چار پانچ سال ہوئے میں پیراں کے پاس ملازم ہوا ہوں اس سے پہلے کے حالات نہیں جانتا۔ کوئی تین ایک سال پہلے مجھے پیراں اور ثریا کے عشق کی سن گن ملی تھی۔ ثریا کی موچی کے ساتھ شادی ہو چکی تھی اور پیراں کو اس بات پر بڑا غصہ تھا۔ ایک دن اس نے مجھے کہا کہ موچی کو اٹھا لاؤ میں اسے حویلی کے نوکروں والے کمروں میں لے آیا۔ وہاں اس کی خوب ٹھکائی کی گئی۔ اس روز پیراں بڑے غصے میں تھا۔ شراب

پی کر اس کے حواس قابو میں نہیں تھے۔ اسے مارتے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ پیچھے ہی ثریا چلی آئی۔ پیراں اسے دیکھ کر غصے میں مزید بپھر گیا۔ ثریا بھی بپھری ہوئی تھی پیراں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

"حرامزادی یار رکھتی ہے؟" اس نے ثریا کے بال کھینچے۔

"ثریا بھی پلٹ کر اس کے گلے پڑ گئی۔ وہ میرا یار نہیں گھر والا ہے اور تم کون ہو مجھے گالی دینے والے زبان سنبھال کر بات کرو۔"

پیراں کے جسم میں آگ لگ گئی۔ اس نے ثریا کو بالوں سے پکڑا اور گھسیٹ کر میری کوٹھری کی طرف لے جانے لگا۔ ثریا چیخنے لگی۔ اتنی دیر میں پیراں اسے کوٹھری کے اندر لے جاچکا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہاں اب شیطان کا کھیل شروع ہو چکا ہوگا اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ کچھ دیر بعد ثریا باہر نکلی وہ بے حال ہو رہی تھی۔ پیراں کے چہرے پر شیطان جیسی مسکراہٹ تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ "موچی کو چھوڑ دو" آگے بڑھ کر ثریا نے اپنے خاوند کا بازو پکڑا اور دونوں گرتے پڑتے حویلی سے باہر نکل گئے۔

مجھے آج بھی ثریا کی آنکھوں کی وہ نفرت والی نظر یاد ہے۔ اس نے حویلی سے نکلتے ہوئے کہا تھا "پیراں میں اس کا حساب تم سے ضرور لوں گی۔"

چوکیدار خاموش ہو گیا۔ "آگے بولو"۔ میری اپنی آواز خشک ہوگئی تھی اور میری آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔

اس قدر ظلم۔

چوکیدار پھر بول رہا تھا۔

"پیراں تو جی اندھا ہو چکا تھا۔ میں نے کئی بار سوچا ہے کہ اسے کس چیز کی کمی ہے۔ بیوی بھی خوبصورت ہے ایک بچہ ابھی دو سال کا ہے پھر بھی دوسروں کی عورتوں پر نظر رکھتا ہے۔ چلو یہاں تک ہی بات رہتی تو بھی لیکن اس نے تو......"

"بولو! چپ نہ کرو، ورنہ میں دوسری طرح تمہیں بلوالوں گا۔ کیا کیا پیراں نے؟ فیض موچی کو اسی نے مروایا ہے؟"

"ہوسکتا ہے جی جو آدمی اس کی بیوی کو نہیں چھوڑتا۔ وہ اسے مروانے میں کیوں دیر لگائے گا۔"

اس وقت رات ہوگئی تھی میں نے سپاہی کو بلا کر کہا کہ اس چوکیدار کو واپس حوالات میں رکھو اور میں دفتر سے اٹھ کر سونے چلا گیا۔ محرر سے کہہ گیا کہ بچے کا خیال کرنا اس کے دودھ کے لئے محرر کو پیسے دیئے۔

صبح پیراں تو نہ آیا لیکن اس کا ایک نوکر تھانے آیا کہ رات پیراں کا بچہ اغوا ہو گیا ہے چودھرائن کی بہت خراب حالت ہے وہ اور پیراں اس کی تلاش کے لئے بہت مصروف ہیں۔ میں پریشان ہو گیا مجھے تو فوراً خیال آیا کہ ثریا نے حساب لے لیا ہے۔ وہ تھانے سے بھاگی بھی اس لئے تھی اس نے دیکھ لیا ہوگا کہ پیراں تو تھانے میں ہے اس کے لئے راستہ کھلا ہے میں نے بچہ اس نوکر کے حوالے کیا اور اسے کہا کہ یہ حویلی میں پیراں کو دے دینا ثریا دے گئی تھی۔ اس نوکر کو بھیج کر میں نے مخبر بلوائے۔ مجھے چھبے کانے کے اڈے کی تلاش تھی ان میں سے ایک مخبر بڑا ہوشیار تھا اس کا کام ہی یہی تھا۔ کئی دوسرے مخبر صرف اس لئے پولیس کے کام کرتے تھے کہ ٹوہر بنی رہے یہ پیشہ ور آدمی تھا اور اسے پولیس کی طرف سے باقاعدہ تنخواہ وغیرہ بھی مل جاتی تھی۔ اس نے مجھ سے دو دن کی مہلت لی۔ میں نے یہ دو دن تیاری میں لگائے۔ پہلے تو پیراں کے گھر گیا اس کی بیوی کی حالت واقعی خراب تھی اس کا دو سالہ بیٹا ثریا اٹھا لے گئی تھی۔ پیراں کو ثریا کا بچہ حویلی میں رکھنا پڑا۔ پیراں کی بیوی پر دورے پڑ رہے تھے۔ وہ چیختی تھی

کہ اسے اس کا بچہ دیا جائے پھر وہ پیراں نے پیچھے پڑ جاتی کہ ثریا کا بچہ تمہاری ناجائز اولاد ہے تمہارے بدمعاشیوں نے میرا گھر اجاڑ دیا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ پیراں نے بھی ثریا کے بچے کو قبول کرلیا تھا اور حویلی میں ایک عورت کو اس کے سنبھالنے پر لگا دیا تھا۔ پیراں بہت غصے میں تھا میں نے اسے بتادیا کہ کیونکہ اس کا بچہ اٹھالیا گیا ہے اس لئے میں اس سے ایک دو دن لحاظ ہی کروں گا لیکن ثریا تو جس حساب کی بات کررہی ہے وہ اس نے لینا ہے میں نے تم سے فیض کے قتل کا حساب لینا ہے۔

فیض کے قتل والی بات پر اس کا منہ کھل گیا۔ اسے شاید یقین نہیں تھا کہ میں اس پر شک کررہا ہوں۔ میں نے اس کا شک دُور نہیں کیا البتہ یہ بات کھل کر کردی کہ جس طرح سوچی گئی ہے وہ ڈاکوؤں کا کام نہیں تھا۔

اگلے دن مخبر آ گیا۔ اس نے توقع سے کم وقت لیا تھا۔ اس نے بڑی محنت سے پتہ تلاش کرلیا تھا۔ اس کی تفصیل آپ کے لئے غیر ضروری ہوگی مختصر یہ کہ چھما نورپور کے ڈاک بنگلے کے پیچھے ویران اور دلدلے علاقوں میں رہتا تھا۔ نہ جانے کب سے یہاں بڑے بڑے چھپڑ تھے جو اب سوکھ کر دلدلیں بن گئے تھے۔ میں نے بلال شاہ کو تیار کرلیا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ایس آئی بھی ساتھ لے چلوں لیکن میں کسی لاؤلشکر کے بغیر ہی چھمے کے سر پر جانا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب تک چھما ہاتھ نہ آیا یہ کیس حل نہیں ہوتا۔ میں نے عملے کو ہدایت کردی کہ پیراں کے چوکیدار کو حوالات میں رکھو باقی نوکروں کو آزاد کردو۔

نورپور تک جانے کے لئے ہمیں بس کا سفر کرنا پڑا۔ ایک چھوٹا سا پیکٹ میرے پاس تھا جس میں [illegible] خانہ روٹیاں پیٹ لیا۔ ہم دونوں اس حصے میں عام قسم کے مسافر بنے رہے تھے دو اڑھائی گھنٹے کے سفر کے بعد ہم نورپور پہنچے۔ یہ ایک پرسکون قصبہ تھا، خاموشی رہ، رہ کر بڑی ہم لاری اڈے سے باہر نکلے۔ مخبر کو کھانے والا پیکٹ پکڑا دیا اور ہم تین آدمی مختلف سے قصبے سے نکل کر ریسٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلے کی طرف چل پڑے۔ جس راستے پر ہم چل رہے تھے وہ کبھی کھیتوں میں سے گزرتا تھا اور کبھی ویران جھاڑیوں والے میدانوں میں سے۔ ہم قصبے سے خاصی دور نکل آئے۔ ایک ٹاہلی کے نیچے ہم بیٹھ کر تھوڑا سا آرام کرنے لگے۔ بس کے سفر کے بعد پیدل چلنے نے تھکا دیا تھا میں نے پیکٹ بلال کی طرف بڑھایا! مجھے بھوک نہیں تھی ان دونوں نے روٹیاں ختم کردیں تھوڑی دیر آرام کرکے ہم دوبارہ نکل پڑے۔ ڈاک بنگلہ کوئی سات آٹھ میل دور تھا ہم نے جان بوجھ کر تانگہ نہیں کرایا تھا ہم چوری وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔ اب ہم ایک ایسے راستے پر چل رہے تھے جو ایک کسی کی پٹڑی تھی دیہات میں رہنے والے لوگ جانتے ہیں کہ کسی کیا ہوتی ہے یہ درمیانے سائز کا نالہ سا ہوتا ہے جس میں فصلوں کے لئے صاف پانی ہوتا ہے۔

کسی کے اونچے اونچے کناروں کے دونوں طرف شالے اور برسین کے پتے لگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں سروٹ کے جھنڈ تھے۔ ٹھنڈی ہوا اور فصلوں کی خوشبو آرہی تھی۔ اب ایک طرف خاردار تاریں آنا شروع ہوگئیں۔ یہ ریسٹ ہاؤس کی حد بندی تھی یہاں سے گزر کر آگے میدان شروع ہورہا تھا۔ ہم نے کسی کے کنارے سے نیچے چھلانگ مار کر میدان والا راستہ پکڑنا تھا۔ میں نے کنارے سے چھلانگ ماری اور بلال نے اور مخبر کا انتظار کررہا تھا کہ سنسان روش پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ میں

روٹ سے نیچے اُتر کر برسین کے کھیت میں ہو گیا گھوڑا ابھی خاصی رفتار میں تھا۔ اس کے پیچھے دوسرا گھوڑا آ رہا تھا اور پھر تیسرا' پھر چوتھا جونہی پہلا گھوڑ سوار میرے پاس سے گزرا میں نے اس کی طرف دیکھا، سر پر پگڑی تھی جس کا ایک پلو اس نے منہ کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اور ناک نظر آ رہے تھے۔ ایک آنکھ کانی تھی۔ یہی چھما کانا تھا؟ چاروں گھڑ سوار میدان کی طرف جا رہے تھے جس کے آگے رکھ کے درخت دُور نظر آ رہے تھے۔ گھڑ سواروں نے ہماری طرف سرسری طور پر دیکھا وہ ہمیں کوئی مسافر ہی سمجھے ہوں گے۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد ہم رکھ میں تھے۔ یہ گھنے جنگل جیسی رکھ تھی۔ دُور تک درخت ہی درخت تھے ان کے درمیان سرکنڈوں کے آدمی کے قد سے اونچے جھنڈ تھے۔ ڈاکوؤں کے لئے چھپنے کی بہترین جگہ تھی۔ ایک ٹیلے کے گرد گھوم کر ہم تھوڑی سی خالی جگہ پر آئے سامنے ہی کالی اینٹوں کا ڈھانچا نما کمرہ تھا۔ کسی زمانے میں کوئی مکان قسم کی عمارت رہی ہو گی ہم سرکنڈوں کے پیچھے ہو گئے۔ ایک طرف پانچ گھوڑے کھڑے تھے ان کی دُمیں ہل رہی تھیں اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ وہ ابھی سفر کر کے آئے تھے صرف ایک آدمی باہر چارپائی پر بیٹھا کوئی سبزی کاٹ رہا تھا۔ کہیں اندر سے کسی نے آواز دی۔ ''کالیے!''

سبزی کاٹنے والے کا نام کالیا تھا وہ چھری پرات نما تھالی میں رکھ کر الٹا سیدھا کھڑا ہوا اور اسی وقت اس کی نظریں ہماری سیدھ میں پڑی۔ ہم سرکنڈے کی بڑی سی جھاڑی کے پیچھے تھے پر وہ تو اس علاقے کا تھا اسے ہر جھاڑی اور درخت کا علم ہو گا وہ سرکنڈے کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اسے کوئی شک ہو گیا ہو۔ اندر سے پھر آواز آئی ''کالیے ادھر آ۔''

کالئے نے کوئی جواب دینے یا اندر جانے کے بجائے چھری پکڑی اور آہستہ سے اس جھاڑی کی طرف آنے لگا جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ بلال کا سانس تیز ہو گیا وہ باہر نکل کر کالیے سے بھڑ جانے کا سوچ ہی رہا ہو گا اور اس کے جسم نے حرکت کی ہی تھی کہ میں نے اسے روک لیا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے باہر جانے دو جب میں آواز دوں تو اس جھاڑی سے باہر نکلنا ورنہ نہیں۔ جس طرف کالیا آ رہا تھا میں گھوم کر دوسری طرف سے اس کے پہلو میں آ گیا۔ میں نے ہلکے سے آواز دی ''کالیے!'' وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ شاید کوئی بھوت سمجھ کر وہ دوڑنے ہی والا تھا کہ میں اس کے سامنے آ گیا کالیے کی آنکھیں سکڑ گئیں بلکہ جس طرح بلی شکار کو دیکھ کر آنکھیں سکیڑ لیتی ہے میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا میرا پیر رپٹا اور میں چاروں شانے چت گرا ہوا تھا کالیا ہاتھ میں چھری لئے میرے سر پر تھا میں نے حواس قائم رکھے ورنہ وہ میری آنتیں نکال دیتا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے وار کیا چھری کا رُخ میرے سینے کی طرف تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے ٹانگ کالیے کے پیٹ میں ماری وہ درد سے دہرا ہو گیا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا میری دوسری لات اس کی پسلیوں میں پڑی میں نے لپک کر زمین پر پڑا ہوا چاقو اٹھا لیا۔ اس کے بال مٹھی میں پکڑے اور چھری اس کی گردن پر رکھ دی۔ ''اندر کون ہے کالیے؟'' کالیا سمجھ گیا تھا کہ مجھ سے جان چھڑانا اس کے بس کی بات نہیں ہو گی۔ اتنی دیر میں اندر والوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ کالیے کو باہر کس چیز نے روک لیا ہے ہڑبڑا کر باہر نکلے ان میں سے چھما صاف پہچانا جاتا تھا۔ اس نے مجھے

کالیے کو یوں دبائے دیکھا تو بڑی احتیاط سے میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے اس کے دو تین آدمی بھی تھے اب بلال شاہ بھی میری ہر ہدایت بھول کر جھاڑی سے باہر آچکا تھا۔ مخبر اس کے پیچھے تھا بلال کا دیسی پستول اس کے ہاتھ میں تیار تھا جیجے نے بھی دیکھ لیا کہ اس کی مرضی نہیں چلے گی۔ وہ خالی ہاتھ تھا بلال پستول تانے اس کے سر پر تھا اور اس کا ایک آدمی میری چھری کے نیچے وہ اپنی زوردار آواز میں بولا، ''کون ہو تم؟''

''تمہارا باپ ہوں جیجے!'' میں نے بھی اسی طرح بھاری آواز میں جواب دیا۔

''سیدھے واپس چلو اسی کمرے کی طرف جہاں سے آئے ہو۔'' میری بات ختم ہوتے ہی بلال شاہ نے اسے پستول کی نال پر رکھ لیا۔ میں نے کالیے کو آگے لگایا اور جیجے کے پیچھے ہم اس کھنڈر نما کمرے میں داخل ہوئے۔ اندر جاتے ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ایک کونے میں ثریا زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں رسی بندھی ہوئی تھی اور اس رسی کو چھت پر لگے کنڈے سے ٹانگا ہوا تھا۔ ''ثریا تم یہاں کس طرح آ گئیں؟'' میرے منہ سے فوراً اور کچھ نہ نکلا۔

ثریا نے میری طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے کی خوبصورتی اُجڑی اُجڑی سی لگتی تھی۔ ''تھانیدار صاحب! میری امانت چودھری کے حوالے کردی؟''

تھانیدار کا لفظ سن کر جیجا چونکا۔ اس نے ہر احتیاط ایک طرف رکھی اور کونے میں رکھی چارپائی پر پڑی ہوئی رائفل کی طرف دوڑا۔ بلال شاہ کی پھرتی کا شاید اس نے اندازہ نہیں کیا ہوگا۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی جیجا زمین پر اور بلال اس پر سوار تھا۔ اس کے ہتھوڑے جیسے گھونسوں نے جیجے کی ساری رستم خانی دُور کردی۔ مخبر بھی اندر آ گیا تھا میں نے رائفل خود پکڑ لی اور بلال اور مخبر سے کہا کہ اس کمرے کو تھانہ سمجھ کر جیجے کی طبیعت صاف کرو۔ اس کے بعد میں اس سے پوچھ گچھ کروں گا۔ بلال کو اور کیا چاہئے پھر اس کمرے میں جیسے بھونچال آ گیا۔ بلال فارغ ہوا تو اس حالت میں تھا کہ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ دو لفظ بھی بول سکے گا۔ پر اس پٹے ہوئے نائی میں ہمت ابھی تھی۔ ''موچی کو کس نے مارا تھا؟'' میں نے جیجے کو پوری طرح سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر پوچھا۔ ''میں نے نہیں مارا، مارنا ہوتا تو اس دن مار دیتا جس دن وہ اس کی ڈولی لینے آیا تھا۔'' اس کا ہاتھ ثریا کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''پھر اس کے گھر پر کیوں چڑھ آئے تھے؟''

وہ بڑی عجیب سی کھسیانی ہنسی کے بعد بولا ''تھانیدار صاحب...... بس جی کیا بتاؤں بڑی عجیب چیز ہوتی ہے یہ پیار محبت بھی میں کوئی چور ڈاکو نہیں تھا بس بن گیا۔'' اس کا ہاتھ پھر ثریا کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

''اس پر غصہ بھی آتا ہے اور اسے مار بھی نہیں سکتا۔ ملکیت سمجھتا ہوں اسے میں اپنی۔ گاؤں سے تو نکل آیا پر خبر ہوتی ہے ہر چیز کی مجھے۔ پیراں نے اسے رکھیل بنانا چاہا شاید بنا بھی لیا جب مجھے پتہ چلا کہ اس کے گھر بچہ ہوا ہے تو سچ مانو میرے اندر برداشت نہ رہی۔ گاؤں پر آ چڑھا اور پھر جو سامنے آیا اسے میرے غصے کی آگ لگتی گئی۔ قسمت اچھی تھی پیراں کی بچ گیا میں تو خود بھی اندر سے جل گیا اور گاؤں بھی ساڑ دیا۔ پر جناب یہ آگ پتہ نہیں کس چیز کی بنی ہوتی ہے بجھتی ہی نہیں پر ایک بات ہے میں تو اندر سے مر گیا ہوں پر قتل میں نے گاؤں کا کوئی بندہ نہیں کیا۔'' اس نے سر جھکا لیا جیسے کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہو۔ مجھے سسکیوں کی ہلکی سی

آواز آئی۔ ثریا گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی۔ اس کا جسم ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا پھر وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ سے بندھی رسی تن گئی۔ "پر اب تو تجھے ٹھنڈ پڑ گئی ناں۔" فیض مارا گیا بچہ جس کا تھا اس تک پہنچا دیا ہے۔ اب میں آزاد ہوں جھجے اور اب میں اپنے سینے میں ٹھنڈ ڈالوں گی۔ حساب تو میں اسی دن تم سے چکا دیتی جس دن تم نے میرے گھر پر حملہ کیا تھا اور مجھے بالوں سے پکڑ کر گھوڑے پر ڈالنے لگے تھے۔ تمہیں میری عزت کا خیال ہوتا تو ایسا نہ کرتے اس رات فیض کے پاس صرف ایک لکڑی تھی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو تیری جان لے لیتا۔" میں نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرایا۔ "ہاں جھجے بتاؤ کو دوسری بار گاؤں پر کیوں حملہ کیا تم نے؟"

وہ سر پر ہاتھ پھیرنے لگا "پہلے ہی بتایا ہے کہ ثریا کے بچہ ہونے کے بعد سینے کی آگ زیادہ بھڑک گئی۔ دل چاہتا تھا جو سامنے آئے اس کا خون کردوں۔ دو سال یہ آگ میرا اندر جلاتی رہی اور میں برداشت کرتا رہا۔ دو سال برداشت کرتا رہا ہوں۔" وہ ہانپنے لگ گیا۔ "پھر نہیں برداشت کرسکا میں پورا گاؤں جلانا چاہتا تھا وہ......" اس نے موٹی سی گالی دی۔ "پیراں! وہ حرام کا جنا وہ ثریا کا مالک بن بیٹھا۔ اس کے بچے کا باپ وہی ہے پوچھ لیں اس سے۔"

اس نے پھر ثریا کی طرف اشارہ کیا میں اسے کیسے چھوڑ دیتا۔ ثریا کے گھر اس بچے کو دیکھ کر میرا دماغ اُلٹ گیا تھا۔ افسوس ہے پیراں میرے ہاتھ سے بچ گیا۔" وہ غصے سے مٹھیاں بند کر رہا تھا۔ پر اس کا گھر والا میں نے نہیں مارا۔ یہ بھی جانتی ہے اسے اپنے ہاتھوں سے رنڈی کیسے کرتا؟ میں نے کہا ناں اس پر غصہ بھی ہے مجھے اور اسے تکلیف بھی نہیں دے سکتا۔ وفادار عورت ہے، میری نہیں بنی کسی کی تو ہے۔ اسی بات کی قدر ہے مجھے۔" پھر اس نے پاگلوں کی طرح قہقہہ مارا۔ "میں تو مر گیا جی اسی دن میں مر گیا تھا جس دن اس نے فیض کا گھر آباد کردیا۔ ایک بھوت رہ گیا ہوں مجھے بھوت بنانے والوں کا گھر بار جلاتا پھرتا ہوں۔ اندر کی آگ مر گئی تو سکون آجائے گا پر لگتا ہے میں نے یہ آگ نہ بجھائی تو اور بھڑک جائے گی جس میں پتہ نہیں کون جل جائے۔" وہ پھر قہقہے مارنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد خاموش ہوگیا۔

"بڑی ہمت والی ہے۔ مجھے تلاش کرتے یہاں آگئی۔ جانتی بھی ہے کہ موچی میں نے نہیں مارا مجھے تیری تلاش تھی ثریا تو نہیں ملی۔ اب تو مجھے تلاش کرتی آئی ہے پر مجھے مارنے کے لئے آمار لے مجھے۔ میرے سینے کے بھانبڑ تو ٹھنڈے نہ ہوئے آجا تو اپنے سینے کی آگ ٹھنڈی کرلے۔" جھجے نے ناقابل یقین تیزی کے ساتھ حرکت کی اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھ سکتے جھجے نے اپنے کپڑوں سے نہ جانے کہاں چھپا ہوا چاقو نکالا ثریا کے پاس پہنچا اور پھر ایک خوفناک چیخ نے مجھے سن کردیا۔ چاقو ثریا کی پسلیوں میں دھنس چکا تھا۔ مجھے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ جھجے نے چاقو پسلیوں سے کھینچا اور باہر کی طرف بھاگا میں نے اپنا سروس ریوالور نکالا اور جھجے کی ٹانگ میں گولی مار دی گولی کھانے کے باوجود وہ لنگڑاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ میرے لئے ایک لمحے میں فیصلہ کرنا تھا کہ مرتی ہوئی ثریا کے پاس ٹھہروں یا جھجے کے پیچھے جاؤں۔ بلال میری یہ حالت سمجھ گیا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے بولا "خان صاحب آپ ثریا کے پاس جائیں میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔" سرکنڈوں کے پاس کالیا تین گھوڑے لئے کھڑا تھا اسے شاید یقین تھا کہ جھجا نکل آئے گا ہم بھی جھجے اور ثریا کی باتوں میں اتنے کھب گئے تھے کہ ہمیں کالیے کے باہر نکل جانے کا احساس

تک نہ ہوا۔ اس نے باقی ساتھیوں کو شاید ادھر ادھر کردیا تھا۔ وہ ہمارے باہر نکلنے کے انتظار میں تھے ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ بلال کو نہ جانے ڈوں پر وہ اتنی دیر میں سرکنڈے تک پہنچ چکا تھا۔ جھما گھوڑے پر سوار ہوکر کالیے کے ساتھ اس پار ایک فرلانگ آگے تھا تیسرے گھوڑے پر بلال کو چھلانگ لگاتے میں نے دیکھا اور واپس کھنڈر کی طرف بھاگا۔ ثریا زمین پر گری پڑی تھی اس کا سانس بھاری اور تکلیف سے آرہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں سارے جہان کی حسرت سمٹ آئی تھی۔ "تھانیدار صاحب۔"

اس نے لمبا سانس کھینچ کر کہا "میرا وقت پورا ہوگیا ہے۔ جھبے کے پیچھے اس لئے یہاں آئی تھی کہ اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کردوں بے شک اس نے میرا گھر والا نہیں مارا تھا پر میرا گھر اس کے عشق نے برباد کردیا۔ مجھے وہ اچھا ضرور لگتا تھا پر جس کے ساتھ دو بول پڑھے گئے میرا مجازی خدا تو وہی تھا اس کے ساتھ دغا کیوں کرتی؟ گھر کی بربادی تو جھبے کی وجہ سے ہی ہوئی ناں۔ میرا دوسرا مجرم بیراں ہے اس نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا گھر والے کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی وہ سمجھ گیا تھا کہ میں بے بس تھی تھانے میرے پاس جو بچہ تھا بیراں کا ہے وہ بھی جانتا ہے چلو اس کی چیز اس کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ تھانیدار جی مرتی ہوئی اس غریب سے ایک وعدہ دیں، بیراں اور جھبے سے میرا حساب نے لینا میرے بچے کو دیکھتے رہنا اس نے تو ماں کو ہوش میں نہیں دیکھا۔ میرے ساتھ جی بھر کے سویا بھی نہیں۔" میری آنکھیں بھیگ گئیں یہ ایک مرتی ہوئی ماں کے دکھ میں ڈوبے الفاظ تھے۔

"فکر نہ کرو اللہ تمہارے بچے کی حفاظت کرے گا۔ وہ اپنے باپ کے پاس ہے۔"

میں نے اس کا دوپٹہ اس کی پسلیوں کے گرد کس کر باندھ دیا۔ چاقو کا وار کاری تھا شاید پھیپھڑے میں اتر گیا تھا۔ اس کی حالت اکھڑ رہی تھی وہ بڑی بے بسی کی موت مر رہی تھی میں بھی بے بس تھا۔ اس جنگل نما رکھ میں سے نکال کر اسے ڈاکٹر کے پاس کہاں لے جاتا؟ اس کی حالت ایسی نہیں تھی وہ جلد ختم ہونے والی تھی۔

میں نے اپنی آواز کو نرم کرتے ہوئے اس سے آرام سے پوچھا۔ "تمہارے خاوند کو کس نے مارا تھا؟"

"سلیم خان نے۔ وہ بیراں کا چوکیدار ہے اس کے سارے خراب کام وہی کرتا ہے۔ بیراں نے مجھے اسی کے کمرے میں خوار کیا تھا۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا، گھر والا مر گیا اب میری باری ہے میری لاش میرے ماں باپ کو دے دینا ہو سکے تو میرا بچہ بیراں سے لے کر میری ماں کو دے دینا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایک اور احسان کردینا تھانیدار صاحب۔ میرے بیٹے کو بتا دینا کہ اس کی ماں خراب نہیں تھی اس پر ایک دم غنودگی چھا گئی۔ سانس زیادہ بھاری ہوگیا اور میرے دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس کے گلے سے خرخراہٹ سی نکلی اور وہ میرے ہاتھوں میں دم توڑ گئی۔ میں نے اس کی آنکھیں ہاتھ سے بند کردیں اور اس کی لاش سیدھی کرکے اس کا دوپٹہ اس پر ڈال دیا۔ دوپہر سے آگے کا وقت تھا رکھ میں گھنی چھاؤں تھی مجھے بلال شاہ اور اس مخبر کی فکر تھی دونوں ایک ہی گھوڑے پر سوار ہوکر جھبے کے پیچھے نکلے تھے۔ انہیں گئے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی تھی پر میری فکر اپنی جگہ تھی۔ جھبے اور اس کے ساتھی اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہوں گے ان کی تعداد بھی پتہ نہیں کتنی تھی۔ چار تو میں نے اس طرف آتے ہوئے راستے میں دیکھے تھے۔ بلال نے بھی جلدی ہی کی تھی کہیں آپس میں ٹھہر گئے تو

اتنے آدمیوں کا کس طرح مقابلہ کریں گے؟ پھر لاش بھی یہاں سے لے جانی تھی۔ تھوڑی دیر ہی سوچتے گزری تھی کہ بلال شاہ اور مخبر دونوں واپس آتے دکھائی دیئے۔ میرے پاس آکر گھوڑے سے اترے۔ بلال شاہ کہنے لگا کہ جھما اور کالیا نکل گئے میں نے اس لئے زیادہ دُور تک پیچھا نہیں کیا کہ علاقے سے ناواقف تھا۔ بھول جاتا تو یہاں کھنڈر تک کیسے آتا۔ ثریا کی لاش دیکھ کر بلال کو بھی دُکھ ہوا۔ میں نے اسے کہا کہ ریسٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلے جاکر چوکیدار سے ایک دو بندے لے آئے۔ بلال ان کاموں میں ماہر تھا۔ اس کے ساتھ واپسی پر تین آدمی تھے اگرچہ یہ میرا تھانے کا علاقہ نہیں تھا لیکن پولیس کا نام سن کر لوگ ہر کام کرنے لگے۔ میں نے لاش چارپائی پر رکھ کر اٹھوائی اور نورپور کے تھانے لے گئے۔ مجھے تھانیدار کا نام یاد ہے، بسواس تھا۔ اس نے اپنی طرف سے کارروائی درج کی اور مجھے کیخلاف کارروائی کا وعدہ کرکے انہیں رخصت کردیا۔ مہربانی اس نے یہ کی کہ اپنے ایک اے ایس آئی اور دو سپاہیوں کے ذریعے لاش کو پنجونی پہنچانے کا انتظام کردیا۔ ثریا کے ماں باپ تو کفن دفن میں لگ گئے، میں نے پوسٹ مارٹم نہیں کرایا۔ واردات میرے سامنے ہوئی تھی ایف آئی آر میں نورپور میں درج کرا آیا تھا۔ میں نے گھر جاکر کچھ آرام کیا اور پھر تھانے آگیا۔ محرر سے کہا کہ سلیم خان کو میرے پاس لے آؤ۔

تشدد کرکے مجرم سے اگلوانا پولیس کی پرانی روایت ہے۔ آج کے ماڈرن دور میں اسے کچھ بھی نام دیا جائے یہ حقیقت ہے کہ بعض مجرم تو اس کے بغیر منہ کھولتے ہی نہیں۔ سلیم خان میری توقع سے زیادہ سخت جان تھا۔ ٹوٹی ٹانگ کے باوجود پتھر بنا ہوا تھا۔ [illegible] مجھے ثریا کے الفاظ یاد آتے تھے۔

"میرا حساب لینا ہے۔" اسے مار مار کر میرے اور بلال کے ہاتھ تھک گئے تب جاکر اس کی زبان کھلی۔ میں نے سلیم خان کیخلاف قتل کا پرچہ کاٹا۔ اب چودھری پیراں سے حساب کرنا باقی تھا۔ میں نے ایک مری ہوئی عورت سے یہ وعدہ بھی تو کیا تھا کہ اس کی طرف سے حساب لوں گا۔ اس کے بچے کا بھی تو پتہ چلانا تھا۔ شام سے کچھ دیر پہلے میں بلال کو ساتھ لئے پیراں کی حویلی پہنچ گیا۔ یہ حویلی کا پچھلا حصہ تھا جس کے تین طرف کھیت اور باغ تھے۔ دیوار پر چڑھنے میں ہمیں مشکل ضرور ہوئی کہ بلال تو ساٹھ کا تھا اور وہ اس کوشش میں ہانپ رہا تھا۔ بہرصورت ہم دیوار کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ ایک دروازہ کھولا تو چھوٹا سا خالی کمرہ تھا۔ کوئی سامان نہیں تھا۔ اس میں صرف سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں چند سیڑھیاں نیچے اتر کر دوسری طرف مڑ جاتی تھیں۔ ان کے آگے بہت بڑا تہہ خانہ تھا۔ چھت کو ستونوں کی لمبی قطار نے اٹھا رکھا تھا۔ سیڑھیوں سے تھوڑی آگے ہی ایک طرف دیوار کے ساتھ صف بچھی تھی اور اس کے ساتھ پرانا سا گھڑا اور مٹی کا پیالہ دھرا تھا۔ ایک دسترخوان کھلا پڑا تھا جس پر روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑے تھے لگتا تھا کہ کوئی یہاں سے کھانا کھانے کے بعد ابھی ابھی گیا ہے۔ میں اور بلال چھپنے کی جگہ دیکھ رہے تھے کہ فرش پر چپل گھسیٹ کر چلنے کی آواز آئی۔ شاید روٹی کھا کر جانے والا واپس آرہا تھا۔ ہم ایک ستون کی آڑ میں آگئے، میں سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے۔ اتنے میں سامنے بنے ہوئے دو کمروں میں سے ایک میں رونے کی آواز آنے لگی۔ روٹی کھا کر جانے والا اب بالکل میرے سامنے تھا۔ پرانے بوسیدہ کپڑے، داڑھی اور مونچھیں بڑھی ہوئی پکا جرائم پیشہ لگتا تھا۔ پیراں نے شاید اسے نگرانی کے لئے یہاں رکھا ہوگا۔۔ بچے کی آواز سن کر وہ آدمی اس طرف چل پڑا۔ چند قدم ہی چلا ہوگا

پنڈلی میں جیسے انگارے سے بھر گئے۔ میری ایک ہی زوردار ضرب سے چودھری فرش پر جا پڑا۔ میری ٹانگ میں ناقابل برداشت درد ہوا اور میں اس پر ہاتھ رکھنے کے لئے نیچے بیٹھ گیا۔ اسی وقت رائفل کا بٹ میرے کندھے پر لگا میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ گیا۔ اندھیرا پورا ہونے سے پہلے میرے سروس ریوالور سے نکلنے والی گولی نے شاید راجے کے بازو کی ہڈی توڑ دی تھی پھر میں چند لمحوں کے لئے بے ہوش ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو بلال میرے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور جب صحیح نظر آنے لگا تو میں نے دیکھا کہ چودھری اور چوکیدار دونوں بازو اور ٹانگیں ڈھیلی کئے فرش پر ڈھیر تھے چوکیدار کے سر سے خون نکل رہا تھا شاید اس کا ماتھا پھٹ گیا تھا۔ بلال نے ان کی بہت اچھی دھلائی کر دی تھی راجا بے ہوش پڑا تھا۔

اس مار کٹائی کے بعد پیراں کی بیوی سہم گئی تھی۔

اس نے میری طرف اشارہ کیا ”تم کون ہو؟“

”تم میری فکر نہ کرو جاؤ اپنے بچے کو اوپر لے جاؤ میں ابھی اوپر آتا ہوں۔“

میری پنڈلی میں ہونے والا درد اب کم ہو رہا تھا شکر ہے کہ گولی ٹانگ کے اندر نہیں گئی بلکہ جلد کو چھو کر گزری تھی صرف جلد تھوڑی سی پھٹ گئی تھی اور اس سے خون رس رہا تھا۔ ان لوگوں کو باندھ کر تھانے لے جانے اور اپنے زخم پر پٹی کرانے میں کچھ وقت لگ گیا۔

تھانے میں نے جا کر میں نے چودھری کو سامنے بٹھایا۔ میرے ہاتھ میں چھڑی تھی میری آنکھوں میں قہر اتر آیا تھا۔ شاید چودھری کی اکڑفوں ابھی باقی تھی میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”پیراں یہ تمہاری حویلی کا تہہ خانہ نہیں میں یہاں مار مار کر تمہاری چمڑی اتار دوں گا۔ مجھے اس پر مجبور کئے بغیر بتا دو کہ فیض کو تم نے کس سے قتل کرایا ہے؟“ سلیم خان مجھے بتا چکا تھا لیکن میں اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ اس سے اقبالی بیان لینا تھا چودھری غرایا ”دیکھ انسپکٹر میں کوئی معمولی کاماں نہیں ہوں میری حیثیت کے مطابق بات کر۔“

پھر سے دماغ نے پلٹا کھایا۔ میری سوئی گھومی اور پھر مجھے یاد نہیں کہ پیراں کے جسم کے کس کس حصے پر برس گئی۔ چند ہی لمحوں میں اس کا دماغ درست ہو گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور سر جھکا لیا میں نے محرر کو بلایا کہ اس کا اقبالی بیان لکھ لو۔ میں نے پیراں کو حوالات میں ڈال دیا چالان بنا کر ایک دو دن میں فارغ ہو گیا۔ چودھری پیراں نے ضمانت کا بندوبست کر لیا چونکہ خون اس کے ہاتھ سے نہیں ہوا تھا اس لئے اس کا جرم قابل ضمانت تھا۔ حوالات سے نکل کر پیراں گھر گیا اور کیس عدالت میں لگنے تک گھر سے نہیں نکلا۔ اس کی عزت گاؤں میں خراب ہو گئی تھی۔ عدالت کی طرف سے اسے سات برس قید کی سزا ہوئی تھی سلیم خان کو عمر قید کی سزا ملی چونکہ موقع کا گواہ کوئی نہ تھا اس لئے اسے شک کا فائدہ دے دیا گیا تھا۔

پیراں کے سالوں نے اس کا گھر سنبھال لیا تھا۔ ایک دن میں اس کے گھر گیا اس کا ثریا والا بچہ پاؤں چلتا تھا، بڑا خوبصورت بچہ تھا۔ بالکل اپنی ماں کی شکل پر گیا تھا۔ میں نے پیراں کی بیوی سے بات کی کہ اس کی ماں ثریا چاہتی تھی کہ اس کا بچہ اس کے ماں باپ یعنی نانا نانی کو دے دیا جائے اسے کوئی اعتراض ہے؟ پیراں کی بیوی کو اور کیا چاہیے تھا وہ مان گئی۔ میں نے بچہ اس سے لے کر خود اس کے نانا کے گھر پہنچایا۔ ثریا کے ماں باپ بے چارے بیٹی کو یاد کر کے ہر وقت روتے تھے ان کو بیٹی کا بچہ مل گیا تو انہیں کچھ سکون ہو گیا۔ شاید ثریا کو بھی قبر میں آرام آ گیا ہو۔ اس کا حساب میں نے لے لیا تھا۔

●●

سفر کو اسی شدت سے جاری رکھتے ہیں۔کبھی کبھی خود آشنا ہونے والوں کو خدا مشکلات کم اور آسانیاں زیادہ عطاء کرتا ہے۔کیونکہ قدرت ایسے شخص کو اپنی رحمت سے ناامید نہیں ہونے دیتی۔اس طرح وہ تھوڑے تھوڑے وقت کے لئے اللہ سے عارضی محبت کرتے ہیں پاک ہوتے ہیں، پھر روزمرہ کے معاملات میں مشغول ہوجاتے ہیں۔جب ان کے پیمانے خالی ہوتے ہیں۔جسم پر غلاظتوں اور الائشوں کی سیاہی بڑھ کر اصل چہرے کو چھپا لیتی ہے، تو وہ اپنی اصل کو قائم رکھنے کے لئے فطرت سلیم کی طرف لوٹتے ہیں۔چند آنسوؤں کو صدقہ کرکے خدائی کے حوض کوثر سے اپنا جام بھرتے ہیں۔مغفرت کے حوض میں غوطہ زن ہوکر خوب رگڑ رگڑ کے اپنے کو صاف کرتے ہیں۔ایک دفعہ پھر توبہ کرکے اللہ سے معافی مانگ کر دوبارہ گناہوں کی دنیا میں گم ہوجاتے ہیں۔

دوبارہ گناہ کے خوف سے توبہ اور اچھائی کو خیرباد نہیں کہنا چاہئے۔کیونکہ توبہ کی توفیق بھی قدرت کی عطاء ہے۔فطرت کی انسان دوستی کا اس سے بڑا ثبوت کوئی نہیں کہ وہ انسان کو ہمیشہ گناہ سے باز رکھتی ہے اور اس کا ضمیر ہمیشہ ہر غلط کام پر اسے ملامت کرتا ہے۔اور اگر اندر کی غلاظت اور شیطان کی مہربانی یا Divine Resistance کی بدولت اس سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو پھر اس وقت تک انسان کو کرب میں مبتلا رکھ کر دھکیلے کر معافی کے لئے مجبور کرتی رہتی ہے۔جب تک وہ دوبارہ ڈبکی لگا کر اپنے آپ کو صاف نہیں کرلیتا۔توبہ نعمت ہے اور انسان کو اس نعمت کا بے دریغ استعمال کرنا چاہئے۔کیونکہ جتنا اس کو استعمال کیا جائے گا اتنا ہی روح اور بدن کی صفائی، طہارت اور پاکیزگی زیادہ اور دیرپا ہوگی۔دراصل توبہ گناہوں کا کفارہ ہے۔توبہ واحد نعمت ہے جس کا حساب نہیں ہوگا!

نیکی اور بدی کن فیکون سے لے کر صور پھونکے تک قائم اور مدمقابل رہیں گی۔تخلیق آدم سے لیکر تحلیل آدم تک ہردو کے درمیان جنگ اور مقابلہ جاری رہے گا اور اس جنگ کا مقام دنیا اور سپاہ انسان خود ہے۔خالق نے انسان سے محبت کا ثبوت توبہ کی صورت میں دیا ہے۔طویل عرصہ گناہ کے بعد نیکی یا عمر بھر کی اچھائی کے بعد گناہ کا سرزد ہوجانا بھی دراصل قدرت کی انسان سے محبت کا ثبوت ہے۔انسان کبھی بھی مکمل گناہگار نہیں ہوتا بلکہ اس کی زندگی نیکی اور بدی کے درمیان مدوجزر کی طرح ہوتی ہے۔یہ ایک Camel Ride ہے۔کبھی کم کبھی زیادہ، کبھی اوپر کبھی نیچے۔کبھی نیکی کا پلڑا بھاری ہوجاتا ہے تو اچانک کوئی گناہ سرزد ہوجاتا ہے۔انسان روتا ہے ملامت کرتا ہے۔اپنے ضمیر سے دست و گریباں ہوتا ہے اور اضطراب کا شکار رہتا ہے۔اس خود مذمتی کے عرصہ میں وہ کبھی بھی نہیں سوچتا کہ اگر تمام کائنات کے انسان خود آشنائی اور خود آگہی کے اس عمل کی تکمیل کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو جنت اور دوزخ، قیامت و ریاضت کا نظام ختم ہوجائے۔اس لئے قدرت نے Divine Resistance کے اصول کے تحت اپنے مقبول بندوں کو مسلسل امتحان اور دوری کے نشہ میں مبتلا رکھا ہے۔تاکہ وہ لمحہ لمحہ خدا آشنا ہوتے ہوئے بھی حقیقت آشنا نہ ہوسکیں۔اسی میں پردہ قدرت کی حقیقت پنہاں ہے اور اسی دکھ اور درد میں محبت کی عبادت اور نروان ہے!

سودا یا پاگل پن، لاحاصل کو حاصل کرنے کی ہی کوشش کا حصہ ہے۔جس میں کچھ پتنگے کی طرح جل جاتے ہیں، کچھ چکوری کی طرح چودھویں کی رات سینہ چاک کرلیتے ہیں اور نہ ہوسکی کو [illegible] کے ذریعہ

یا جانوروں کی غذا بنتے ہیں، کچھ کونج کی طرح جدائی میں اداس، موت کی آغوش میں اور کچھ کسی یاد کے سہارے دروازے کے خالی کونے میں صاحب در پر آنکھیں چار کرکے روح اس کے حوالے کرتے ہیں۔ سب کا سودا اپنا اپنا اور حاصل قسمت جدا جدا ہے۔

میں تیری نماز تب پڑھوں، جب شب سے شب پانچ وقت 96 سجدوں 48 رکوع اور قیام میں مجھے ہر لمحہ ہو کہ تم تو ہمیشہ میرے روبرو ہوتے ہو... سوچ اور فکر صرف تم ہو۔ تمہاری سوچ نے ہی مجھے پانی نا پانی کا احساس ہی ختم ہونے دیا۔ روزہ رہا، میری زندگی بیت گئی تیرے دیدار کے لئے صبر کرتے کرتے۔ آنکھوں میں پانی اور نور دونوں ختم ہو گیا ہے۔ حج کے لئے میں تیرے سیاہ مکان کو دیکھنے تب جاؤں، جب تم مجھے شہ رگ کے پاس میرے دن رات، صبح شام ہر ہر گام میں میرے ساتھ نظر نہ آؤ۔ جب میرا جسم تیرا گھر ہے تو میں مٹی کے گھر کے چکر کیوں لگاؤں؟ مجھے تیری ضرورت ہے۔ مجھے نماز نہیں نماز والا چاہئے۔ حور و قصور کے لالچ میں ادا ہونے والی نماز میرا مقصود نہیں، مجھے حور و قصور نہیں، حور و قصور کا خالق چاہئے۔ حوض کوثر سے پیاس بجھانے کی بجائے میں پیاسا مرنا پسند کروں گا، مگر مجھے حوض کوثر نہیں اس کا مالک چاہئے۔ تیرے بدلے جنت کی تن آسانی کا سودا میں نہیں کرتا۔ ہاں مجھے جہنم دے دے، میں اس کی آگ میں جلوں گا، پر نام تیرا میری زبان پہ ہو۔ میری کھال کھینچ، پر میرے روں روں سے تیرا نام بلند ہو، میری زبان گدی سے نکال پھینک مگر ذکر اس پہ پھر بھی تیرا ہو۔ مجھے دہکتے کوئلوں سے گزار، مگر جسم کی چربی کا پگھلا ہوا ایک ایک قطرہ تیرے عشق کی آتش کو آتش فشاں کر دے۔ میرے بدن کو بار بار تیر اور تلوار سے کاٹ، مگر وہ ہر بار تیری یاد میں دھڑکے، میرے دماغ کا ایک ایک ریشہ جدا کر دے مگر اس کی ہر تار سے تیرا ذکر نکلے۔ میری روح کو بار بار عذاب آشنا کر، مگر اس کو پھر بھی تیرے نام کی ٹھنڈک عطا ہو۔

مجھے جلتی ہوئی آگ میں ڈال، مگر میرے لئے وہ آگ ٹھنڈا مست... میرے گلے پہ چھری چلا مگر میری جلد و سینہ مست... بنا کہ میں خود اپنی شہ رگ کاٹوں۔ تیرے قدموں میں ذبح ہونے کو تیار ہوں، میرے جسم میں کیڑے ڈال دے، مجھے مچھلی کی غذا بنا یا کنویں کی سزا دے، میرا سر کاٹ میرے ہاتھ اور پاؤں کاٹ کے ٹکڑے ٹکڑے بکھیر دے، مگر صرف ایک صفت عطا کر کہ میرے خون کے ایک ایک قطرے سے، جسم کے ایک ایک ٹکڑے سے، ایک ایک آہ اور سسکی سے، ایک ایک سانس اور دھڑکن سے اور زبان کے ترنم سے صرف تیرا نام جاری ہو، صرف تیرا نام۔ میں تیری جنت، دودھ کی نہریں، من وسلویٰ، حور و قصور، محلات وانعامات نہیں مانگتا۔ مجھے تیری ضرورت ہے۔ بس ایک بار مجھے اپنے آپ سے نواز دے اس کے بعد میری آنکھوں کا نور چھین لینا تا کہ صرف تیرا ہی نقش میری آنکھوں اور روح پر ہمیشہ کے لئے کندہ رہ جائے۔ پھر میری سانس کی ڈوری توڑ دینا تا کہ میری آخری سوچ، آخری فکر، آخری فہم، آخری ادراک، آخری ملاقات، آخری تصویر میرے شعور میں لاشعور تک تیری ہو صرف تیری! بس ایک بار اس پاگل پن کو سودا میں بدل کر میری زندگی لے کر مجھے ہمیشہ کی زندگی عطا کر دے!

میں نے تجھ سے تم کو مانگا ہے جدائی تو نہیں مانگی!
ہاں! موت مانگی ہے جدائی تو نہیں مانگی!

عارف محمود ایڈ

داعش کی دبے پاؤں آمد

دہشت گرد تنظیم کی پاکستان میں آمد کے آثار اور سیکیورٹی اداروں کی ذمہ داریوں کے حوالے سے خصوصی تحریر!

اگرچہ آرمی چیف کہہ چکے ہیں کہ داعش کو پاکستان تو کیا افغانستان تک پھٹکنے نہ دیا جائیگا مگر داعش کی آمد کے واضح اشارے وال چاکنگ کی صورت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ پاکستان میں شکست خوردہ دہشت گردوں کو داعش نے ایک مضبوط فریم ورک فراہم کیا ہے داعش نے اب تک صرف ایک غیر ملکی عسکری تحریک کو فرنچائز اور وسائل فراہم کئے ہیں۔ دہشت گرد تنظیم داعش نے پوری دنیا کو اپنے خوف میں مبتلا کر رکھا ہے اور آج صورتحال یہ ہے کہ پاکستان، افغانستان اور دیگر ممالک میں جو بھی دہشت گرد تنظیمیں گروہ اور گینگز ہیں وہ اپنی دہشت گردی کی دھاک بٹھانے کے لئے داعش سے اپنے الحاق کا دعویٰ کرتے ہیں۔ خاص طور پر داعش نے جس طرح سے افغانستان میں آگ اور خون کا بازار

گرم کیا اور جدید ترین خودکار ہتھیاروں سے عراق کے بعض شہروں میں قبضہ بھی کیا اس کی وجہ سے پوری دنیا میں داعش کی دہشت کے چرچے ہونے لگے حتیٰ کہ پاکستان بھر میں داعش (دولت اسلامیہ عراق وشام یا آئی ایس آئی ایس) کے سیاہ جھنڈے کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ شہری آبادیوں سے لیکر طالبان کے محفوظ ٹھکانوں تک اس جنگجو گروپ کا نشان (logo) اور نام تیزی سے دیواروں' پوسٹروں اور پمفلٹوں میں نمودار ہونے لگا ہے گزشتہ ماہ جنگجو کمانڈروں کے ایک گروپ نے دولت اسلامیہ کے خلیفہ ہونے کے دعویدار ابوبکر البغدادی کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کردیا حتیٰ کہ عراق اور شام میں داعش کی غیر معمولی کامیابیوں کے بعد ہزاروں میل دور بیٹھے سکیورٹی حکام اور جنگجو نیٹ ورک اس کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے انداز میں حساب چکانے کی تیاری کررہے ہیں۔ لہٰذا داعش کی ان کارروائیوں نے پاکستان میں جنگ سے تھکے ہوئے جنگجوؤں کے حوصلے بڑھادیئے ہیں تجزیہ نگاروں کے مطابق انہیں داعش کے برانڈ میں کئی فائدے نظر آرہے ہیں۔ یعنی رقوم کی جمع آوری نئی بھرتیاں مخالف گروپوں پر ممکنہ بالادستی اور سب سے بڑھ کر جہاد کا ایک نیا نمونہ یا ماڈل اگرچہ داعش پاکستان میں سرگرم عمل نہیں لیکن اس کی علامتی موجودگی بھی باعث تشویش ہے 1980ء میں القاعدہ کی تشکیل کے بعد انتہا پسند نظریات رکھنے والے کئی دوسرے گروپوں نے بین الاقوامی سطح کے حملوں کے لئے بڑی آسانی سے وسائل اور حمایت حاصل کرلی تھی۔ پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اینڈ سٹڈیز کے ڈائریکٹر محمد عامر رانا کے "بقول" یہ اہم نہیں کہ داعش پاکستان میں موجود نہیں اس نے

اندر کا خوف

ہرن کی رفتار تقریباً 90 کلومیٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ جبکہ شیر کی زیادہ سے زیادہ رفتار 58 کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ رفتار میں اتنے بڑے تفاوت کے باوجود بھی بیشتر موقعوں پر ہرن شیر کا شکار ہو جاتا ہے، کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ کیوں؟ کیونکہ جب بھی شیر کو دیکھ کر جان بچانے کیلئے ہرن بھاگتا ہے تو اس کے دل میں پکا یقین ہوتا ہے کہ شیر نے اسے اب ہرگز نہیں چھوڑنا، وہ شیر کے مقابلے میں کمزور اور ناتواں ہے اور اس سے بچ کر نکل سکتا۔ نجات نا پاسکنے کا یہ خوف اسے ہر لمحے پیچھے مڑ کر یہ دیکھنے کیلئے مجبور کرتا ہے کہ اب اس کے اور شیر کے درمیان کتنا فاصلہ باقی رہتا ہے۔ اور خوف کی حالت میں یہی سوچ ہرن کی رفتار پر اثر انداز ہوتی ہے، بس اسی اثناء میں شیر قریب آکر اسے دبوچ کر اپنا نوالہ بنالیتا ہے۔ اگر ہرن پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے کی اپنی اس عادت پر قابو پالے تو کبھی بھی شیر کا شکار نہیں بن پائے گا۔ بس کچھ ایسی ہی ہم انسانوں کی فطرت بن جاتی ہے کہ ہم ہر لمحے پیچھے مڑ مڑ کر اپنے ماضی کو تکتے اور کریدتے رہتے ہیں جو کچھ اور نہیں بلکہ ہمیں صرف ڈستا رہتا ہے، کتنے ہی ایسے پیچھا کرتے ہمارے وہم اور خوف ہیں جو ہمیں ناکامیوں کا نوالہ بناتے رہتے ہیں۔ اور کتنی ہی ہماری ایسی اندرونی مایوسیاں ہیں جو ہم سے زندہ رہنے کا حوصلہ تک چھینتی رہتی ہیں ہم کہیں ہلاک نا ہو جائیں کی سوچ کی وجہ سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے قابل نہیں بنتے اور نا ہی اپنی صلاحیتوں پر کبھی اعتماد کر پاتے ہیں۔

(مرسلہ: بتول فاطمہ۔ اسلام آباد)

کیا آپ چاہتے کہ

آپ، آپ کی اولاد، آپ کے بہن بھائی، عزیز و اقارب

- جھوٹ بولنے سے باز آجائیں۔
- تجارت اور ملازمت میں بدعنوانی اور بددیانتی سے باز آجائیں۔
- اپنے ملازموں سے حسن سلوک سے پیش آئیں۔
- زندگی کا ہر لمحہ نیکی اور پارسائی میں گزرے۔
- تعلیم و تعلم سے تابندار دین و ذہن نشین ہو جائیں۔
- والدین سے وہ سلوک کریں جو خدا پسند کرتا ہے۔

تو

سیارہ ڈائجسٹ کی شاندار روایات
کے پیش منظر میں پیش کیا جانے والا
دلکش، دلکشا اور زریں

اخلاق رسولﷺ نمبر

مطالعہ کیجیے

احادیث رسولﷺ کی روشنی میں

یہاں عسکریت کی حرکیات کو تبدیل کردیا ہے۔ ہمارے (جنگجو) گروپ جو بحران کا شکار تھے داعش نے انہیں ایک طاقتور فریم ورک دے دیا ہے جس نے ان کا بیانیہ بدل دیا ہے۔

پاک فوج کے سپہ سالار جنرل راحیل شریف واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ داعش کو نہ صرف پاکستان بلکہ افغانستان میں بھی نہیں پہنچنے دیا جائے گا تاہم حکومت کے ذمہ داران اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ مقامی گروپ اپنے مقاصد کے لئے داعش کا نام تبدیل کررہے ہیں مگر وزیر داخلہ چودھری نثار اور وزیر اطلاعات پرویز رشید اب بھی اپنے اس موقف پر قائم ہیں کہ داعش پاکستان میں کہیں موجود نہیں اور جب ایسے آثار ملے تو حکومت بھرپور کارروائی کرے گی جبکہ ملک بھر میں پولیس داعش کے پوسٹر اور نشان لگانے والوں کو گرفتار کررہی ہے۔ اس وقت حقیقت یہ ہے کہ غیر جہادی گروپ بھی داعش کے برانڈ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں کراچی کے سیکولر سیاستدانوں کے دعوے کے مطابق داعش کی وال چاکنگ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگجو مہاجرین کے بھیس میں شہر میں داخل ہورہے ہیں تاہم پشتون لیڈروں نے اسکی تردید کی ہے اسی کمیونٹی کے ایک لیڈر عبدالرزاق نے کہا "اس سراسر مبالغہ آمیز دعوے کا مقصد ہماری برادری کو بدنام کرنا ہے"۔ شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن آٹھویں مہینے میں داخل ہونے کو ہے اور داعش نے جنگجو لیڈروں کو اپنی خامیوں کا جائزہ لینے اور انہیں دور کرنے کی راہ دکھائی ہے۔ داعش کی وجہ سے ہی طالبان کے سابق ترجمان شیخ مقبول کی سربراہی میں 6 کمانڈروں نے اکتوبر میں دولت اسلامیہ کے ساتھ وابستگی کا اعلان کیا تھا اور علیحدہ ہونے والے اس گروپ کے ایک دوسرے سینئر لیڈر ابوزر خرسانی کا کہنا ہے کہ مجاہدین کی بہت بڑی تعداد ہمارے ساتھ ہے اور ہم جلد فیصلہ کریں گے کہ دولت اسلامیہ کی مدد کس طرح کی جائے۔ پشاور میں مقیم ایک طالبان کمانڈر نے اپنا نام صیغہ راز میں رکھنے کی شرط پر بتایا کہ علیحدگی کی وجہ طالبان میں پیدا ہونے والے اختلافات تھے انہوں نے یہ بھی کہا کہ بہت سے جنگجو ابوبکر البغدادی کے ریڈیو پیغام سے بڑے متاثر ہوئے ہیں حالانکہ وہ ملا عمر سے یکساں مختلف ہیں جو 13 سال پہلے افغانستان پر امریکی حملوں کے وقت سے غائب ہیں۔ اسی کمانڈر نے کہا "مجاہدین پوچھتے ہیں کہ ہم ایسے قائد کی پیروی کیوں کریں جس کی موجودگی پوری دہائی سے نامعلوم ہے۔ ہم نہیں جانتے وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں ان کا صرف عید کے موقع پر بیان جاری کردیا جاتا ہے۔"

مختصر یہ کہ داعش نے ابتک صرف ایک غیر ملکی عسکری تحریک کو فرنچائز اور وسائل فراہم کئے ہیں جس کا نام انصار البیت المقدس ہے جو صحرائے سینا میں مصری حکومت کے خلاف برسرپیکار ہے اور اس نے پاکستان میں ایسے کسی گروپ کو سرعام تسلیم نہیں کیا۔ شیخ مقبول نے اپنے ایک ویڈیو پیغام میں بھی کہا کہ انہوں نے گرمیوں میں عرب رابطہ کاروں کے ذریعے داعش تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ابھی تک ان کی طرف سے جواب نہیں ملا۔

بہرطور پاکستان میں داعش کے نظریئے سے نبرد آزما ہونے کے لئے ابھی وسیع پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ہے اور ایسے عسکری گروپ جو داعش برانڈ سے اپنی وابستگی جوڑ کر اپنا خوف پیدا کررہے ہیں ان کی بیخ کنی کے لئے ہماری حکومت اور عسکری اداروں کو منظم طریقے سے کام کرنا ہوگا تاکہ مستقبل میں دہشت گردی کے ایک بڑے خطرے سے نمٹا جاسکے۔ پاکستان زندہ باد پاک فوج زندہ باد۔

● ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

آنسو اور ایلچی

"نہیں، ان میں سب بہنوں سے بیٹی نہیں رہوں گی! آپ یہی کہیں گے نا کہ دونوں بہنوں سے ان غنڈوں نے زیادتی کی اور دونوں کو اس طرح بیدردی سے قتل کیا ہو گا جس طرح سکھوں نے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پہ ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے تھے!" ناہید نے بات کو سمجھتے ہوئے خود ہی کہا۔

دو دوستوں کی کہانی، جو سانحہ مشرقی پاکستان کا آنکھوں دیکھا حال بھی بیان کرتی ہے

یہ دوستوں کی کہانی ہے مگر ایسے دوستوں کی کہانیاں پرانی نہیں ہوتیں بلکہ ایسی کہانیاں تو ہمیشہ تازہ اور نئی رہتی ہیں بلکہ خود پرانے دوستوں کو بھی ہمیشہ زندہ اور پائندہ رکھتی ہیں۔ ایسی کہانیاں ہر آنکھ کے لئے باعث رونق و رعنائی، ہر دل کیلئے تازگی، روح اور ہر کان کے لئے تازہ نغمگی بکھیرتی رہتی ہیں۔ ہر پڑھنے سننے والا ایسی کہانی کو اپنی بپتا ہی سمجھتا ہے اور اپنی نئی نسل کے گوش گزار کرنا بھی انسانی فریضہ اور قومی امانت تصور کرتا ہے!

ان میں سے ایک دوست کا تعلق ڈھاکہ سے تھا جو کبھی مشرقی پاکستان کا صوبائی دارالحکومت تھا مگر آج کل وہی ڈھاکہ "بنگلہ دیش" کا کیپٹل اور پورے خطے کا ایک اہم بین الاقوامی شہر سمجھا جاتا ہے۔ عبداللہ الحسن اسی ڈھاکے کا جم پل تھا۔ اس کے

والد مولانا حسن الدین مسلم لیگ کے بانیوں اور محمد علی جناح کے پرستاروں میں سے تھے۔ عبداللہ الحسن جب مقابلہ کے امتحان میں شاندار کامیابی کے بعد ایک سول آفیسر بن گیا تو ڈھاکہ کے ایک اعلیٰ خاندان کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون (زینب) سے اس کی شادی ہوگئی۔ ملازمت کے آغاز کار ہی میں عبداللہ راولپنڈی کی ضلعی انتظامیہ کے ایک افسر مقرر ہوگئے تھے۔

حسن اتفاق سے عبداللہ الحسن کا سب سے پہلا ملاقاتی سلمان علی خان تھا' جو ایبٹ آباد کا ایک نوخیز اور پرجوش صنعت کار تھا' صنعت میں وہ بہت کامیاب اور اچھی شہرت کا مالک تھا' اس کے دل میں مشرقی پاکستان کی صنعتی ترقی کا خیال اور ارادہ ایک مدت سے پرورش پا رہا تھا۔ وہ ایک معقول سرمایہ سے چاٹگام میں انڈسٹری لگانے کے لئے کوشاں تھا مگر مغربی پاکستان کے صنعت کار اسے اس خطرناک ارادے سے منع کر رہے تھے اور نوکر شاہی کے پرزے بھی اس کی راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے! چارج لیتے ہی عبداللہ الحسن کے سامنے بھی سلمان کا کیس سب سے پہلے پیش ہوا' گہرے مطالعہ اور غور کے بعد عبداللہ الحسن بھی انکار اور التوا کی طرف مائل ہوگیا اور پیش ہو۔تب ہی سلمان کو باز رہنے کا ہی مشورہ دیا مگر سلمان نے تقریباً روتی سی صورت بنا کر کہا کہ مجھے نفع یا نقصان کی پروا نہیں ہے' میں تو اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں کا خیرخواہ ہوں اور ان کی خوشحالی میں حصہ ڈالنا چاہتا ہوں' آپ جو چاہیں کریں مگر میں اس ارادے سے باز آنے والا نہیں! کوئی نہ کوئی تو ایسا افسر آئے گا جو مجھے چاٹگام میں انڈسٹری لگانے کا اجازت نامہ دے ہی دے گا' یہ دیکھ اور سن کر عبداللہ الحسن نے سلمان علی خان کی درخواست منظور کرتے ہوئے اسے اجازت نامہ جاری کر دیا!

اجازت نامہ ملتے ہی اگلے دن ہی سلمان علی خان پہلی فلائٹ سے ڈھاکہ پہنچ گیا' چاٹگام کی فضا اسے بہت موافق اور موزوں نظر آئی ایک دو بنگالی مسلم لیگی اسے ایسے مل گئے جو اس کے عزم و ارادہ سے نہ صرف بے حد خوش ہوئے بلکہ ہر قسم کی عملی مدد کا بھی اسے یقین دلایا' مقامی لوگ یہ جان کر بے حد خوش تھے کہ وہ اپنے ایسے بنگالی ہنرمند اور واقف کار کو اپنا برابر کا حصہ دار اور بااختیار ساتھی بنائے گا جو اپنی مرضی سے بنگالی کاریگر اور کارکن بھرتی کر سکے گا لیکن سرِدست اگر وہ برابر کا سرمایہ بھی مہیا نہ کر سکا تو بھی کوئی بات نہیں' کام چلنے پر مالی کمی بیشی کا حساب بعد میں ہوتا رہے گا۔

چاٹگام کے ایک ضلعی افسر محمود الحسن نے بھی سلمان کی بہت مدد کی مگر یہ بتائے بغیر کہ اس کا چھوٹا بھائی عبداللہ الحسن مغربی پاکستان میں کہیں ترقیاتی سروس پر لگا ہوا ہے اگرچہ سلمان پر یہ حقیقت واپس آ کر کھل گئی تھی! وہ تین چار ہفتے کے بعد جب واپس آیا تو عبداللہ کو بڑی خوشی سے جا کر ملا اور اسے اپنی کامیابی کی سرسری باتیں اور واقعات سنائے اور بے حد خوشی کا مظاہرہ کیا' عبداللہ الحسن کو مزید بات چیت کے بہانے اپنے گھر دعوت پر بلایا' یوں یہ پہلی ملاقات دونوں گھرانوں کی مخلصانہ اور پائیدار دوستی کی بنیاد ثابت ہوئی!

سلمان کی بیگم (ناہید) ایک پڑھی لکھی خاتون اور معزز کشمیری خاندان سے تھی' کشمیری رنگت اور حسن و جمال کی دلکش مثال بھی تھی۔ عبداللہ کی بیگم زینب بھی بنگالی حسن و جمال کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ جس طرح عبداللہ اور سلمان ایک دوسرے کے دل میں اتر گئے تھے اسی طرح زینب اور ناہید بھی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئیں بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ کشمیری چاندنی اور بنگالی ساحرہ یک جا ہوگئیں۔ بلکہ بلیک بیوٹی کشمیری حسینہ کے دل و جان سے گویا

چیک کر رہ گئی تھی۔ یہ دونوں خاندان پاکستانی اور اسلامی اخوت کا روشن اور زندہ نمونہ بن گئے تھے۔ ان دونوں شوہروں اور دونوں بیویوں کے باہمی تعلقات میں اخلاص و محبت کی بھی لوگ مثالیں دیتے تھے اور سب کے لئے یہ صورت و کیفیت قابل رشک بن گئی تھی! سلمان اور عبداللہ ایک ہی جامع مسجد میں نماز جمعہ بھی ادا کرتے نظر آتے تھے۔ اسی طرح زینب اور ناہید بھی ایک ساتھ مارکیٹ جاتی تھیں اور لوگ انہیں دل لگی کے طور پر "سفید و سیاہ حسن کا قابل رشک جوڑا" کہتے تھے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے اتحاد و اخوت کی بھی ناقابل فراموش علامت تھا!!

پھر دنیا نے دیکھا کہ تھوڑے سے عرصہ میں ہی سلمان نے چاٹگام میں انڈسٹری کا ایک جال بچھا دیا اور بنا بہت سا سرمایہ گویا مشرقی پاکستان منتقل کر دیا تھا لیکن اہم اور دلچسپ بات یہ تھی کہ بیشتر کارخانوں کا انتظام اس نے اپنے دوست عبداللہ اور محمود کے مشورہ سے مقامی مشرقی پاکستانیوں کے سپرد کر دیا تھا اور سب کو یہ حکم دیا تھا کہ مقامی مزدوروں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک سے کام لیا جائے' کسی سے زیادتی نہ ہو اور کسی کی حق تلفی ہرگز نہ کی جائے! چنانچہ چاٹگام کے علاوہ ڈھاکہ وغیرہ میں بھی (سلمان انڈسٹری) نے بہت جلد شہرت و ترقی حاصل کر لی اور ہر جگہ اس کی مثالیں دی جانے لگیں تھیں! خصوصیت کے ساتھ سلمان انڈسٹری نے مشرقی پاکستان کی نقد آور فصل پٹ سن کی مصنوعات اور برآمدات کو دنیا بھر میں پاپولر بنا کر مشرقی پاکستان کے خزانے بھر دیئے تھے۔ حتیٰ کہ دوسرے بنگالی خصوصاً ہندو تاجر اس پر حسد کرنے لگے تھے اور قسم قسم کی سازشیں اور پراپیگنڈے بھی شروع ہو گئے تھے' شروع میں ہی سلمان نے اپنے ایک عزیز فرحان علی کو چاٹگام کی ایک فیکٹری کا جنرل منیجر بنا دیا تھا جسے بدخواہ دشمنوں نے نشانے پر رکھ لیا تھا اور اس کےخلاف کاروبار میں ہیر پھیر کرنے کے جھوٹے الزامات اور تہمتیں بھی عام کر دی تھیں مگر تمام الزامات ہمیشہ جھوٹے ثابت ہوتے رہے تھے۔

لیکن عوامی لیگ کے نمائندوں اور مکتی باہنی کے درندوں نے فرحان علی کو ہٹ لسٹ پر رکھ لیا تھا۔ اسی طرح چاٹگام اور ڈھاکہ میں (سلمان انڈسٹری) کے تمام کارخانوں پر بھی سب نے نظر رکھ لی تھی!

ایک شام عبداللہ الحسن اور اس کی بیوی زینب سلمان علی خان کو الوداع کہنے کے لئے ان کے گھر آئے اور بتایا کہ ایمرجنسی میں اسے آج ہی رات کو کراچی سے مشرقی پاکستان کے لئے فلائٹ پکڑنا ہے اور کل صبح ہی ڈھاکہ کے کمشنر کا چارج لینا ہے اس لئے وہ اس عجلت میں اس الوداعی ملاقات پر معذرت خواہ بھی ہیں!

فرحان علی نے سلمان انڈسٹری کو دونوں شہروں میں خوب سنبھالا اور مقامی کارکنوں اور مزدوروں کو بھی پوری طرح خوش اور مطمئن رکھا حتیٰ کہ اپنی دونوں پٹ سن کی شوقین اور ماہر بیٹیوں کو دو ایسے بنگالی نوجوانوں سے بیاہ دیا جو چاٹگام میں سلمان انڈسٹری کے قابل اور بہت مقبول انجینئر تھے۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا فرید جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں پڑھتا رہا تھا۔ جہاں محمود الحسن کی اکلوتی بیٹی (سارہ) بھی پڑھتی تھی۔ وہ دونوں انجینئر بن کر نکلے اور پٹ سن کی صنعت کو ترقی دینے کی اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ جانا چاہتے تھے فرید امریکہ سے واپسی پر سرگودھا یا لائل پور میں پٹ سن کی کاشت اور اس کی مصنوعات کو ترقی دینے کا عزم بھی رکھتا تھا۔ دونوں کے والدین نے فرید اور سارہ کی شادی کر دی تا کہ ایک ساتھ آرام سے امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

وہ جب فارغ ہو کر واپس پاکستان آنے لگے تو انہیں والدین کی طرف سے وہیں رکنے اور محنت

کر کے ڈالر کمانے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ دونوں نے خوب ڈالر کمائے مگر واپس آنے کی اجازت ملنے کے منتظر ہی رہے۔!

دراصل مجیب الرحمن کے چھ نکات نے علیحدگی کی بنیاد رکھ دی تھی جو 1970ء کے الیکشن کے بعد حقیقت بن کر سامنے آ گئی! اندرا نے دنیا کے لیڈروں سے ہندو جارحیت کا لائسنس حاصل کر کے مکتی باہنی کے روپ میں اپنی ہندو فوج مشرقی بنگال میں داخل کر دی پھر وہ تباہی اور رسوائی سامنے آئی جو دنیا کو تو یاد ہے صرف پاکستان کے لیڈر بھول گئے ہیں!

عبداللہ الحسن چونکہ مغربی پاکستان کی سرزمین کے حسین و دلفریب مناظر سے بہت متاثر تھا اور یہاں کے لوگ بھی اسے بہت اچھے لگے تھے اس لئے اس نے اپنی بیگم کے ہمراہ ایک بار پھر مغربی پاکستان آنے اور قابل دید مقامات و مناظر کی سیر کا ارادہ کیا تھا چنانچہ اپنے دوست سلمان علی خان کی دعوت پر یہ خوبصورت مناظر دیکھنے اور مغربی پاکستانی دوستوں اور بھائیوں سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر سلمان علی خان نے اسے تاکید کی کہ وہ کوئی جگہ نہیں چھوڑے گا' تمام قابل دید مقامات اور نوادرات کے علاوہ اپنی بیگم کو مغربی پاکستان کی تمام نعمتوں سے لطف اندوز کئے بغیر واپس نہیں جائے گا مگر ان کے تمام اخراجات سلمان انڈسٹری کے ذمہ ہوں گے!

عبداللہ الحسن اور اس کی بیگم زینب کے لئے یہ دورہ ایک ناقابل فراموش واقعہ اور حسین و جمیل مناظر زندہ جاوید یادیں بن گئے تھے۔ اسی لئے واپس ہوتے وقت دونوں نے سلمان علی خان اور اس کی بیوی ناہید کو بھی جلد سے جلد ڈھاکہ آنے کی دعوت دیدی اور مشرقی پاکستان کی نعمتوں اور قابل دید مناظر سے لطف اندوز ہونے کی تاکید کر دی تھی مگر پھر قومی اور بین الاقوامی سازشوں نے اس سیر کا موقع نہ دیا اور سب کچھ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا!

سلمان علی خان اور اس کی بیگم کو مشرقی پاکستان کی سیر سے محرومی کا غم تو تھا مگر اس سے کہیں زیادہ ڈھاکہ اور چاٹگام میں "سلمان انڈسٹری" کے احوال و انجام کی پریشانی تھی۔ محمود الحسن تو اپنی بیوی کے ہمراہ اپنی بیٹی سارہ اور داماد فرید کے پاس امریکہ چلا گیا تھا مگر سلمان کو رشتہ دار فرحان علی خان کے گھرانے اور سلمان انڈسٹری کے احوال و انجام کی خبر دینے والا عبداللہ الحسن کے سوا اور کوئی نہ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے بھائی محمود کی طرح سلمان انڈسٹری سے پوری طرح واقف اور باخبر نہ ہونے کے باعث کوئی تسلی بخش اطلاع فراہم کرنے سے عاجز تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ شیخ مجیب الرحمن کی حکومت ایسے لوگوں کی حرکات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی جو مغربی پاکستان رہ کر گئے تھے یا پاکستانیوں سے حسب سابق روابط رکھے ہوئے تھے مگر بایں ہمہ عبداللہ الحسن نے اپنے دوست سلمان علی خان کو پاسپورٹ پر ہی سہی جلد سے جلد بنگلہ دیش کی سیر کے لئے ڈھاکہ آنے کی پھر دعوت دے ڈالی تھی۔

سلمان علی خان کو تو سیر کے بجائے اپنی انڈسٹری کے انجام سے آگاہ ہونے اور اپنے عزیز فرحان علی خان کے گھرانے کی زیادہ فکر تھی اس لئے وہ اپنی بیگم ناہید کے ہمراہ ڈھاکہ جانے کے لئے فوراً تیار ہو گیا تھا۔ چونکہ فرحان کی بیوی شاہدہ ناہید کی بہت قریبی رشتہ دار تھی اس لئے اب سلمان سے زیادہ زینب ڈھاکہ جانے کیلئے بیقرار تھی!!

چونکہ سلمان خان کے رشتہ دار فرحان علی خان مشرقی پاکستان میں موجود "سلمان انڈسٹری" کے نگران تھے اس لئے اس گھرانے کی خبر گیری کی فکر دونوں میاں بیوی کے دلوں میں زیادہ تھی' کاروبار کے نشیب و فراز کی اطلاعات بھی فرحان خان ہی بھیجتے تھے۔ لیکن جب سے حالات خراب ہوئے اور

سقوط ڈھاکہ کے بعد ہندو مکتی باہنی کا تسلط قائم ہوگیا تھا تو صحیح معلومات نہ ملنے کی وجہ سے ان میاں بیوی کی پریشانی دوچند ہوگئی تھی۔ عبداللہ الحسن اور اس کا دوسرا بھائی عبدالرحمٰن الحسن بھی چاٹگام اور ڈھاکہ میں کاروبار سے زیادہ واقف نہ تھے۔اس لئے سلمان خان کو صحیح احوال بتانے سے دونوں بھائی بھی عاجز تھے۔عبداللہ الحسن کا چھوٹا بھائی محمود الحسن کافی حد تک واقف تھا مگر اپنی دو بیٹیوں اور ان کے دونوں بنگالی شوہروں کے قتل کے بعد وہ میاں بیوی بھی اپنی بیٹی سارہ اور داماد فرید کے پاس امریکہ چلے گئے تھے اس لئے آگاہی کے تمام راستے بند تھے!

ناہید کی بہن شاہدہ فرحان خان بھی کچھ بتانے کے قابل نہ رہی تھی ایک تو غم واندوہ نے کسی قابل نہ چھوڑا تھا دوسرے وہ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہ تھی اسی وجہ سے سلمان کی بیوی ناہید اپنی قریبی رشتہ دار کی زیادہ شاکی تھی۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد سلمان خان کو اپنا اور اپنی بیوی کا پاسپورٹ بنوانے اور پھر ویزہ حاصل کرنے میں کافی وقت پیش آئی تھی مگر نئے حالات اور نئی دنیا میں اپنے پرانے دوستوں اور قدیم کاروبار سے آگاہی کے علاوہ مشرقی پاکستان کے بجائے اب بنگلہ دیش کے دورے اور قابل دید مقامات کی سیر وتفریح میں بھی دونوں کے لئے بہت کشش تھی۔

سلمان علی خان ڈھاکہ متعدد بار پہلے آچکا تھا' شہر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ محمد پورہ میں اسے وہ مکان بھی تمام آس پاس کی تفاصیل کے عدد و نمبر اور پتے سمیت اچھی طرح یاد تھا جو اس نے کرایہ پر لے رکھا تھا اور جس میں وہ کئی کئی ہفتے مسلسل قیام کیا کرتا تھا' اس کے پڑوس والے متصل مکان میں عبداللہ الحسن کا سب سے بڑا بھائی عبدالرحمٰن حسن امدین رہتا تھا جو صوبائی سیکرٹریٹ میں ڈپٹی سیکرٹری ہوا کرتا تھا۔ پروگرام کے مطابق سلمان نے ویزہ پہنچتا تھا اور پھر وہاں سے چاٹگام جانا تھا جہاں عبداللہ الحسن اپنے اہل وعیال کے ساتھ مقیم تھا۔

جیسے جیسے ڈھاکہ کا ہوائی اڈہ قریب آرہا تھا سلمان خان اپنے دیکھے ہوئے مقامات اور گلی کوچوں کے علاوہ اپنے بنگالی دوستوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے لئے بیقراری محسوس کررہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پانچ چھ سال بڑی مدت ہے ڈھاکہ اب آزاد بنگلہ دیش کا دارالحکومت ہے اب تو اس کے نقشے ہی بدل چکے ہوں گے۔ اب تو شاید تبدیلیوں کے باعث ہوائی اڈے کی عمارت کو بھی وہ نہ پہچان پائے کیونکہ عبداللہ الحسن نے اسے بتایا تھا کہ صدر ضیاء الرحمٰن نے ہوائی اڈے کی عمارت میں خاص تبدیلیاں اور نئی تعمیرات کروائی ہیں اور اب یہ اڈہ انہی کے نام سے موسوم ہے۔ جیسے ہی اعلان ہوا کہ چند لمحوں بعد جہاز ضیاء الرحمٰن بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترنے والا ہے تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی وہ اترتے ہوئے جہاز سے ہی بڑے غور سے ہوائی اڈے کا نظارہ کرتا جارہا تھا' وہی پرانا رن وے' وہی ساز وسامان' بس صرف عمارت کا ایک نیا حصہ نامانوس دکھائی دیا جو سلمان نے پہلے نہیں دیکھا تھا' قلیوں اور مزدوروں کے لباس سے فقر وافلاس پہلے سے بھی زیادہ نمایاں نظر آرہا تھا۔ اس کے اس خیال کو پہلی ٹھیس یہ لگی کہ عوامی لیگ کے انتخابی نعروں کے مطابق کہ اگر صرف پانچ سال پٹ سن کا زرمبادلہ مشرقی بنگال پر خرچ ہوجائے تو سڑکیں اور عمارات سونے کی نظر آنے لگیں۔ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اسے صرف دو نئی تبدیلیاں نظر آئیں جن کا وہ عادی نہ تھا ایک تو پاسپورٹ پر امیگریشن والوں سے ٹھپا لگوانا پڑا اور دوسرے روپے کی جگہ وہاں پر ٹکا چلتا نظر آیا۔ اس نے سو ڈالر کے ٹکے خریدے تو اس کی جیب دو پرس دونوں نوٹوں سے بھر گئے!

مسافر لاؤنج سے باہر آیا تو ایک طرف آٹو

رکشاؤں کی لائن لگی تھی تو دوسری جانب مینول رکشاؤں کی لمبی قطاریں لگی تھیں، ٹیکسیاں بہت کم نظر آئیں اسے یوں لگا جیسے وہ پرانے لائل پور یا ملتان کے ہوائی اڈے پر اترا ہے مگر یہ تو اب ایک غیرملکی دارالحکومت کا ہوائی اڈہ تھا، ایک رکشا ڈرائیور سے اس نے انگریزی میں بات کی تو وہ آگے سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرنے لگا، بالکل ویسے ہی جیسے وہ کبھی کبھی مشرقی پاکستان آیا کرتا تھا تو رکشا یا ٹیکسی ڈرائیور سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی نما اردو میں بات چیت ہوتی تھی۔

ہوائی اڈے سے محمد پورہ جاتے ہوئے رستے میں وہ تمام مقامات کے نام لے کر اپنی بیوی کو بتاتا جارہا تھا جن سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ رکشا ڈرائیور یہ خیال کررہا تھا کہ یہ کوئی پرانا پاکستانی بیوروکریٹ ہے جو بنگالیوں پر اسی طرح حکومت کرتا رہا تھا جس طرح کبھی گورے بیوروکریٹ یہاں حکومت کرتے تھے۔ رستے میں بتی والے چوک پر رکشا رُکا تو ڈرائیور نے ٹریفک کے سپاہی کو بنگالی میں کچھ ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں سے یہ سمجھایا کہ یہ کوئی تمہارا پرانا "صاحب" ہے۔ وہ سپاہی آگے آیا، سلام کیا اور بخشیش کا طالب ہوا۔ سلمان خان سب کچھ سمجھ رہا تھا، اس نے پچاس ٹکے والا نوٹ ٹریفک کے سپاہی کو تھما دیا، وہ خوشی سے سیلوٹ مارتا ہوا دور جا کھڑا ہوا، سلمان اپنی بیوی کو بتا رہا تھا کہ جس طرح پردیسی انگریز بیوروکریٹ مقامی لوگوں سے ایک غیرملکی آقا کا سا سلوک کرتے تھے اسی طرح مغربی پاکستان کی نوکر شاہی کے نتھے [illegible] نے بھی [illegible] انگریزوں کی طرح عوام کے ساتھ وہی روش اور وہی سلوک جاری رکھا تھا۔ [illegible] مشرقی پاکستان کے لوگ [illegible] سابق غیرملکی بیوروکریسی [illegible] جو پاکستانیوں [illegible]

کسی کے بس میں نہ رہا تھا۔ نفرت کا ایک ایسا الاؤ تھا جس نے اسلامی بھائی چارے کو جلا کر خاکستر کردیا!

محمد پورہ میں عبدالرحمٰن حسن الدین کے گھر والے اپنے پاکستانی مہمان کے استقبال کے لئے تیار بلکہ بیقرار تھے۔ اس کی بیوی نے ناہید کا بڑے تپاک سے استقبال کیا، سلمان خان انگریزی میں بات کرتا تھا اور گھر والے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتے جاتے تھے۔ بیوی نے اسے ٹوکا کہ اردو میں بات کرو، یہ جو اردو بول رہے ہیں۔ سلمان خان نے بیوی کو بتایا کہ یہاں ابھی اردو بولنا مناسب نہیں کیونکہ عوامی لیگ کے ہندو کارکن فوراً نفرت اور حقارت کے جال بننے لگیں گے یہ عوامی لیگی ہندو ورکر پاکستانیوں سے اتنی نفرت شاید نہ کرتے ہوں جتنی انہیں اردو سے چڑ ہے یہ لوگ اردو کے رواج کو خطرناک تصور کرتے ہیں۔ اب تک جو دوست بنگلہ دیش سے ہوکر گئے ہیں انہوں نے مجھے یہی بتایا ہے!

چونکہ وقت کافی تھا اور سلمان خان اپنی بیوی کے ہمراہ جلد سے جلد چاٹگام پہنچنا چاہتا تھا اس لئے چائے کا دور چلنے کے بعد اس نے عبدالرحمٰن حسن الدین سے کہا کہ ہوائی جہاز میں چاٹگام کے لئے دو سیٹیں کسی طرح بک کروادیں۔ اس کام کے لئے وہ پہلے ہی بنگلہ دیش ایئرلائنز میں اپنے ایک دوست سے اس کی بات کرچکا تھا اس لئے سیٹیں حاصل کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور شام پانچ بجے سے پہلے ہی سلمان خان اور اس کی بیوی چاٹگام میں اپنے بنگلہ دیشی دوست عبداللہ حسن کے گھر پہنچ چکے تھے!

سلمان خان چاٹگام سے پوری طرح واقف تھا اس لئے سرشام ہی اپنے بنگلہ دیشی دوست کی کار لے کر اپنی بیوی کو گھمانے نکل گیا۔ شہر کے چند ایک علاقوں میں نئی کالونیوں کے اضافے اور بعض [illegible] عمارات کے علاوہ [illegible] چاٹگام میں کوئی [illegible] ۔ وہ دل ہی دل میں [illegible]

لاہور، پشاور، کراچی، حیدرآباد اور راولپنڈی، اسلام آباد جیسے شہروں میں نئی آبادیوں کی بھرمار اور جگہ جگہ بلند و بالا پلازوں کا تقابل ڈھاکہ اور چاٹگام سے کررہا تھا۔ اور عوامی لیگ کے ہندو کارکنوں اور لیڈروں کے اس گمراہ کن پراپیگنڈے کو یاد کررہا تھا جس نے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے دلوں میں مغربی پاکستانیوں کیخلاف نفرت کی آگ بھڑکا دی تھی۔ وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا:

''اسی چاٹگام کے عام جلسوں میں، میں نے شیخ مجیب کی دھواں دھار تقاریر کی تھیں جو سنار بنگلہ کے گمراہ کن نعرے سے مشرقی اور مغربی پاکستان میں منافرت پیدا کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا رہا تھا۔ اس نے ہر بنگالی کو یہ باور کرادیا تھا کہ پٹ سن کا تمام زرمبادلہ اسلام آباد پر خرچ ہورہا ہے۔ اسلام آباد کی پکی سڑکوں پراسے بنگلہ دیشی پٹ سن کا رنگ و بو ہر طرف بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اگر صرف پانچ سال تک یہ پٹ سن کا سونا مشرقی پاکستان پر خرچ کیا جائے تو بنگال کی قسمت بدل جائے! مغربی پاکستان سنار بنگلہ کولوٹ کر کھا گیا ہے اس لئے ان لٹیروں سے نجات میں ہی ہماری بہتری ہے۔''

''مگر مجھے تو چاٹگام پنجاب کا کوئی دیہات یا دیہاتی شہر لگا ہے، ہر طرف جھونپڑیاں، میلے رکشے اور مزدوری کے انتظار میں کھڑے غریب مزدور نظر آئے جن کے چہروں پر سرشام مایوسی و ناداری کے سوا کچھ نظر نہیں آتا!'' سلمان کی بیوی ناہید نے کہا۔

''لیکن ناہید! یہ وہ غیور مسلمان ہیں جن کے دل اخلاص اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں، یہ بڑے جری اور خوددار لوگ ہوتے ہیں! اور جب کسی کے دل میں انہیں اخلاص و ایمان نظر آجائے تو اس پر دل و جان سے فدا ہوجاتے ہیں! یقین نہ آئے تو جناب محمد اعظم خان سابق گورنر مشرقی پاکستان کی تاریخ و سوانح دیکھ لو!'' سلمان نے اپنی بیوی کے خیالات کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا!'' ناہید نے کہا۔

''یہ وہ لوگ ہیں جن کے اتحاد اور جذبات سے ہماری نوکر شاہی اور وڈیرہ شاہی والی جاگیردارانہ اور مغرب پرستانہ قیادت لرزہ براندام ہوجاتی تھی۔ یہی دو ٹولے ہیں جنہوں نے قائداعظم کا پاکستان دولخت کیا ہے۔ انہوں نے بنگالی مسلمانوں کو نہ سمجھنے کی کوشش کی اور نہ کبھی اپنانے کی سوچی، ہماری نوکر شاہی اور جاگیردار قیادت کے حقارت آمیز روش نے بنگالی مسلمان کو عوامی لیگ میں چھپے ہوئے مہاسبھائی ہندوؤں کے چنگل میں پھنسادیا۔ ورنہ مسلم لیگ بنانے والے اور قرارداد لاہور پیش کرنے والے بنگالی مسلمان ہم سے کبھی الگ نہیں ہوسکتے تھے!'' سلمان خان نے حقائق کا پردہ چاک کرتے ہوئے اپنی بیوی کو سمجھایا، گاڑی کا بنگالی ڈرائیور اچھی خاصی اردو جانتا تھا مگر ان میاں بیوی کو اس اندازہ نہ تھا سلمان خان کی باتیں سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگا: ''ساب جی! آپ ٹھیک بولو ہو، ہم نے تیس سال وفاقی حکومت پاکستان کا ملازمت کیا، ہم افسر لوگ کے ساتھ رہا، وزیر لوگ لاہور اور کراچی سے آتا تھا ہم ان کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا وہ ہم کو ماں بہن کی گالی دیتا اپنی بولی میں ہم رویا غصہ کیا مگر یہ بے اجت کرتا تھا!''

اب وہ دوبارہ محمد پورہ میں عبدالرحمن حسن کے مکان کے سامنے تھے ڈرائیور نے اتر کر کار کا دروازہ کھولا اتنے میں عبدالرحمن اور اس کی بیوی استقبال کے لئے نکل آئے تھے ان کے پیچھے تمام گھر والے بھی باہر آگئے تھے۔ ''آپ کو چاٹگام پسند آیا بھابی صاحبہ!'' عبدالرحمن نے ناہید سے بے تکلفی کے انداز میں پوچھا۔

''بھائی جان! بہت مزہ آیا۔ سلمان تو یہاں کے چپے چپے سے واقف ہیں تمام قابل دید مقامات

کی سیر کرائی اور ہر مقام سے متعارف کرایا۔"

"مگر میں صرف ڈھاکہ اور چاٹگام کے چپے چپے سے واقف ہوں باقی سنار بنگلہ تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں!" سلمان نے کہا۔

"ہم گھومتے گھومتے چاٹگام یونیورسٹی کی طرف نکل گئے تھے۔ بڑے خوبصورت مناظر دیکھے' چھوٹی بڑی پہاڑیوں پر مشتمل کیمپس کا وسیع و عریض علاقہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ وہاں ایک پروفیسر جوڑا میاں بیوی سیر کرتے ہوئے نظر آگئے۔ سلمان نے انہیں پہچان لیا جونہی ہماری گاڑی سڑک کے کنارے ایک طرف ہو کے رُکی اور سلمان نے آواز دی تو دونوں میاں بیوی لپک کر ان سے لپٹ گئے آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو میاں بیوی کی آنکھوں سے بہے جا رہا تھا پھر وہ ہمیں اپنے بنگلے میں لے گئے اب تو وہ بہت سینئر پروفیسر ہو گئے ہیں" ناہید نے روئیدادِ سفر بیان کرتے ہوئے کہا۔

"سلمان خان! یار وہ فدا تو نہیں تھا وہی جو باٹنی کا لیکچرار ہوتا تھا اور مجھے کاغذ کا ایک اور کارخانہ لگانے کا مشورہ دیا کرتا تھا!" عبداللہ نے یقین کے انداز میں سوال کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں یار وہی تھے ڈاکٹر فدا حسن اور ان کی مغربی پاکستانی بیوی پروفیسر ممتاز بیگم جن نے والد بڑے جذبے سے اپنا تمام سرمایہ لے کر مشرقی پاکستان آگئے تھے اور یہاں امپورٹ ایکسپورٹ کے وسیع کاروبار کے علاوہ پٹ سن کی مصنوعات کی فیکٹری بھی لگائی تھی' اس کی تین بیٹیاں تھیں اور اس نے ان تینوں کی شادیاں مشرقی پاکستانی نوجوانوں سے کر دی تھیں!" سلمان نے اپنائیت میں ہی جواب دیا اور پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"بیچارا حسین علی چودھری! سرگودھا سے تھا' بڑے کھاتے پیتے صنعت کار گھرانے سے تھا' مجھے اس نے کئی بار سرگودھا بلایا تھا اور اپنے کارخانوں کی سیر بھی کرائی تھی پھر ایک بار وہ میرے ساتھ چاٹگام آیا تو اسے جگہ ایسی پسند آئی کہ اپنے بھائیوں سے اجازت لے کر اور اپنے حصے کا تمام سرمایہ لے کر مشرقی پاکستان آگیا تھا تاکہ یہاں کی صنعت کاری کو ترقی دے سکے!" عبداللہ الحسن نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مگر مکتی باہنی کے ہندو درندوں نے جن لوگوں کو اپنی ہٹ لسٹ میں سرفہرست رکھا ہوا تھا ان میں وہ بھی میرے ساتھ شامل تھا....." سلمان خان کہتے کہتے رُک گیا۔

"پھر کیا ہوا؟ واپس چلے گئے اپنے داماد اور بیٹی کو چھوڑ کر!؟" ناہید نے پھر قدرے گھبراہٹ میں دریافت کیا۔

"بس! رہنے دو! پھر کبھی بتاؤں گا! کل ہم پھر سندر بن کی سیر کریں گے!" سلمان خان نے بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں تو آج ہی پوچھ کے رہوں گی! آپ ہمیشہ ٹالتے رہتے ہیں! عبداللہ بھائی آپ بتایئے نا!" ناہید نے پرزور اصرار کے ساتھ احتجاج کے انداز میں درخواست کی۔

"بھابی! یہ ایک المناک بلکہ شرمناک کہانی ہے! یہ اس قوم کی کہانی ہے جو 1857ء سے آج تک ہوش میں نہیں آسکی! سن ستاون کا المیہ ایک ہولناک بلکہ عبرتناک قیامت تھی! یہ ایک ایسا تھپڑ تھا جو انگریز کے کھلے اور ہندو کے خفیہ ہاتھ سے مسلمان قوم کے منہ پر رسید کیا گیا تھا' اس وقت سے یہ قوم زمانے میں چکرائے ہوئے ہے۔ ابھی تک نہیں سنبھل سکی! چالاک اور مکار ہندو کے ہاتھوں شکست پر شکست کھائی جا رہی ہے مگر سنبھل نہیں پا رہی! جیسے اس کا نہ اللہ پر ایمان رہا ہے اور نہ اپنے دست و بازو پر اعتماد ہے! جو قوم ایمان و اعتماد کی دولت سے محروم ہو جائے اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو مشرقی پاکستان

میں مسلمانوں کا ہوا' مکروفریب اور دغابازی کا ایک ایسا چکر چلا' ایک ایسی آندھی چلی کہ جب وہ تھمی تو چمن لٹ چکا تھا! دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ اس قوم کو نہ دھوکے بازوں کے مکروفریب کا پتہ ہے اور نہ چمن لوٹنے والوں کی پہچان ہے!'' عبداللہ نے بڑے جوش اور درد کے ساتھ ناہید پر بات واضح کرنے کی کوشش کی!

''بھائی صاحب! آپ نے لمبی بات شروع کردی ہے میں تو پروفیسر فداحسن کے سسر اور پروفیسر ممتاز بیگم کے والد کی بات کررہی تھی!''

''ہاں بھابی! یہ بھی اسی لرزہ خیز کہانی کا ایک منظر ہے! مکتی باہنی کے ہندو غنڈوں نے چودھری حسین علی کو ہٹ لسٹ پر رکھا ہوا تھا! ایک شام ان کے دفتر پر ان غنڈوں نے دھاوا بول دیا اور الزام لگایا کہ وہ اپنے کارخانے کسی غیرملکی کے قبضے میں دے کر اور سرمایہ لے کر مغربی پاکستان فرار ہورہے ہیں حالانکہ وہ تو اپنا سرمایہ مغربی پاکستان سے لے کر آئے تھے تاکہ مشرقی پاکستان کی صنعت کاری کو بام عروج تک پہنچادیں..... پھر انہیں اذیتیں دے کر قتل کردیا گیا۔ مسخ شدہ لاش پنکھے سے لٹکادی گئی اور ساتھ ہی ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا جس پر قاتل کا نام تھا اور یہ مقتول کے وفادار اور محنتی انجینئر داماد کا نام تھا! فیکٹری میں ایک ہولناک سناٹے کا عالم تھا، کوئی یقین نہیں کررہا تھا! داماد جو کہ ڈپٹی جنرل منیجر بھی تھا اور یہ طے تھا کہ چودھری صاحب نے یہ کارخانہ داماد اور بیٹی کے نام کردیا ہوا ہے..... یہاں آکر عبداللہ حسن الدین رُک گئے۔

''بھائی صاحب بتایئے نا پھر یہ ہوا؟!'' ناہید نے بیقراری سے پوچھا۔

''آگے کی بات تو شاید آپ نہ سن سکیں یا شاید میری زبان پر نہ آسکے'' عبداللہ نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھائی میں سنوں گی' آپ بھی سلمان خان کی طرح مجھے ٹالنا چاہتے ہیں!'' ناہید نے کہا۔

''تو پھر سنیئے! اور دل تھام کر سنیئے! چوہدری کا داماد بھی اگلے روز اپنے گھر میں مُردہ پایا گیا' پتہ چلا کہ کسی نے زہر دیا ہے' زہر کا الزام بیوی پر تھا۔ مکتی باہنی کے ہندو غنڈوں کا وہی منظم گروپ گھر میں داخل ہوا اور بیوی سے دریافت کیا کہ شہاب الدین کو کس نے زہر دیا ہے؟ بیوی نے کہا! وہ تو ابھی کارخانے سے نہیں لوٹے' وہ تو ابو کے ساتھ واپس آتے ہیں ابھی تو ابو بھی نہیں آئے۔''

''تو جھوٹ بولتی ہے' تو نے ہی تو اسے زہر دے کر مار دیا ہے کیونکہ اس نے تیرے باپ کو قتل کردیا تھا''۔ بیوی پر تو سکتہ طاری ہوگیا...... اس کی دوسری بہن بھی اپنے بچوں کے ساتھ اس سے ملنے آئی ہوئی تھی وہ بھی حیران ہوکر غنڈوں کا منہ دیکھ رہی تھی.....'' عبداللہ کہتے کہتے رُک گیا اور باقی بات بیان کرنے سے معذرت کردی۔

''نہیں میں سنوں گی!''

''بس کرو اب رہنے بھی دو'' سلمان نے بیوی کو سختی سے منع کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں آج میں سب کہانی سنے بغیر نہیں رہوں گی آپ یہی کہیں گے نا کہ دونوں بہنوں سے ان غنڈوں نے اجتماعی زیادتی کی اور دونوں کو اس طرح بیدردی سے قتل کیا ہوگا جس طرح سکھوں نے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پہ ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے تھے!'' ناہید نے بات کو سمجھتے ہوئے خود ہی کہا۔

''ہاں بھابی! بالکل یہی ہوا' چودھری صاحب کا داماد ان سے [illegible] طرح محبت کرتا تھا [illegible] ان دونوں سے شفقت اور [illegible] کا سلوک کرتے تھے یہ سب کچھ ایک منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا!'' عبداللہ نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''صاحب کھونو تیار ہے (صاحب کھانا تیار ہے)'' ملازم نے عبداللہ حسن الدین سے کہا۔

"آیئے بھائی! کھانا تیار ہے کل سندر بن کی دوبارہ سیر کا پروگرام بھی بنانا ہے۔" عبداللہ نے ناہید کو اپنی طرف متوجہ کرتے اور گفتگو کا رُخ خوشگوار موضوع کی طرف بدلتے ہوئے کہا۔

اگلے دن صبح سویرے ناشتہ کے بعد سلمان خان اور اس کی بیوی دو گاڑیوں میں سوار سندر بن کی طرف رواں دواں تھے۔ راستے میں ناریل کے باغات اور لہلہاتے کھیت عجب منظر پیش کر رہے تھے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں اپنے اپنے کام کے لیے چلی جارہی تھیں۔ ناہید کے لیے یہ مناظر بالکل نئے تھے' وہ عبداللہ کی بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی: "یہ مناظر تو مجھے پنجاب کے سرسبز و شاداب اور لہلہاتے کھیتوں کی یاد دلا رہے ہیں" ہاں اسلام آباد سے کار میں ملتان جاتے ہوئے میں نے بھی یہی بات محسوس کی تھی" عبداللہ کی بیوی نے کہا۔

سلمان خان نے سندر بن کی پہلے بھی ایک آدھ بار سیر کی تھی مگر اب کے اسے دو باتیں نئی نظر آئیں' ایک تو چکمہ قبائل کے علاقے میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں بڑے زوروں پر نظر آئیں دوسرے کویت اور سعودی عرب وغیرہ کی فلاحی و خیراتی انجمنوں کی طرف سے کئی ایک پہاڑی مقامات پر اسلامی مراکز نظر آئے جہاں مسجد' سکول اور ہسپتال ساتھ ساتھ موجود تھے اور ان میں مسلمان بچوں کو حفظ قرآن اور عربی زبان کی تعلیم کے علاوہ سکول کی بہترین تعلیم بھی دی جارہی تھی مگر یہ کوششیں ان عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے مترادف تھیں جن کے تمام پہاڑی علاقے میں جال بچھے ہوئے تھے اور یورپ و امریکہ کے عیسائی ممالک کی دولت و قوت ان کی پشت پناہی کے لیے موجود تھی!

بنگلہ دیش نے تمام اہم شہروں اور قابلِ دید مقامات کی سیر کے بعد سلمان خان اور اس کی بیوی ناہید واپس ڈھاکہ پہنچے تو عبدالرحمٰن کے گھر والے پہلے ہی محمد پورہ پہنچ چکے تھے' عبدالرحمٰن حسن الدین نے ایک شاندار عشائیہ کا پروگرام بنا رکھا تھا۔

"میں محکمہ خوراک و زراعت سے منسلک رہا ہوں' مغربی پاکستان کی حکومت نے بڑا سخت اور مستقل حکم دے رکھا تھا کہ مشرقی پاکستان کے کیش کراپس (نقد آور فصلیں) مغربی پاکستان میں کاشت نہیں ہوں گی حالانکہ سرحد اور پنجاب کی زمینوں میں پٹ سن کی کاشت کا تجربہ کیا گیا تو پتہ چلا تھا کہ بنگلہ دیش کی پٹ سن سے بہتر پٹ سن مغربی پاکستان میں اُگائی جاسکتی ہے اور اب اچھی کی طرح پٹ سن بھی پاکستان میں اُگائی جارہی ہے۔ مجھ سے اکثر بنگلہ دیشی بھائی پوچھتے ہیں: پاکستان میں بھی سیب اور مالٹا ہوتا ہے؟ ہمارے ہاں تو سیب اور مالٹا کی گھٹیا کوالٹی پائی جاتی ہے جبکہ پاکستان میں تو دنیا کے بہترین سیب کی ایک سو سے زائد قسمیں پائی جاتی ہیں مالٹا' کنو اور فروٹر وغیرہ کی تو بات ہی مت کیجیے!" عبداللہ حسن الدین نے حاضرین کو چونکا دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم تو پاکستان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ ہمیں تو یہ تاثر دیا گیا تھا کہ پاکستان کی اکانومی صرف پٹ سن پر کھڑی ہے!" عبدالرحمٰن نے کہا۔

"کتنے دُکھ کی بات ہے کہ جن لوگوں کیخلاف ہمارے دلوں میں نفرتیں ہی نفرتیں بھری گئیں وہ صرف اپنے بنگالی بھائیوں کی خاطر پٹ سن اور اچھی اپنی زمینوں میں کاشت کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتے تھے۔" عبدالرحمٰن کی بیوی نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"بہن آپ کو اپنے خود غرض لیڈروں نے گمراہ کیا' سنار بنگلہ اور روٹی کپڑا اور مکان کے خواب دکھا کر آپ کو پاکستان کو دو ٹکڑے کر دیا" سلمان خان نے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں ہمیں ماضی کی تلخیوں کے

بجائے مستقبل کی روشنیوں کی طرف دیکھنا چاہئے' دنیا سمٹ رہی ہے ہر ایک دوسرے کے قریب آ رہا ہے ہمیں بھی قریب آنے کا حق ہے۔ ہمارا یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا! ہمیں اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنا ہے۔ انہیں بنیاد بنا کر نفرتوں کو نہیں ابھارنا' آخر ہم ایک خدا' ایک رسولؐ' ایک قرآن' ایک کعبہ والی امت ہیں!'' عبدالرحمٰن نے کہا۔

''ہم کمزور ہو گئے ہیں لیکن ہمیں بٹ سن اور اپنی سیاست سے نکلنا ہوگا رونے دھونے اور آنسو بہانے سے مسائل تو حل نہیں ہوتے!'' عبداللہ نے کہا۔

''آج بنگلہ دیش میں تو پاکستانی کا پایا جانا بھی محال ہے۔ یہاں پر رُکنے یا آباد ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! پاکستانیوں کو تو چن چن کر مار دیا گیا یا ہندو مکتی باہنی کے سپرد کر دیا گیا! مکتی باہنی نے ان کے ساتھ کیا کیا نہیں کیا ہوگا مگر ہزاروں بنگلہ دیشی ملیں گے جو جائز و ناجائز طور پر پاکستان میں رہ رہے ہیں مگر مشرقی پاکستان سے جو نوے ہزار قیدی بن کر بھارت گئے وہ تو زیادہ تر فوجی اور سول ملازمین تھے بلکہ بیشمار فوجی اور سول ملازمین بھی زندہ واپس نہیں گئے اور آج تک لاپتہ ہیں مگر عام مغربی پاکستانی تو کوئی بھی زندہ واپس نہیں جا سکا! جبکہ پاکستان میں تو کسی بنگلہ دیشی کی طرف کسی نے میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھا!'' سلمان نے کہا۔

''لیکن سلمان صاحب! مکتی باہنی کی بغاوت سے پہلے ڈھاکہ وغیرہ میں جو بنگالیوں پر ظلم ہوا وہ بھی تو ہماری زندگی کا ایک المناک پہلو ہے!؟ ایک صحافی نے رائے دی۔

''یہ پاکستان کی وڈیرہ شاہی اور سامراجی ذہن رکھنے والی نوکر شاہی کے دیوالیہ پن کی انتہا تھی کہ انہوں نے قائداعظمؒ کے پاکستان کو دولخت کرنے کے لئے عوامی جوش و خروش اور مقبول عام تحریک کو سامراجی انداز میں طاقت سے کچلنے کی حماقت کی'

پاکستان میں آج بھی اس انتظامی دیوالیہ پن کا ماتم کیا جاتا ہے' ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو سازش نے 1857ء کے بعد سے آج تک مسلمان ذہن کو سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی' تقسیم کے وقت مسلمانوں کا ہندوؤں اور سکھوں نے جو قیامت خیز قتل عام کیا اسے ہندو کی مدد سے ہم نے پچاس سال کے اندر دوسری بار اپنے آپ پر آزما لیا ہے! کتنے دکھ اور شرم کی بات ہے! مگر یہ زہر اب بھی نہیں آ رہے! برصغیر کے مسلمان کی پھوٹی قسمت ابھی کسی اور اقبالؒ اور محمد علی جناحؒ کے انتظار میں ہے! جو پورے مسلم برصغیر کو ایک مٹھی میں لے کر اس کا مقدر سنوار سکے! ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ برصغیر کا برہمن بنیا ذہن یہاں بھی اندلس کا ڈرامہ دہرانے کی فکر میں ہے!! بھارت بنگلہ دیش اور پاکستان کی ملت اسلامیہ کو یہ نقطہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے!'' سلمان نے صحافی کے سوال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''سلمان بھائی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ برصغیر کا مقدر اسلام سے وابستہ' اسلامی عدل و مساوات ہی برصغیر کے طبقاتی نظام کا حل ہے۔ برصغیر میں شجرہ اسلام کی جڑیں کلمہ طیبہ کی طرح تحت الثریٰ میں ہیں اور اس کی شاخیں آسمانوں میں ہیں یہاں اسلام کا یہ شجرہ طیبہ اولیاء اللہ کی مساعی حمیدہ کا مرہون منت ہے' اس کی آبیاری کرنے اور سینچنے میں سید ابوالحسن ہجویریؒ' خواجہ معین الدین چشتیؒ اور شیخ نظام الدین اولیاؒ جیسے بزرگان سلف کی خدمت دین اور برکات کا حصہ ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس خطے سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے رسالت مآب صلی اللہ علیہ علیہ وآلہ وسلم نے محسوس فرمائے تھے۔ انکا دور بھی ابھی ایک بار پھر آتا ہے۔ برصغیر میں مسلمان آریاؤں سے زیادہ مضبوط اور اسلام ہندومت سے زیادہ طاقتور ہے۔ سائنس اور تہذیب کے اس دور میں یہاں تاریک زمانوں کا اندلسی ڈراما دہراتا ہندو

اثر دِکھائے گا صِرف...
کیئر
پریکلی ہیٹ پاؤڈر
Extra Cooling Effects
TRICLOSAN
گھمری گھمری ختم
کیونکہ صِرف کیئر میں ہے TRICLOSAN
گرمی اور پسینے سے بننے والے جراثیم کا نمبر ون توڑ
osab Private Limited

کی خام خالی ہے!!!" عبداللہ حسن الدین نے سب کو چونکاتے ہوئے کہا۔

"ماضی کی تلخیوں کا واحد اور کارگر علاج روشن مستقبل کی طرف پرامید مارچ ہے! برصغیر میں اسلام کی المناک داستان کا انجام انشاء اللہ خوشگوار ہی ہوگا!" ایک بزرگ مہمان نے کہا۔

"یہ سب کچھ تب ہی ممکن ہے جب پاکستان کی قیادت انگریز کی پروردہ وڈیرہ شاہی، نوکر شاہی اور ناشکرے سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکل کر مسلم عوام کے مخلص نمائندوں کے ہاتھ میں آجائے گی اور انگریزی سامراج کی وارث رعونت مآب نوکر شاہی کا مزاج درست ہوجائے گا!!" عبداللہ نے کہا۔

"چلئے باتوں باتوں میں پھل بھی کھاتے جائیے یہ بنگلہ دیش کی بہترین انبچی لیجیے" عبدالرحمٰن حسن الدین کی بیوی نے ناہید کو انبچی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اب تو آپ کے ہاں انبچی مشکل سے ہی پہنچتی ہوگی؟!" ایک مہمان خاتون نے سوال کیا۔

"ناں بھئی! ہم نے تو اب پاکستان کی انبچی بھی کھائی ہے جو لذت اور معیار میں بنگلہ دیشی انبچی سے کسی طرح کم نہیں ہوگی۔" عبداللہ کی بیوی نے کہا۔

"اچھا پہلے تو نہیں تھی! ہمارے لئے تو یہ ایک بڑی خبر ہے!" ایک صحافی نے کہا۔

"ہمارے ہاں پاکستان کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں......" عبداللہ حسن الدین ابھی بات مکمل نہ کرسکے تھے کہ ایک مولانا بزرگ دانشوران کی بات کو کاٹتے ہوئے گویا ہوئے۔

ناہید جو بڑی بیقراری سے پہلو بدل رہی تھی اور سب چہروں کو غور سے دیکھے جارہی تھی یک لخت سب کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بلند آواز سے بولی:

"عبداللہ بھائی! ہمارے رشتہ دار فرحان خان اور اس کی بیوی شاہدہ نے اس دعوت میں نہیں آنا تھا؟"

"ہاں بھائی انہیں بلایا تو گیا تھا مگر وہ نہ آئے ہیں اور نہ کوئی خبر ہمیں بھیجی ہے ان کی طرف سے یہ اعلیٰ قسم کی انبچی لانے والا رمیز الدین ان کا بہت وفادار اور قابل اعتبار بنگالی ساتھی ہے! ہم نے دعوت بھی اسی کے واسطہ سے ہی بھیجی تھی، کیوں بھائی رمیز الدین ان کے بارے میں کچھ تو بتاؤ؟!"

"اچھا سر! آپ کو کچھ پتہ نہیں؟! وہ میاں بیوی تو اپنی چاروں بچیوں، ان کے شوہروں اور بچوں سمیت گھر میں بند کرکے زندہ جلائے جاچکے ہیں!!!"

رمیز کے یہ الفاظ سنتے ہی سب حاضرین پر غم اور افسوس کا جیسے بم گر پڑا تھا مگر ناہید تو غم سے تڑپ اٹھی، اس کی چیخ سن کر عبداللہ کی بیوی زینب بھی واویلا کرتے ہوئے اٹھی اور ناہید کو گلے لگالیا! ان دو عورتوں کے ماتم اور نوحہ نے سب حاضرین کو غم اور دکھ میں ڈبو دیا، اسی اثناء میں ایک بزرگ عبداللہ الحسن کے والد مولانا حسن الدین جو بالکل چپ چاپ ایک طرف دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے، بلند آواز سے بولے:

"میرے عزیزو! غم واندوہ کی جو باتیں ہوئیں ان سب میں یہ آخری خبر ہم سب کے لئے ایک ناقابل برداشت صدمہ ہے! میں سلمان خان اور ان کی بیگم ناہید سمیت آپ سب سے دلی ہمدردی رکھتا ہوں اور آپ کے غم واندوہ میں بھی برابر کا شریک ہوں! لیکن آپ سب سے اپنے دل کی بات میں ضرور کہوں گا، یاد رکھو کہ جب تک یہ انبچی زندہ و پائندہ ہے اور جب تک آنسوؤں کا یہ سلسلہ رواں دواں ہے اس وقت تک قائداعظمؒ کی قیادت میں پاکستان بنانے والوں کی نسلیں اور ان کے نام لیوا زندہ جاوید اور قوت قاہرہ بنے رہیں گے! احساس زیاں کے طفیل متاع کارواں کی تسلی بخش تلافیاں بھی ہوتی رہیں گی...... اس لئے آنسو پونچھ لو اور انبچی کی قدر کرتے جاؤ!!"

پونجی

محمد سلیم اختر

اس نے نیند کے عالم میں گنبد خضری کو دیکھا تو بے بسی کے احساس نے اسے اپاہج کر ڈالا۔ یہ اس نے کیا کر ڈالا؟ اپنا زادِ راہ اپنے ہاتھوں لٹا دیا۔ اسے یوں لگا کہ وہ ایک ملاح کے مانند ہے۔ جس نے پوری عمر سخت محنت سے منزل تک پہنچنے کے لئے کشتی بنائی پھر منزل قریب آتے ہی کشتی کو سمندر میں بہا دیا۔

ایک غریب شخص کی کہانی جو ایک خاص مقصد کیلئے پائی پائی جمع کر رہا تھا

فیض عالم اپنے گاؤں کی مسجد کا خادم تھا۔ مسجد کی صفائی ستھرائی اور وضو کے لئے پانی کی فراہمی اس کے بنیادی کام تھے۔ گاؤں میں بجلی تو تھی نہیں اس لئے وہ باہر کچھ فاصلے پر بنے کنوئیں سے مشک میں پانی بھر کر لاتا اور مسجد کے اندر بنی ٹینکی میں لا ڈالتا۔ اس کی بیوی فضلاں بھی ان کاموں میں اس کی مدد کرتی۔ فیض عالم غریب اور مسکین شخص تھا۔

گاؤں میں اس کی کوئی جائیداد نہ تھی۔ صرف ایک کچا سا مکان تھا جہاں وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا۔ پکا نمازی اور پرہیز گار تھا۔ طبیعت میں انکسار اور عاجزی تھی اور قناعت پسندی بھی۔ وہ نہ صرف بڑوں بلکہ چھوٹوں کی بھی عزت کرتا۔ گاؤں کا ہر فرد اس کے خلوص اور ایمانداری کا معترف تھا۔

اس کا بیٹا جبار سب بہن بھائیوں سے بڑا تھا۔

جب جبار کچھ سمجھ دار ہوا تو وہ باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس نے ایک ریوڑ بنایا اور گاؤں کے لوگوں کی بھیڑ بکریاں چرانے لگا جس کا اسے ہر ماہ کچھ نہ کچھ معاوضہ مل جاتا۔ پھر بھی فیض عالم کے گھرانہ کی گزر بسر مشکل سے ہوتی۔ مگر وہ ہر لمحہ تقدیر پر شاکر تھا اور اوپر والے کا شکریہ ادا کرتے نہ تھکتا۔

اس کی دوستی صرف خانو کمہار سے تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ کے ساتھی تھے۔ کیونکہ گاؤں میں سب سے زیادہ غریب وہ تھا یا پھر خانو کمہار۔ فارغ وقت میں وہ دونوں گپ شپ بھی لگاتے۔ خانو کمہار کا بیٹا فرید، فیض عالم کے بیٹے جبار کا ہم عمر تھا۔ وہ بھی جبار کی طرح بھیڑ بکریں چراتا۔ ان کی دنیا صرف بھیڑ بکریوں جنگل اور گاؤں تک ہی محدود تھی۔ فیض عالم کو نعتیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے کچھ پنجابی نعتیں یاد کر رکھی تھیں جنہیں وہ اکثر شوق اور لگن سے پڑھا کرتا۔

"کملی والے مینوں وی مدینے بلا لے"

اس کی پسندیدہ نعت تھی۔ وہ جب یہ نعت کسی محفل میں سناتا تو اس کی آنکھیں بھر آتیں اور اس کے من میں مدینہ جانے کی خواہش مچل اٹھتی۔ مگر یہ تمنا سینے میں ہی دم توڑ جاتی کیونکہ مدینہ شریف جانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ فیض عالم نے اپنی خواہش کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ اس کی تکمیل میں لگا ہوا تھا۔ اس نے بکریوں والے باڑے میں گڑھا کھود کر ایک مٹی کا گڑھا اس میں دبا رکھا تھا۔ گاؤں والوں سے جب بھی اسے روپیہ، دو روپے ملتے وہ گڑھے میں ڈال کر منہ بند کر دیتا...... وہ یہ رقم سفرِ مقدس کے لئے جمع کر رہا تھا۔ اس بھولے شخص کو معلوم نہ تھا کہ وہ معمولی رقم سے یہ مقدس سفر نہیں کر سکتا۔

گاؤں کا امیر ترین گھرانہ گاؤں کے نمبردار راجا شہباز کا تھا۔ وہ گاؤں کا نمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ یونین کونسل کا چیئرمین بھی تھا۔ علاقہ میں سب سے زیادہ جائیداد اس کی تھی۔ امیر ہونے کے باوجود سخاوت اور ہمدردی اس سے کوسوں دُور تھی۔ راجا مسجد کی شکل سال میں دو بار ہی دیکھتا یعنی عیدین کے مواقع پر۔ یونین کونسل کا چیئرمین ہونے کا وہ بھرپور فائدہ اٹھاتا۔ ترقیاتی فنڈ، زکوٰۃ فنڈ اور دیگر سرکاری رقومات ہضم کرنا اس کے لئے معمولی بات تھی۔ یہ فنڈ اور رقومات ہضم کرتے کرتے جب اس کے ضمیر کو نیکی کا خیال آتا تو فوراً عمرہ یا حج کرنے روانہ ہو جاتا۔ واپسی پر اس کا استقبال اس طرح کیا جاتا جیسے کوئی محاذ فتح کر کے آ رہا ہے۔ ایسے موقع پر فیض عالم کی آنکھوں کے سامنے جالا سا بن جاتا۔

"میری باری کب آئے گی مولا!" وہ جذباتی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ کر کہتا۔ پھر اٹھ کر مشک اٹھاتا اور پانی بھرنے روانہ ہو جاتا۔ کبھی کبھار راجہ شہباز تبرک تقسیم کرنے مسجد بھی آ جاتا۔ فیض عالم اسے مسجد میں دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور اسے مبارک باد بھی دیتا۔ ایک بار فیض عالم نے راجہ سے پوچھا "راجا صاحب! کتنا خرچ آتا ہے اللہ اور اس کے رسول کے گھر کی زیارت کرنے کا۔"

"پورا ایک لاکھ روپیہ۔" راجا شہباز فخریہ انداز سے قہقہہ لگا کر بولا "تمہیں کیا شوق چڑھا ہے پیسے پوچھنے کا، کیا حج پر جانے کا ارادہ ہے؟" اس کے لہجے میں غرور بھی تھا اور طنز کی کاٹ بھی۔

"میری اتنی طاقت اور نصیب کہاں راجا صاحب" فیض عالم نے شکستہ لہجے میں کہا تو راجا کا سینہ کچھ اور پھول گیا۔ فیض عالم نے دیگر نمازیوں سے نظریں چرائیں اور اُداس سا گھر لوٹ آیا۔ اس رات اسے نیند نہ آئی۔ اس کی سوچ پر غم و اُداسی کی چادر تنی رہی۔ رہ رہ کر ایک ہی آواز اس کے من میں گونجتی تھی "میری باری کب آئے گی؟" میری باری کب آئے گی، میری باری کب آئے گی۔"

وہ یہی سوچتا رہا کہ راجا صاحب تو ہر سال حج کرنے چلے جاتے ہیں میں گزشتہ چالیس برس سے

مٹکے میں پیسے رکھتا چلا جاتا ہوں جو بڑی مشکل سے پینتیس ہزار روپے ہوئے ہیں نجانے ایک لاکھ کب پورے ہوں گے؟ کیا چالیس برس اور...... کیا میرے نصیب میں سفرِ مقدس نہیں ہے؟

وہ جب بھی اپنی اس خواہش کا اظہار خانو سے کرتا تو وہ اسے کہتا" یہ تو توفیق کی بات ہے عالم! یہ تو بلاوا آنے کی بات ہے۔"

فیض عالم خالی خالی نظروں سے اسے تکنے لگتا۔ خانو اس کی کیفیت سمجھ جاتا اور کہتا" فیض عالم! مجھے یقین ہے ایک روز تمہارا بلاوا ضرور آئے گا۔"

"توفیق...... بلاوا......" فیض عالم تھکے سے لہجے میں کہتا" یہ بلاوا ہر بار راجا صاحب ہی کو کیوں آتا ہے؟"

"فیض عالم! اب یہ توفیق یا بلاوا نہیں......" خانو بولا" ایسے لوگ تو زبردستی خدا اور اس کے رسول کے گھر میں جا گھستے ہیں پھر وہاں سے جو کچھ ہاتھ لگے اسے حاضری کے ثبوت کے طور پر اٹھا لاتے ہیں مثلاً کھجوروں کے ٹوکرے، آبِ زم زم کے کنستر...... یہ حاضری نہیں کہلاتی فیض عالم!" اس کی آواز بھر جاتی۔ "لیکن ایک لاکھ بہت زیادہ رقم ہے۔" فیض عالم ٹوٹے لہجے میں کہتا۔

تم کوشش کر کے سیڑھیاں چڑھتے چلے جاؤ انہیں گنو مت......" خانو اس کی ہمت بندھاتا۔

گاؤں میں صرف ایک پرائمری سکول تھا۔ جہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے۔ سکول میں صرف دو ہی استانیاں تھیں اردگرد کے دیہات سے بھی کچھ لڑکے اور لڑکیاں اس سکول میں پڑھنے آتے۔ سکول گاؤں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں اور سکول کے درمیان ایک نالہ پڑتا تھا۔ اس نالے میں معمولی بارش ہونے سے بھی طغیانی آجاتی۔ گاؤں کے بچے سکول جاتے ہوئے یہ نالہ پار کرتے تھے۔ بارشوں کے موسم میں جب نالہ پانی سے بھر جاتا تو بچوں اور والدین کو کافی پریشانی اٹھانی پڑتی۔ لوگوں نے اس نالے کا نام" خونی نالہ" رکھ دیا تھا کیونکہ یہ ہر سال کسی نہ کسی بچے کی جان لے لیتا گاؤں کے لوگوں کے مطالبے اور اصرار پر راجا شہباز نے حکومت سے نالے پر پل بنانے کی منظوری لے رکھی تھی۔ اسے فنڈ مل گیا مگر کئی برس گزر جانے کے باوجود پل نہ بن سکا۔ البتہ سرکاری فائلوں میں وہ بن چکا تھا۔ گاؤں کے لوگ جان گئے تھے کہ راجا شہباز سرکاری افسروں سے مل ملا کر پل کے لئے ملنے والی رقم ہڑپ کر چکا مگر اس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت کسی میں نہ تھی۔ جب بھی کوئی بچہ اس خونی نالے کی بھینٹ چڑھتا راجا شہباز گاؤں والوں کو یقین دلاتا کہ اگلے مالی سال کے فنڈ ملنے پر وہ پل کی تعمیر کرا دے گا...... لیکن اگلا سال کبھی نہ آتا۔

اس برس بھی ایسا ہی ہوا۔ فیض عالم کے دوست خانو کمہار کا پوتا اس خونی نالے کی بھینٹ چڑھ گیا۔ فیض عالم کو جب یہ خبر ملی تو وہ فوراً خانو کے گھر پہنچا اور اس کے گلے لگ کر خوب رویا۔ بچے کی لاش اگلے روز بہت دور سے ملی۔ اس کی نماز جنازہ پڑھتے وقت ہر آنکھ اشکبار تھی۔ فیض عالم بھی ان میں شامل تھا۔ سب سے زیادہ دکھ اسی کو ہوا۔ بچے کو دفنانے کے بعد فیض عالم نے میلی قمیص سے آنکھیں صاف کیں اور بوجھل قدموں سے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اس کا رخ راجا شہباز کی حویلی کی طرف تھا۔ راجا شہباز نے فیض عالم کو دیکھا تو بولا" آؤ فیض عالم! خیریت سے آئے ہو نا!"

"راجا صاحب!" فیض عالم ہمت کر کے بولا" ایک عرض کرنی تھی جی۔" وہ عاجزانہ انداز میں بولا" کہو کیا بات ہے؟" راجا شہباز پیشانی پر بل ڈال کر بولا" راجا صاحب! آج خانو کا پوتا خونی نالے کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔" وہ زخمی الفاظ میں بولا" وہ جی...... اگر نالے پر پل بن جائے تو بچوں کو آسانی ہو جائے گی۔"

"فیض عالم!" راجا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور رعب دار لہجے میں بولا" تم مسجد کے خادم ہو تم مسجد کی فکر کرو، یہ کام تمہارے کرنے اور سوچنے کا نہیں

پل والا کام ہو جائے گا تمہیں کیا جلدی ہے؟''

فیض عالم نے راجا کا غصہ دیکھا تو وہ خفت اور بے چارگی کے ملے جلے احساسات لئے حویلی سے باہر نکل آیا۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ فیض عالم نے اس روز ناقابل بیان کیفیت میں نماز پڑھی۔ ''پل کب بنے گا؟ کب......؟''

نماز پڑھنے کے بعد اس نے خود سے سوال کیا۔

نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ اسے یوں لگا کہ جیسے کوئی راز ہے جس سے وہ اچانک آشنا ہو گیا۔

نماز عشاء ادا کرنے کے بعد وہ بے چین سا رہا۔ نماز ختم ہوئی تو اس نے مسجد کی لالٹین بجھائی' بڑے دروازے کو کنڈی لگائی اور گھر آ گیا۔ پھر وہ باڑے میں گیا' مٹی کا گھڑا نکال کر اسے اپنے گھر میں لے آیا اور اُلٹ دیا۔

گڑھے سے برآمد کردہ ساری رقم اس نے چادر پر پھیلا دی وہ ساکت نظروں سے لالٹین کی سہمی ہوئی روشنی میں رقم کو گھورنے لگا جو اس کے چالیس برس کی کمائی تھی......

ایک' دو' پانچ' دس اور سو روپے کے نوٹ اس نے انتہائی نفاست سے الگ الگ تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے سکوں کا بھی ڈھیر تھا۔ وہ پھر اپنی جمع شدہ پونجی گننے لگا چالیس ہزار روپے سے کچھ اوپر رقم بنی۔ اس کا دماغ سن ہو گیا اور سارے احساسات اور جذبات سرد ہو گئے وہ اپنے آپ سے کچھ کہنے لگا۔

''کل میں یہ ساری رقم پل بنانے کیلئے دے دوں گا۔''

وہ یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا۔ رات کو نیند بھی اسے خوب آئی۔ صبح جب وہ فجر کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد کی طرف روانہ ہوا تو رقم کی پوٹلی ہاتھ میں تھی۔ نماز ختم ہوتے ہی اس نے نمازیوں سے درخواست کی کہ وہ ان سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تمام نمازی چونک گئے۔ آج پہلی بار فیض عالم ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ نجانے وہ کیا کہے گا؟ کہیں مسجد کی خدمت سے تو دستبردار نہیں ہو رہا۔

''میرے بھائیو اور دوستو!'' فیض عالم کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''اس پوٹلی میں موجود رقم میری چالیس برس کی کمائی ہے...... یہ کل رقم چالیس ہزار آٹھ سو بارہ روپے بنتی ہے۔ میں نے یہ رقم حج کرنے کے لئے جمع کی تھی۔ مگر امام صاحب کے حوالے کر رہا ہوں تاکہ آپ لوگ اس سے خونی نالے پر پل بنوالیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آئندہ کوئی بچہ نالے میں ڈوب کر نہ مرے۔ جب بھی کوئی بچہ نالے میں گر کر زندگی ہارتا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا بیٹا مر گیا ہے۔ میں نے کئی برس آپ لوگوں کا نمک کھایا ہے۔'' فیض عالم کی آواز رندھ گئی......اس نے رندھی ہوئی آواز میں اپنی بات جاری رکھی ''میں نے اللہ اور اس کے رسول کے لئے یہ رقم دی ہے۔ اللہ اسے قبول فرمائے۔'' یہ کہہ کر اس نے پوٹلی امام مسجد کے حوالے کر دی۔ سبھی نمازی بڑھ کر اسے ملتے ہوئے اظہار مسرت کرنے لگے۔ وہ بہت خوش تھے۔

فیض عالم گھر پہنچا تو اسے ایسے لگا اس نے آج صدیوں کا سفر کیا ہے اور مشقت سے اس کے پاؤں میں آبلے پڑ چکے ہیں۔ جسم تھکن سے چور ہونے کے باوجود اس کا دماغ مسلسل جمود کی حالت میں تھا۔ سارا دن وہ اسی حالت میں رہا۔ گاؤں میں جلد یہ بات پھیل گئی کہ فیض عالم نے اپنی جمع پونجی پل کے لئے عطیہ کر دی ہے۔ راجا شہباز نے فیض عالم کی اس سخاوت کا چرچا سنا تو تڑپ اٹھا۔ دن بھر گاؤں کے مرد اور عورتیں فیض عالم کی خدا ترسی پر اسے داد دینے اس کے گھر آتے رہے۔ مگر راجا کے گھر سے کوئی اسے شاباش دینے نہ آیا۔ رات ہوئی تو وہ بستر پر دراز ہو کر ماضی سے حال کی طرف پرواز کرنے لگا۔ ایک......دو......تین......چالیس' پچاس برس کی ریاضت اور مشقت اس کے اعضاء میں سمانے لگی اور پھر ایک ہندسہ جگمگایا ''چالیس ہزار آٹھ سو بارہ روپے۔'' تب اس کے پیٹ میں گولہ سا اٹھا' سانس رکنے لگی۔ منہ

سے سسکیاں نکلیں اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اس کا چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

"میری باری کب آئے گی؟" مگر اب تو اس کی باری ہمیشہ کے لئے نہیں آنی تھی' اس نے اپنے پر خود ہی کاٹ ڈالے تھے۔ روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے نیند کے عالم میں گنبد خضریٰ کو دیکھا تو بے بسی کے احساس نے اسے اپاہج کر ڈالا۔ یہ اس نے کیا کر ڈالا؟ اپنا زاد راہ اپنے ہاتھوں لٹا دیا۔ اسے یوں لگا کہ وہ ایک ملاح کے مانند ہے جس نے پوری عمر سخت محنت سے منزل تک پہنچنے کے لئے کشتی بنائی پھر منزل قریب آتے ہی کشتی کو سمندر میں بہا دیا۔ فیض عالم کا سانس بند ہونے لگا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن وہ مکمل طور پر سو نہیں پایا تھا کہ اچانک ایک پرنور اور شفیق شکل والے اجنبی نے اسے جگا دیا۔ اجنبی نے فیض عالم کا ہاتھ پکڑا تو اسے یوں لگا جیسے زمین نیچے سے سرک گئی ہے۔ کیف و انبساط سے سرشار ہوا میں تیرتا ہوا وہ نجانے کہاں جا پہنچا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا جسم روئی کے گالے کی طرح محو پرواز ہے۔ دیر بعد اس کے پاؤں زمین پر لگے تو اسے اپنے اردگرد آوازیں سنائی دیں۔

لبیک اللھم لبیک' لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمتہ لک و الملک لاشریک لک...... اجنبی نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اردگرد لاکھوں کی تعداد میں لوگ سفید احرام باندھے ہوئے تھے۔ فیض عالم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا لباس بھی احرام میں بدل چکا تھا پھر وہ بھی مناجات کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ "لبیک اللھم لبیک"

اجنبی کا رحمت بھرا ہاتھ اسے لئے پھر رہا تھا۔ حتیٰ کہ گنبد خضریٰ کی جالیوں کے سامنے آ کر وہ تھم گیا۔ وہ ہاتھ باندھے سنہری جالیوں کے سامنے کھڑا رہا۔ اس نے سلام پڑھنے کی کوشش کی لیکن قوت گویائی جیسے سلب ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک ذرہ ہو اور اسے ایک بہت بڑے بگولے نے اپنے حلقہ اثر میں لے رکھا ہے۔ آس پاس موجود ہر شے بلند تھی۔ ہر شے کی حد عرش کو چھو رہی تھی اور وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس کی گردن کافی جھکی رہی۔ اچانک زبان کی ساری بندشیں کھل گئیں اور وہ لپک لپک کر بڑے سوز کے ساتھ درود وسلام پڑھنے لگا...... نجانے کتنا عرصہ بیت گیا...... کچھ لمحات یا چند صدیاں' وہ زمان ومکان سے بیگانہ کھڑا رہا کہ اجنبی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آؤ واپس چلیں۔"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی واپس مڑا تو اجنبی نے ایک کھجوروں والا پیکٹ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "یہ اس حاضری کی نشانی ہے' اسے ساتھ لیتے جاؤ۔"

"اچھا' اچھا" فیض عالم نے خوشی سے سر ہلایا۔

اجنبی نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ایک دفعہ پھر زمین سرکی اور وہ اسی طرح محو پرواز ہو گیا۔ نجانے کتنے لمحات بیت گئے پھر اس نے خود کو چارپائی پر محسوس کیا۔ اجنبی وہاں موجود نہ تھا۔ فیض عالم کو تسکین کے زبردست احساس نے آ لیا۔ پلکیں کیف سے بوجھل ہو گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ گہری نیند سو گیا۔

اگلی صبح جب فیض عالم کا بیٹا اور اس کا دوست خانو دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو انتہائی معطر خوشبو نے ان کا استقبال کیا۔ فیض عالم چارپائی پر دراز تھا۔ چہرے پر ایک خوشگوار مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ خانو اور اس کے بیٹے نے اس کا لباس دیکھ کر بے یقینی میں اپنی آنکھیں ملیں کیونکہ وہ سفید احرام میں ملبوس تھا۔ داہنا ہاتھ بند مٹھی کی صورت میں سینے پر دھرا تھا۔ خانو نے ڈرتے ڈرتے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا مگر وہ تو نجانے کب کی تھم چکی تھی...... اتنے میں خانو کی نظر فیض عالم کی بند مٹھی پر پڑی..... اس میں کھجوریں دبی ہوئی تھیں۔

● آسناتھہ تنول

حوریہ بے حد سنجیدہ ہو چکی تھی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی تھی چپ چاپ وہ اپنے کمرے میں پڑی کتابیں پڑھتی رہتی۔ نہ کالج جاتی نہ اکیڈمی۔ ایک ہفتے بعد حوریہ کی منگنی کا اعلان کرا دیا گیا تو اس نے کوئی احتجاج نہ کیا جیسے زندگی اور خوشی سے دل ہی اٹھ گیا ہو۔

ایک سچی محبت کی کہانی جس کی طاقت نے ایک لادین شخص کو مسلمان بنادیا

وہ عجیب سا شخص تھا۔ پہلے پہل تو وہ اسے عام سا ہی لگا۔ جیسے سب عام لوگ ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی بھی خاص بات نہ تھی۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے آنکھوں پر نظر کی عینک بال خوبصورت تو تھے مگر قدرے بکھرے ہوئے۔ سنجیدہ سا سنجیدہ چہرہ، قد بھی اچھا خاصا مناسب تھا۔ وہ خود سے ہی باتیں کررہی تھی یعنی کاغذ اور قلم سے باتیں۔ ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے یہی خود کلامی تو کہانی بن جاتی ہے۔

وہ بھی اس ادبی محفل میں شریک تھی، باتیں کرتی چلی جارہی تھی اچانک ہی کسی لفظ کی ادائیگی پر بحث ہونے لگی۔ وہ بظاہر لاتعلق سا بیٹھا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی ساری توجہ انہی کی باتوں پر تھی اور تھا بھی ایسا ہی۔

"میں کچھ عرض کرسکتا ہوں" اچانک ایک گمبھیر

سی بارعب آواز نے ایک سناٹا سا پھیلا دیا۔ سب یکدم چپ ہو گئے اور اس حسین آواز کی طرف متوجہ ہوئے اُسے تو ابھی تک اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔ یہ غالباً وسط گرمیوں کی بات تھی، گرمی عروج پر تھی اے سی کی ٹھنڈ میں بیٹھے وہ ادبی بحثوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ اُس نے یکدم اسے بے اختیار دیکھا۔ وہ عینک اُتار کر دونوں انگلیاں آنکھوں پر رکھے کچھ سوچنے کے انداز میں آگے کو جھکا۔ یکدم ڈرامائی انداز سے انگلیاں اُٹھا کر اس نے پوری آنکھیں کھولیں اور اطراف کا جائزہ لیا۔ وہ تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اتنی حسین آنکھیں اُف خدایا۔ چمکیلی شربتی اُداس کھب جانے والی، ان حسین آنکھوں کو کس سے تشبیہ دے، اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ بولنے لگا چند ساعت کے لئے اس نے اُسی کی جانب دیکھا تو دل کی دنیا اتھل پتھل ہوئی۔ بظاہر اک عام سا نظر آنے والا شخص یکدم اتنا خاص لگنے لگا کہ سب اس کے سامنے پھیکے سے لگنے لگے۔ چاروں طرف اس کی آنکھیں تھیں، اُسے تو کچھ اور سجھائی نہیں دیا بس وہی تھا۔ وہ کسی خیالی جزیرے پر تنہا تھی اور اس کے چاروں طرف صرف آنکھیں تھیں، شربتی، مدھ بھری حسین آنکھیں۔ اس کی گمبھیر سی آواز کا جادو پھیلا ہوا تھا۔ اس نے کیا کہا کچھ پتہ نہ چلا وہ تو اس کی حسین آنکھوں کے بھنور میں رقصاں تھی۔ یہ بحث ختم ہوئی سب اظہار خیال کر رہے تھے، اُسے سرا دے رہے تھے۔

''میڈم آپ کو یہ ٹاپک کیسا لگا؟'' وہی گمبھیر آواز اُسے اپنے کانوں کے پاس سنائی دی۔

''جی...'' وہ ہڑبڑا کر اس کی طرف مڑی تو چہرہ بہت قریب تھا۔ وہ تو گرتی پڑتی تھی اگر وہ اپنے مضبوط بازوؤں میں تھام نہ لیتا۔ ''اوہ سوری'' اس نے جلدی سے ... ''کوئی بات نہیں''

اس کے جاندار ہونٹوں پر اک دلفریب مسکراہٹ تھی۔ اُس نے بس ایک نظر ان آنکھوں میں جھانکا پھر انہی میں ہی ڈوب کر رہ گئی۔ یا اللہ ایسی حسین اور طلسمی آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔

ان کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
سونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

پھر ایک اور شعر یاد آیا

تم سمندر کی بات کرتے ہو
لوگ آنکھوں میں ڈوب جاتے ہیں

اور یہاں تو وہ پور پور ڈوب رہی تھی۔ بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی مگر کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے بھی شاید اُس کی اس گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ دوبارہ گلاسز پہن کر پھر پہلے جیسا چپ شاہ بن گیا تھا۔ مگر اب ڈھونگ کا کیا فائدہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ ایک جیتا جاگتا شکار تو اس کے سامنے تھا اور پتہ نہیں کتنے گرے تھے۔ وہ تو اس نئی افتاد سے اتنا بدحواس ہوئی کہ جلدی سے بیگ پکڑا اور باہر جانے کی کوشش کی وجہ سے بیگ نیچے گر پڑا۔ وہ حیران تھی کہ یہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ اچانک وہ بھیڑ میں سے نکلا اس نے بیگ پکڑا اُس کی فائل اٹھائی، اُس کے گرے ہوئے کارڈ اٹھائے اُسے واپس کرتے ہوئے ایک کارڈ اس نے اپنے ہاتھ میں رکھ لیا۔ ''اگر اجازت ہو تو یہ رکھ لوں'' اس نے سیدھا اُس کی آنکھوں میں جھانکا شاید وہ جان چکا تھا کہ یہی اُس کی کمزوری ہے۔ ''جی جی ضرور'' اُس نے وہاں سے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ دل اُس سے زیادہ تیز بھاگ رہا تھا۔ باہر سڑک پر لگاہ دوڑائی گرمی کی شدت' ویران سڑک نہ بندہ نہ بندے کی ذات نہ رکشہ نہ گاڑی نہ ویگن۔ اومیرے خدا کیا بنے گا پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ اچانک ایک کار اس کی سفید شیراڈ کہیں سے نکلی اور اس کے

سامنے اس کے بریک چرچرائے، ”مس حوریہ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو ڈراپ کر سکتا ہوں“۔

”آپ....“ حوریہ نے گویا خود سے ہی پوچھا۔ ”نہیں ابھی کوئی رکشہ آجائے گا آپ تکلف نہ کریں۔“ ”او.... میم کوئی تکلف نہیں مجھے کوئی خاص کام نہیں آپ کی مدد تو کر ہی سکتا ہوں۔ اتنا کم نہ سمجھیں۔“

”نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہے“۔ حوریہ نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔

”تو پھر میری شرافت پر یقین کریں“۔ اُسے بیٹھتے ہی بنی کہ سیشن ختم ہونے کے بعد کافی لوگ باہر آنے لگے تھے۔ ”پہلے یہ بیگ مجھے پکڑا دیں“ اس نے ہاتھ آگے کیا۔ ”کوئی بات نہیں“۔ اُس نے اچھل کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”پرس تیری قسمت“ اس نے اک آہ بھری۔ حوریہ نے پھر پرس جھپٹنے کے انداز میں پکڑا تو ہاتھ اس کے ہاتھ سے اُلجھ گیا۔ ”ایک بات تو بتائیں“ اس نے گاڑی گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا ”آپ ہمیشہ سے ہی ایسی ہیں یا آج کچھ ہوا“۔ وہ زیرِ لب مسکرایا۔ گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ ”نہیں تو“۔ اُس نے دیکھے بغیر سر جھٹکا۔ ”آپ بہت کم عمر ہیں اس میدان کارزار میں آئی ہیں، یہ نازک اندام لوگوں کا کام نہیں“۔ اس نے آواز کے تاثر کو گھمبیر کیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں میں نے نفسیات میں ماسٹرز کیا ہے۔ انگلش ادب میں اور اردو میں بھی۔“ حوریہ نے اس پر رعب ڈالنا چاہا۔

”ہوں.... ماشاء اللہ۔ اس کو اپلائی بھی کریں۔“ اس نے گویا نصیحت کی۔

”میں اتنی بھی بچی نہیں ہوں“۔ اس نے منہ بنانے کے انداز میں کہا تو وہ ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پتہ نہیں کیا تھا اس کے اندر وہ بس اسے دیکھتی چلی گئی۔ اُسے غور سے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ چپ ہو گیا۔ چپ شاہ کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ”میرے بارے میں نہیں پوچھیں گی آپ؟“۔

”بتا دیں۔“ حوریہ نے کہا۔

”میں بہروز خان ہوں۔ پچھلے ایک مہینے سے پاکستان میں ہوں۔ میں ہوں تو ایشائی مگر پیدا امریکہ میں ہوا، سو امریکی شہری ہوں مگر میری روح میں ہمالیہ کی چوٹیاں اور تبت کی ندیاں گونجتی رہتی ہیں میں چترال کی وادیوں اور شملہ کے حسن میں کھو جانا چاہتا ہوں۔ یورپ امریکہ اور ادھر ادھر بہت سا حسن مصنوعی ہے میں فطرت کے خالص اور دہشت انگیز حسن میں رہنا چاہتا ہوں۔ میری روح کشمیر میں رقصاں رہتی ہے میں نے آدمی سے زیادہ دنیا گھوم لی ہے امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتا ہوں۔ جب جب موقع ملتا ہے تو کسی ایشیائی ملک کا انتخاب کر لیتا ہوں، اس دفعہ پاکستان کی باری تھی۔ پروفیسر ڈاکٹر وحید ریاض میرے دوست ہیں ان کی دعوت پر ہی آیا ہوں۔ اردو ادب سے دلچسپی ہے تقریباً 10 زبانیں جانتا ہوں۔ سیلانی اور درویش آدمی ہوں شادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑا۔ شاید یہ کام کروں بھی نہ کہ یہ میرے مزاج کے مطابق نہیں۔ آج تک کسی سے محبت بھی نہیں ہوئی کہ دنیا داری سیکھتا۔ عمر میں آپ سے تین گنا بڑا ہوں گا۔ جناب یہ تھا میرا تعارف۔ آپ کو پچھلے دو دن سے دیکھ رہا ہوں۔“

حوریہ نے اس کی طرف دیکھا۔ کیسا چالاک آدمی ہے۔ اُس نے حیرت سے سوچا ”کیا دیکھا پھر؟“ حوریہ نے پوچھا۔ ”آپ خود کو سمیٹ کر نہیں رکھتیں بس بکھری بکھری سی نکھری ہوئی، گھبرائی ہوئی ہرنی جیسی۔ بولتے وقت اعتماد سے بات کرتی ہیں۔ اپنے ٹاپک پر بے تکان بول سکتی ہیں مگر تنہائی میں

آپ کو سنبھالنے کے لئے کوئی آس پاس ہونا چاہئے۔"

اس نے حوریہ تجزیہ پیش کیا۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا اُسے چپ سی لگ گئی۔ کتنا صحیح بول رہا تھا وہ، حوریہ اس کی قائل ہو رہی تھی۔ "کیا ہوا مس حوریہ؟" اس نے اُسے چپ دیکھ کر کہا۔ "کہیں کولڈ ڈرنکس لے لیں، آج بہت گرم دن ہے؟" "لے لیں" حوریہ نے بے دھیانی میں کہہ دیا۔

وہ بالکل خالی الذہن تھی اس کے سامنے تو بات بھی نہیں سوچ رہی تھی۔ اس نے گاڑی بیکری کے سامنے روکی۔ ایک لڑکے سے اس نے دو کوک منگوالیں حوریہ نے ایک کوک لے لی۔ اس کا گھر اب قریب ہی تھا اسے راستہ سمجھا کر وہ پرس سمیٹنے لگی۔ "حوریہ آپ چپ سی ہوگئی ہیں" اس بار اُس نے مس نہیں کہا۔ حوریہ نے پھر اسے دیکھا تو اس کی حسین آنکھیں اسی پہ ٹکی تھیں۔ "کل آئیں گی" اس نے پوچھا۔ "جی....." بمشکل اس کے گلے سے آواز برآمد ہوئی۔ "آپ پریشان کیوں ہوگئی ہیں؟"

"کل دوپہر میں نفسیات کا لیکچر ہے مجھے یوں لگ رہا ہے کہ کچھ بھی نہیں کہہ پاؤں گی۔"

"کوئی مشکل ہو تو مجھ سے ڈسکس کرسکتی ہیں۔" اس نے اپنا کارڈ حوریہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کا گھر آگیا تھا۔ حوریہ نے شکریہ کہا تو بولا "یہ تو میری خوشی تھی آپ مجھے اچھی لگیں۔" یہ کہہ کر جیسے اس نے اس کے پیروں میں دھماکہ کیا ہو۔ وہ خود کو سنبھال رہی تھی۔ وہ جا چکا تھا۔

چور کہیں کا مجھے چرا کے لے گیا ہے۔ اور کیسا دھماکہ کر گیا ہے۔ اچھا بچو کل بدلہ لوں گی تم سے۔ حوریہ نے بھی سوچ لیا تھا۔ گھر پہنچی تو والدہ نے فوراً کافی بنا دی۔ "تھک گئی ہے میری بیٹی؟"

"ہاں ماں آج لمبا سیشن چلا تھا۔ شکر ہے کل آخری دن ہے۔"

"تیری مغز ماری تو چلتی رہتی ہے نا' کالج پھر اکیڈمی اپنے لئے بھی وقت نہیں ملتا تمہیں۔ میری بچی کتنا تھک گئی ہے۔" ماں بلائیں لینے لگی۔ وہ اکلوتی تھی گھر بھر کی لاڈلی، تین بڑے بھائیوں کی جان تھی۔ ابا جان نے دنیا کی ہر نعمت اس کی نذر کر رکھی تھی اسے کانٹا بھی چبھتا تو سارے گھر میں درد محسوس ہوتا۔ سب اسے بس خوش دیکھنا چاہتے تھے اسے ہر کام کرنے کی آزادی تھی مگر آج پتہ نہیں وہ افسردہ اور حیران تھی۔ کیا' کیا تھا اس آدمی نے۔ اس کی باتوں میں عجیب سی اپنائیت تھی ایسی کہ بے اختیار جی چاہے کہ اس کے چوڑے شانے پر سر رکھ کے سو لیا جائے۔ وہ ذرا بھی ڈری' جھجکی نہیں تھی حالانکہ پہلی مرتبہ اسے ملی تھی۔ یہ کیا ہوا تھا یوں لگ رہا تھا کہ وہ اسی کی ہو کر رہ گئی تھی۔

"بے بی کیا ہوا؟" بھائی نے پوچھا۔ "تم کبھی اتنی دیر خاموش رہ ہی نہیں سکتی ہو۔ کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا۔"

"کچھ نہیں۔" اس کے لہجے کی اُداسی چھپی نہ رہ سکی۔ "اے بہنا کسی سے محبت تو نہیں ہوگئی۔" حوریہ نے چونک کر دیکھا یوں جیسے اس کی چوری پکڑ لی گئی ہو۔ "ابھی مجھے خود پتہ نہیں ہے کچھ ہوا تو بتا دوں گی ابھی مجھے کل کے لیکچر کی تیاری کرنی ہے۔" وہ اُٹھ گئی تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ "پگلی بھلا ہم نے کبھی کسی بات سے منع کیا۔ تمام کی ہے۔ وہ جانتی ہے ہم اس پر اعتماد کرتے ہیں وہ کبھی کچھ غلط نہیں کرے گی۔" سب مسکراتے ہوئے اُٹھ گئے۔

حوریہ کمرے میں پہنچی تو فون کی بیل بج رہی تھی۔ اس نے فون اُٹھا کر کان سے لگایا اور دوسری طرف وہی سحر انگیز آواز موجود تھی۔ آواز نے کان

میں رس گھولا تو حوریہ نے آنکھیں بند کرلیں کیا یہ کوئی خواب ہے۔ "حوریہ" آواز پھر گونجی۔ "جی......" وہ بمشکل کہہ پائی۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" دوسری جانب تشویش تھی۔ "میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟"

"وہ تو آپ کرچکے ہیں؟" حوریہ نے ایک آہ کھینچی پھر اچانک وہ جیسے ہوش میں آئی۔ یہ کیا کہہ دیا بے خودی میں" وہ، وہ میں کچھ اور کہنا چاہتی تھی سوری"۔

"حوریہ ایک بات کہنا چاہتا ہوں"

"جی کہیے"۔ وہ جلدی سے گویا ہوئی۔

"میں آپ سے زیادہ ڈسٹرب ہوچکا ہوں۔ پچھلے دو تین دن سے میں مسلسل کسی اور دنیا کی سیاحت میں ہوں۔ اس میں آپ میرے ساتھ ہیں میں خود کو روک نہیں پا رہا آپ کی طرف بڑھنے سے۔ آنے والے وقت کا مجھے پتہ نہیں مگر موجودہ وقت میرے لئے بہت مشکل اور بھاری گزر رہا ہے۔ آپ کسی پل نظروں سے اوجھل نہیں ہوتیں میں معذرت چاہتا ہوں مگر صاف گو ہوں یہ سب کہنے سے خود کو روک نہیں سکا۔"

زندگی اتنی تیز رفتار ہے کہ سب کچھ بس جلدی جلدی ہی ہوجاتا ہے اور ہم سوچتے رہ جاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے یہ اظہار محبت سنتی رہی اس کے دل کی دنیا تو پہلے ہی اتھل پتھل تھی۔ اس نے بغیر کچھ کہے فون بند کردیا۔ حوریہ خالی ذہن اور خالی آنکھوں سے کافی دیر موبائل کو گھورتی رہی زندگی میں پہلے بھی میں نے ان باتوں کے بارے کیوں نہیں سوچا۔ وہ سوچوں میں گم تھی کہ بیڈروم کے دروازہ پر دستک ہوئی۔ دروازے پر امی کھڑی تھیں دودھ کا گلاس لئے۔ حوریہ کے چہرے پر تفکر کی لکیریں دیکھ کر وہ پریشان ہوگئیں۔ "حوریہ بیٹے کیا ہوا؟"

"کوئی خاص بات نہیں امی۔" وہ بے رونق سی آواز میں بولی۔ خود اسے اپنا آپ بے اعتباری سا لگا۔ یقین کرنے میں وقت لگے گا۔ یہ سب کچھ ایسے اچانک تھوڑی ہوجاتا ہے ہر بات کے لئے وقت چاہئے ہوتا ہے۔ محبت بھلا اچانک بھی ہوجاتی ہے یہ کیسے ممکن ہے۔

سیمینار کا اگلا دن بے حد مصروف تھا آخری دن تھا اور سارا پروگرام وائنڈ اپ کرنا تھا۔ حوریہ کے پاس آج کے لئے اہم ذمہ داری تھی اسے انسان کے نفسی کردار پر بات کرنی تھی۔ اس نے کافی عرصہ پہلے سے اس موضوع کو سیلیکٹ کررکھا تھا۔ اس پر کافی محنت بھی کی تھی بہت سے پوائنٹ بھی بنا رکھے تھے مگر یہ کیا جب وہ سٹیج پر آگئی تو سب سے پیچھے بیٹھے اک عجیب اور منفرد سے شخص نے اس کی ساری توجہ کھینچ لی۔ یہ بہروز خان تھے وہ حسب سابق ہر چیز اور شخص سے لاتعلق سے بیٹھے تھے۔ وہی عام سا حلیہ مگر وہ دراصل کیا تھے یہ حوریہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں تھیں۔ "لیڈیز اینڈ جینٹل مین آج مجھے ایک اہم موضوع پر بات کرنی تھی مگر لگتا ہے کوئی ہے جو مجھ سے بہتر بات کرسکتا ہے۔ میں ہمارے ایک معزز مہمان کو دعوت دوں گی کہ وہ سٹیج پر آئیں اور اس موضوع پر اپنا نقطہ نظر بیان کریں..... محترم ڈاکٹر بہروز خان۔"

ڈاکٹر بہروز خان حیرت سے سٹیج کی طرف دیکھ رہے تھے لوگ مڑ مڑ کر پیچھے بیٹھے اس عام سے آدمی کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ حوریہ پاگل ہوگئی ہے۔ سٹیج سیکرٹری غصے میں گیا۔ "مس حوریہ آپ نے اچھی طرح سوچ لیا ہے کہ آپ یہ کیا کررہی ہیں؟"

"یہ میرا ٹائم ہے، مسٹر گل باز اور میں جانتی

ہوں کیا کر رہی ہوں۔"

ڈاکٹر بہروز خان بالوں میں ہاتھ پھیرتے سٹیج پر آئے ایک اچٹتی سی نظر سامعین پر ڈالی پھر حوریہ کو دیکھا وہ جنت کی حور سی بُت کی طرح ان کے پہلو میں ایستادہ تھی۔ "آپ واقعی چاہتی ہیں کہ میں اس موضوع پر بات کروں؟" بہروز خان نے اپنی مخصوص گمبھیر اور پراثر آواز میں پوچھا۔ "جی ڈاکٹر" حوریہ نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرائے۔ "لیڈیز اینڈ جینٹل مین......" اور پھر ایک لمحہ جیسے سارے ہال پر سکتہ طاری ہوگیا۔ صرف ڈاکٹر بہروز کی آواز گونج رہی تھی اور بڑے بڑے نفسیات دان اور ڈگریوں والے حیرت سے اس آواز کے سحر اور لفظوں کے زیروبم میں کھوئے رہے۔ "میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا" وقت جیسے انگڑائی لے کر جاگ اٹھا تھا۔ "مس حوریہ کا شکرگزار ہوں انہوں نے مجھے بغیر آگاہ کیے میرا امتحان لیا۔ میں نہیں جانتا اس میں کامیاب ہوا ہوں کہ نہیں یہ تو میڈم حوریہ ہی بتائیں گی، بہت شکریہ۔" وہ دھیمے دھیمے چلتے ہوئے سٹیج سے اتر کر پھر اپنی مخصوص نشست پر جا بیٹھے اور حوریہ تو جیسے وہاں تھی ہی نہیں۔ کسی خواب میں چلتی ہوئی وہ سٹیج پر آئی "ڈاکٹر بہروز آپ اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے ہیں، آپ کا بے حد شکریہ۔" اختتامی کلمات کے بعد وہ نیچے اتر آئی۔

لوگ نشستوں سے اٹھنا شروع ہو گئے۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بہروز سے ملے اور ڈاکٹر بہروز ملتے ملتے ویسے ہی گھبرا چکے تھے۔ "میں جانا چاہتا ہوں حوریہ۔"

"میرے بغیر؟"۔ وہ یکدم مڑی تو اس کی حسین سبز آنکھوں میں ستارے ناچ رہے تھے۔ ایک لمحے کو [illegible] بہروز [illegible] پھر بولے۔ "تو

چلیں پھر پریس نہ گر پڑے۔" بہروز نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "ایک بات کا تمہیں پتہ ہے کہ تم بہت اچھا خوبصورت ہنستی ہو" وہ شرما گئی۔

پھر وقت اس تیزی سے گزرا کہ دونوں کو ہی خبر نہ ہوئی وہ تو اپنے آپ میں ہی مگن تھے۔ دو ماہ گزر گئے تھے بہروز خان کی چھٹیاں ختم ہوگئی تھیں۔ واپسی کی تیاری اسے بہت بھاری لگ رہی تھی۔ بہت مشکل تھا اپنی محبت سے جدا ہونا اور حوریہ تو جیسے اپنا سب کچھ ہار چکی تھی۔ وہ کیسے رہ پاتی بہروز کے بغیر اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ گھر والوں سے بہروز خان کو ملوا دے۔ وہ ہمیشہ ہی سرپرائز دیا کرتی تھی سو اب بھی اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ ایک خاص شخصیت سے سب کو ملوانے والی ہے۔

گھر کی صفائی ستھرائی شروع ہوئی۔ برتن کھانے کے انتظامات اور بہت کچھ۔ پھر اس نے بہروز خان کو فون کردیا کہ آپ کو میرے گھر آنا ہے گھر والوں سے ملنے۔ بہروز حیران رہ گئے۔ "مگر کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنا ہے۔" حوریہ نے وضاحت کی۔

"حوریہ میں نے تو ایسا کچھ نہیں سوچا دوستی اور محبت اپنی جگہ مگر شادی کا فیصلہ آسان نہیں ہے۔ میں نے ابھی سوچا ہی نہیں۔ محبت کرتا ہوں مگر میں ایسے ہی رہنا چاہتا ہوں کسی بندھن کے بغیر۔"

"بہروز خان یہ پاکستان ہے ایک مشرقی معاشرہ ہے یہاں شادی کے بغیر مرد عورت کے ایک ساتھ زندگی گزارنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسی کوئی گنجائش نہیں۔" حوریہ سنجیدہ ہوگئی۔

"حوریہ ہمیں امریکہ میں رہنا ہے۔ وہاں کوئی پابندی نہیں وہاں کوئی نہیں پوچھتا ہم جیسے

چاہیں اپنی مرضی سے زندگی گزار سکتے ہیں تم جب تک چاہو میرے ساتھ رہ سکتی ہوں جب دل بھر جائے واپس آ جانا۔ شاید میں کبھی شادی کے بارے میں سوچوں تو میری اولین ترجیح تم ہی ہوگی۔ مگر ابھی نہیں۔ میں لائف انجوائے کر رہا ہوں۔"

"بہروز تم مسلمان ہو؟"

"ہاں بظاہر میں ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوا مگر وہاں اسلام کی پابندی نہیں تھی۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں مسجد میں جاؤں چرچ میں یا مندر میں۔"

حوریہ کے لیے یہ سب غیر متوقع تھا۔ وہ ان باتوں سے انجان ہی بہروز کے حصول کے لئے اس کی محبت میں بڑھتی چلی گئی تھی۔ اب بہروز خان کا نیا روپ دیکھ کر وہ تو دکھ کی گہری کھائی میں جا گری۔ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اتنی بڑی چوٹ تھی کہ اس کے لیے سنبھلنا آسان نہ تھا۔ وہ بالکل گم صم ہوگئی۔ فون بند ہوگیا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا اور فون اس کے ہاتھ سے فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ کتنی ہی دیر سر تھامے وہ بیٹھی رہی۔ بہروز جیسے نفیس انسان سے اسے ہرگز ایسی کسی بات کی توقع نہ تھی۔ وہ تو یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ بہروز یہ سن کر خوش ہو جائے گا مگر اس نے تو حوریہ کو پستی کی گہرائیوں میں دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔ جیتے جی جیسے وہ تو مر ہی گئی تھی۔

ساری شام گھر والے باہر گارڈن میں انتظار کرتے رہے کہ وہ ٹی بریک پہ آئے گی مگر وہ نہ آئی۔ سب کو تشویش تھی۔ "صفورا....." آخر تھک کر والدہ نے ملازمہ کو پکارا۔ "دیکھو ذرا بی بی حوریہ نہیں آئیں کیا بات ہے۔"

دوسرے ہی لمحے وہ بھاگی ہوئی واپس آئی۔

"بیگم صاحبہ حوریہ بی بی تو بیڈ پر الٹی پڑی ہیں۔"

[illegible] کی طرف

بھاگے۔ "نصر ڈاکٹر کو فون کرو یار۔" سارے حوریہ لاج میں ہلچل مچ گئی۔ ڈاکٹر آ گیا اور چیک اپ کے بعد بولا "انہیں ہسپتال ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔"

پرائیویٹ ہسپتال کا کمرہ بک ہوگیا۔ کیا ہوا تھا کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ کوئی دماغی جھٹکا لگا ہے جس کی وجہ سے ان کا BP لو ہوگیا میڈیسن دیدی ہے جلد بہتر ہو جائیں گی۔"

لیکن کل تک تو میری بچی بہت خوش تھی کیا یہ سرپرائز تھا کہ سارا گھر پریشان کر دیا۔ کیا کروں میں اس لڑکی کا اپنی مرضی کرتی ہے اور کسی کو کچھ بتاتی بھی نہیں۔" ماں کی پریشانی واضح تھی۔ اچانک بھائی کو اس کے موبائل فون کا خیال آیا جس پر مسلسل کوئی کال آ رہی تھی۔ بھائی نے نہ چاہتے ہوئے بھی کال اٹینڈ کی۔

"جی میں بہروز خان بات کر رہا ہوں۔ مس حوریہ سے اگر بات کروا دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔"

"جی ان کی طبیعت ناساز ہے ابھی وہ بات نہیں کر سکیں گی جیسے ہی وہ بہتر ہوں گی میں آپ کا میسج انہیں دے دوں گا۔" چھوٹے بھائی اظہر نے جواب دیا۔ "جناب میں جان سکتا ہوں کہ انہیں کیا ہوا؟"

"کل اچانک ان کا BP لو ہوگیا وہ ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔"

"کیا؟" بہروز تڑپ اٹھا۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میری باتوں نے ایک نازک سی خاتون کو بیمار کر دیا۔ بہروز بے چین ہو کر باہر نکل آیا۔ کیا کروں یار میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا اور اسے حاصل بھی نہیں کر سکتا کیا کروں۔ میرے خیالات جان کر تو وہ ویسے بھی اب مجھ سے نفرت کرے گی ہوسکتا ہے مجھ سے بات بھی نہ کرے۔ یہ میں نے کیا کر دیا، وہ پریشان ہوگیا۔ دل ملامت کرنے لگا۔ یہ کوئی زندگی ہے جو میں جی رہا ہوں بس نام کا انسان

ہوں۔ مشرقی پس منظر رکھنے کے باوجود میں ایک امریکی دہریہ بن چکا ہوں۔ بھلا ایک پاکستانی لڑکی کیسے مجھ جیسے شخص کو قبول کرے گی حوریہ بے شک آزاد خیال سہی مگر وہ ایک باپردہ مشرقی لڑکی ہے۔ مجھے چپکے سے چلے جانا چاہئے تھا۔ اسے یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت کیا تھی۔ وہ تو شادی کا پروگرام بنا چکی ہے۔ میں کیا کرتا پھرتا ہوں نا کوئی زندگی کا مقصد نہ مطلب نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ کیا ہوں میں کیا کرتا پھرتا ہوں، میرا مستقبل کیا ہے۔ تنہائی' ویرانی' بے انت تنہائی' بے شمار اکیلا پن' خلا ہی خلا زندگی میں ایک رونق آئی اسے بھی میں نے کھو دیا۔ آخر میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ اتنا خوبصورت اور نازک دل توڑ کر آخر میں کیا حاصل کروں گا۔ اسے لگا اس کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں زندگی میں پہلی دفعہ اسے اپنے ہونے کا احساس ہونے لگا۔

میں بنا بااعتماد اور عزت دار آدمی آج ایک لڑکی کے آگے کتنا چھوٹا ہو گیا ہوں۔ محبت میں چھوٹا ہو گیا ہوں اور وہ ..... اس نے واقعی سچی محبت کی تھی وہ تو جان دینے پر آمادہ ہو گئی۔ اس نے سارے جذبے کیسے پاک رکھے اور میں ناپاک ہو گیا ہوں۔ وہ سوچتے سوچتے نہ جانے کہاں نکل آیا تھا۔

آج زندگی کی سمجھ آ رہی ہے تھی۔ آج پتہ چلا تھا کہ محبت کیا ہے اور اگر محبت اپنا وجود رکھتی ہے تو وہ اپنا آپ منواتی بھی ہے اور وہ اپنا آپ منوا بھی رہی تھی۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ جسے محبت کہتے ہیں وہ تو توڑ کر کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ محبت مار ڈالتی ہے تو زندگی بھی یہی دیتی ہے۔ میں واقعی حوریہ سے محبت کرتا ہوں اور یہ بھی کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ بھی کہ مجھے وہ سب کرنا پڑے گا جو حوریہ چاہتی ہے۔ دراصل اس کی خوشی میں میری خوشی ہے۔ اب مجھے حوریہ کے لئے اتنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ کسی فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

"صفرا دیکھو گیٹ پر کون ہے۔"

صفرا واپس آ گئی، "بیگم صاحبہ کوئی بہروز خان صاحب ہیں آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"اچھا انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور انصر اور اظفر کو بلا لو۔"

صفرا بہروز خان کو لے کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ نہایت عمدہ سوٹ میں ملبوس خوبصورت آنکھوں والا آدمی بہت بارعب پرسنیلٹی تھی۔ حوریہ کی والدہ اندر آئیں تو وہ آداب کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "بیٹھو بیٹے کہو ہم تمہیں جانتے تو نہیں مگر حوریہ نے تمہارا ذکر کیا ہے ایک دو دفعہ۔"

"جی میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔" انھوں نے تھوڑا توقف کیا پھر سنجیدگی سے کہنے لگے، "میں اور حوریہ پچھلے 3 ماہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" اس دوران انصر اور اظفر بھی ہاتھ ملا کر بیٹھ گئے تھے۔ بہروز خان نے اپنے بارے میں سب کچھ انہیں بتا دیا اور حوریہ اور اپنے تعلق کے بارے میں بھی سب سچ بتا دیا اور یہ بھی کہ حوریہ کے بیمار ہونے کی وجہ وہ خود ہے چونکہ وہ حوریہ سے محبت کرتا ہے اسے پانا چاہتا ہے اس لئے سارا سچ ان کے سامنے رکھ دیا۔

"اب آپ لوگ فیصلہ کریں جیسا آپ کہیں گے میں ویسا ہی کرنے کو تیار ہوں بس حوریہ سے کہیں کہ وہ مجھے معاف کر دے۔"

سب حیران تھے۔ تو سرپرائز یہ تھا جو ملنے سے پہلے الٹ گیا تھا۔

"حوریہ کی خوشی سے زیادہ ہمارے لئے کچھ نہیں ہے۔ ہم سب اس پر غور کریں گے اور کسی حتمی فیصلے پر پہنچ کر تمہیں اطلاع کر دیں گے۔" حوریہ کی والدہ نے کہا۔

نصر شام کو گھر آیا تو اسے بھی ساری تفصیل کا پتہ چلا۔

"تو کیا فیصلہ ہوا پھر جلدی بتایئے۔" وہ ماں کے پیچھے پڑ گیا۔

"ہاں کچھ سوچتے ہیں۔" وہ ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچی تھیں۔

"امی میں تو چاہتا ہوں کہ اب ہم سب حوریہ کو سرپرائز دیں۔ اس کی منگنی کر دیتے ہیں حوریہ اچانک بہروز بھائی کو دیکھے گی تو حیران ہو جائے گی۔"

"اور اگر حوریہ نے انکار کر دیا تو؟" اس کی والدہ نے سوال اٹھایا۔

"نہیں امی مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گی۔" نصر بضد رہا۔

"اچھا اپنے والد صاحب کو آ لینے دو پھر کوئی پروگرام بناتے ہیں۔"

دو دن بعد حوریہ گھر آ گئی تھی مگر اسے بالکل یہ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو گیا تھا۔ حوریہ بے حد سنجیدہ ہو چکی تھی آنکھوں میں عجیب سی اُداسی تھی چپ چاپ وہ اپنے کمرے میں پڑی کتابیں پڑھتی رہتی۔ نہ کالج جاتی نہ اکیڈمی۔ ایک ہفتے بعد حوریہ کی منگنی کا اعلان کروایا گیا تو اس نے کوئی احتجاج نہ کیا جیسے زندگی اور خوشی سے دل ہی اُٹھ گیا ہو۔ بہروز خان کو بات کرنے سے روک دیا گیا تھا اور حوریہ نے ویسے ہی فون کی طرف مڑ کر نہ دیکھا تھا۔

لٹی پٹی سی حوریہ کا حسن ماند پڑ گیا تھا بہت دفعہ والدہ نے پوچھا بھی مگر وہ کچھ نہ بولی۔ بھائیوں نے بھی ہنسی مذاق کیا مگر وہ چپ رہی۔ نصر سے نہ رہا گیا۔ "حوریہ ابھی بھی سوچ لے تو محبت کا گلا گھونٹ کر خود کو تباہ کرنے جا رہی ہے۔" مگر وہاں تو کوئی صدائے احتجاج تھی ہی نہیں شاید وہ حالات سے سمجھوتہ کر بیٹھی تھی۔

ورزش کے ساتھ سبز چائے کا استعمال موٹاپے میں کمی کرتا ہے

کہا جاتا ہے کہ سبز چائے منہ کے کینسر اور ذیابیطس سے بچانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے مگر یہ گرم مشروب موٹاپے سے نجات دلانے کے لیے بھی مفید ہے۔ تحقیق کے مطابق ورزش کے ساتھ ساتھ سبز چائے کا استعمال موٹاپے کو کم کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ تجربات کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ سبز چائے میں شامل اجزا سے جسمانی چربی کی شرح میں ایک ماہ کے دوران نمایاں کمی آتی ہے۔ محققین کے مطابق ہفتے میں تین بار ایک گھنٹے کی ورزش کے ساتھ روزانہ چھ سے سات کپ سبز چائے کا استعمال جسمانی وزن میں کمی لانے کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے۔ سبز چائے میں ای جی سی جی نامی ایک جز پایا جاتا ہے جو عام خلیات کو نقصان نہیں پہنچاتا تاہم کینسر کے خلیات کو منہ سے ختم کرتا ہے۔

منگنی کا دن آ پہنچا۔ سارا گھر دلہن کی طرح سج رہا تھا' مہمان آ رہے تھے' کھانے پک رہے تھے' سکھیاں بیوٹیشن کے ساتھ اسے سجا سنوار رہی تھیں۔ مگر حوریہ جیسی چنچل شوخ لڑکی چپ تھی سب حیران تھے نہ جانے اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔ منگنی کی رسم شروع ہوا چاہتی تھی۔ خوبصورت سٹیج پر دولہا میاں تو پہنچ چکے تھے سب بے حد خوش تھے حوریہ اس سوگوار حسن میں بھی قیامت ڈھا رہی تھی وہ نگاہیں نیچی کیے دولہا کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ نجانے کیوں اسے بے چینی ہو رہی تھی کچھ تو تھا کہ وہ بے قرار تھی۔ طبیعت پھر بگڑنے لگی تھی۔ انگوٹھیاں پہنانے کی رسم شروع ہوئی وہ ہیرے کی انگوٹھی لئے منتظر تھا جیسے ہی اس نے انگوٹھی پہنائی حوریہ نے

اچانک ہی نگاہیں اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے لمبا تڑنگا بے حد وجیہہ حسین آنکھوں والا بہروز بہترین لباس میں خوشبوؤں سے لدا پھندا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں جھپکی تو پھر دولہا کے بازوؤں میں گر گئی۔

یہ کیا ہو گیا۔ سارے مہمان کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ والدہ نے جلدی سے بیٹی کو سینے سے لگا لیا کزن ڈاکٹر بھاگا ہوا آیا، نبض چیک کی "BP لو ہو گیا ہے، ابھی ٹھیک ہو جاتی ہیں۔"

"میں نے کہا تھا کہ اسے سب کچھ بتا دو۔ دے دو سرپرائز۔ مجھے پتہ تھا ایسا ہوگا۔" ماں نے بیٹوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ ہوش میں آ گئی بہروز نے اس کا نازک سا ہاتھ تھام رکھا تھا وہ بے حد پشیمان تھا۔

وہ دوبارہ دوپٹہ درست کر کے بیٹھ گئی اور اس ہی صورتحال کو دیکھنے لگی۔ بہروز ساتھ بیٹھے تھے جوڑی نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت لگ رہی تھی۔

"بے ہوش ہونا بھی آپ کا ایک مشغلہ ہے؟" اس نے آہستہ سے کہا تو حوریہ یکدم سرخ پڑ گئی۔

"آپ کی حرکتیں اور باتیں ہی ایسی ہیں۔" حوریہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

"میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ..... شادی کی رات بھی کہیں ہسپتال میں نہ گزارنی پڑے۔" حوریہ پھر سے شرما کر دوہری ہو گئی۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ "بھئی اس نازک سی حوریہ کے بے پناہ حسن کے سامنے بہروز خان تو پانی کی طرح بہہ گیا۔ جیسا تم نے چاہا میں ویسا بن گیا، بننا ہی پڑا۔ تمہارے گھر والوں نے تمہیں کچھ بتانے سے منع کیا تھا ورنہ میں تو تمہیں بتانے کو بے چین رہا۔ یہ ہفتہ کیسے گزرا بتا نہیں سکتا۔ تم نے ایک بے دین امریکی کو سچا پاکستانی اور مسلمان بنا دیا۔ ورنہ تمہیں کیسے حاصل کرتا۔

"تمہیں پا لیا تو لگا سارا جہان مل گیا ہے۔ تمہاری فیملی بہت اچھی ہے، عمدہ لوگ ہیں تمہاری والدہ اور والد بڑے نفیس اور سلجھے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا تو انہوں نے بُرا منانے کے بجائے میری رہنمائی کی، مجھے صحیح راستہ دکھایا اور یوں مجھے تمہارے قابل بنا دیا۔

"اور یوں تمہاری وجہ سے ایک بھٹکا ہوا راہی راہ راست پر آ گیا اور تمہارے پہلو میں بھی جگہ مل گئی۔ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے ناں؟" وہ سراپا سوال بنا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"جی ہاں، کر دیا ہے۔" وہ مسکرائی۔ دونوں ہی ایک دوسرے میں گم تھے۔

جلد ہی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی۔ سارے رشتہ دار اور جاننے والے انگشت بدنداں تھے کہ اتنا شاندار داماد انہیں کیسے مل گیا۔ وہ یہ کہاں جانتے تھے کہ محبت نے کیسے کیسے رنگ دکھائے تھے۔ والدین بیٹی کی جدائی سے پریشان تو تھے مگر یہ فریضہ تو انجام دینا ہی تھا۔ شادی دھوم دھام سے ہو گئی تھی اور شادی کی رات کو دلہن بنی حوریہ واقعی جنت سے آئی ہوئی حور لگ رہی تھی۔

حجلۂ عروسی میں بہروز اندر آئے اور حوریہ کا نام لیکر پکارا..... حوریہ نے بمشکل آنکھیں اُٹھائیں اور ہمت کر کے کہا..... "جی....."۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا اس کے ہاتھ سے کھیلنے لگا۔ پھر اچانک بولا، "ڈاکٹر کی ضرورت ہو تو ابھی سے بلوالوں.....؟" وہ شرارت سے ہنسا اور حوریہ "بہت بُرے ہو....." کہتے ہوئے اس کے بازوؤں میں سما گئی۔ "کاش یہ زندگی ہمیشہ دلہن کی سیج بنی رہے" حوریہ نے کہا تو دونوں ہنس دیئے۔

شیخ نور الحق قطب عالمؒ

• پروفیسر غلام رسول

"اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک بھائی شاہی دربار میں اعلیٰ منصب پر فائز ہے جان نچھاور کرنے والے ارادت مندوں کا ہجوم باپ کے ہمراہ ہوتا ہے اور مخدوم زادہ مریدوں اور درویشوں کی خدمت کو ہی معراج سمجھتے ہوئے ان کے میلے کپڑے دھو دھو کے خشک کر کے تہہ کرتا ہے اور ملازموں کی طرح ان کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔"

برگزیدہ ہستی کے حالات زندگی، جنہوں نے زندگی رضائے الٰہی کیلئے وقف کردی تھی

شیخ نور الحق وہ صاحب بزرگ ہستی ہیں جنہوں نے سرزمین بنگال میں اسلام کی شمع روشن کی۔ بنگال جو کفر کی فضا میں سانس لے رہا تھا وہاں آپ نے اللہ کی وحدانیت کا علم بلند کیا۔ خدا سے سرکش اور نافرمان بندوں میں ان کے خالق کا نام پھیلانا ایک کٹھن کام تھا لیکن آپ نے اسے اپنے مقصد حیات کے طور پر اپنایا اور اس پل صراط کو پار کرنے میں لگ گئے۔ جہاں تباہیاں، بربادیاں اور بلائیں آپ کا مقدر تھیں جہاں دکھ ہی دکھ تھے لیکن آپ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے تکالیف برداشت کرتے اللہ کے نام کی روشنی سے کفر کے باطل اندھیروں میں اجالا کرنے میں مصروف رہے۔ صبر و تحمل کی انتہا کردی۔ مخدوم تھے لیکن دین اسلام کی تبلیغ کے لئے خادم بن کر زندگی گزاری۔

722 ہجری میں پیدائش ہوئی۔ دادا اسد لاہوری جن کا سلسلہ نسب حضرت خالد بن ولیدؓ سے جا ملتا تھا بنگال کے شاہی دربار سے منسلک تھے۔ دادا کی خواہش تھی کہ پوتے کو اپنے رنگ میں رنگیں بیٹا تو باپ کی منتخب کردہ راہ پر نہ چل سکا پوتا ہی سہی لیکن ہوش سنبھالتے ہی پوتے نے جو رنگ ڈھنگ نکالے وہ باپ کے نقش قدم پر چلنے کے تھے۔ علاءالدین وہ بزرگ ہستی تھی جنہوں نے باپ کی خواہش کے مطابق دربار شاہی سے وابستگی تو رکھی لیکن پھر یہ کہہ کر علیحدہ ہوگئے کہ میری زندگی کی بنیاد کلمہ طیبہ پر ہے یعنی لا الہ الا اللہ، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں پھر میں کیسے دربار سرکار سے وابستہ رہوں۔ جہاں دنیاوی بادشاہ الہ کی مانند نظر آتے ہیں اور میں تو اللہ کو ہی معبود سمجھتا ہوں میں سوائے اللہ کے دوسرے تمام معبودوں سے دامن چھڑانا چاہتا ہوں میں صرف ایک خدا کے آگے سجدہ کرنا چاہتا ہوں میں بقیہ ہزاروں سجدوں سے نجات چاہتا ہوں۔

چنانچہ شاہی ملازمت چھوڑ کر دین حق کی راہ میں زندگی وقف کردی۔ دور دور سے طالبان حق مرید اور ارادت مند آتے اور خانقاہ میں ایک ہجوم سے رکھتے نورالحق بھی دادا کی خواہش کے برعکس کہ دربار شاہی میں کسی منصب کے حصول کے لئے تیاری کریں باپ کی خانقاہ میں مریدوں و ارادت مندوں کی دن رات خدمتوں میں وقت گزارنے لگے۔ لیکن سلسلہ درس بھی جاری رہا۔ نورالحق کا ایک ہم شہزاد سبق غیاث الدین بھی تھا۔ بعد میں بادشاہ بنا وہ اپنے اس ہم جماعت نورالحق کو بہت دلچسپی سے دیکھتے چپ چاپ رہنے والا دوسروں کی نسبت منکسرانہ مزاج رکھنے والا یہ ہم عمر انہیں بہت بھایا۔ اس کوشش میں رہتے کہ کسی طرح آپ سے دوستی پیدا کریں لیکن نورالحق نجانے کیوں فاصلہ رکھتے شہزادہ جوں قریب آتا آپ فوراً دوری اختیار کرتے۔ شہزادے سے کترانے کی کوششیں کرتے شہزادہ ان کے اس رویئے سے بہت تکلیف محسوس کرتا۔ اس کی خواہش ہوتی کہ نورالحق کبھی اس سے کوئی درخواست کریں کسی چیز کی فرمائش کریں مگر نور الحق نے ان کی کبھی یہ خواہش پوری نہ کی۔ ایک دن شہزادہ غیاث الدین آپ کے پاس جا بیٹھا اور کہنے لگا ہم ایک جماعت میں ہیں ہمارا یہ تعلق اگر تم چاہو تو زندگی بھر بھی قائم رہ سکتا ہے اور مجھے اس کی خواہش بھی ہے تمہارا کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟

نورالحق نے شہزادے کو حیرانگی سے دیکھا اور پوچھا ''زندگی بھر کا تعلق ہم میں کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔؟''

شہزادہ بولا ''نورالحق سیدھی سی بات ہے جب تم اپنی تعلیم مکمل کرلو تو ہمارے دربار سے وابستہ ہوجانا کیونکہ تب تک ہم بادشاہ بن چکے ہوں گے۔'' نور الحق نے شہزادے سے پوچھا لیکن تم نے یہ کس طرح سوچ لیا کہ ہم تحصیل علم کے بعد شاہی دربار سے وابستگی اختیار کرنا چاہیں گے؟

شہزادہ بولا ''پھر اس علم کے حصول کی کیا وجہ ہے؟ علم اسی لئے تو حاصل کیا جاتا ہے کہ اس سے دربار شاہی میں جا کہیں اور اچھا سا منصب سنبھالا جائے۔ بھلا اس کے علاوہ اور مقصد ہو بھی کیا سکتا ہے۔ آپ جو اس طرح تحصیل علم میں لگن کا اظہار کررہے ہیں یقیناً آپ بھی اس کے بعد اس علم سے اسی طرح فائدہ اٹھانے کی سوچتے ہوں گے۔''

نورالحق بولے ''شہزادے یہ آپ کی کم فہمی ہے۔ ہم علم کا حصول کسی درباری منصب یا بادشاہ کی قربت کے حصول کے لئے ہرگز نہیں کررہے ہم علم سے عرفان کی بلندی چاہتے ہیں۔ اپنی ذات کے عرفان کا حصول ہی ہمارے علم کی معراج ہے درباروں اور بادشاہوں کا قرب حاصل کرنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں اپنے علم کو پتی میں ہی ڈبو

دوں ذلیل و خوار کر کے رکھ دوں۔"

شہزادہ یہ سن کر طیش میں آ گیا اور بولا۔ "بس بس نورالحق تم سے مجھے ایسی کم عقلی کی امید نہ تھی۔ ایک عالم دولت و ثروت کو سجدہ کرتا ہے۔ میں خاندانی شہزادہ ہوں اور اللہ نے چاہا تو وہ وقت بھی دور نہیں جب تم جیسے بہت سے ذی علم میری قربت کی خواہش رکھیں گے اگرچہ تم نے اپنی باتوں سے میرے دل پر چوٹ لگائی ہے تمہاری باتوں سے مجھے دکھ بھی بہت پہنچا ہے لیکن ہم جماعت ہونے کے ناطے میں اپنی یہ پیشکش برقرار رکھتا ہوں۔"

شیخ نورالحق نے شہزادے کی باتیں سنیں اور پھر مسکرا کر بولے۔ "شہزادے خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے اور خوش و خرم رہیں لیکن میں اپنے اللہ سے یہی چاہوں گا کہ وہ مجھے بادشاہوں کے دربار سے دور ہی رکھے۔"

سلسلہ تدریس ختم ہوا۔ علاء الدین نے اپنے بیٹے نورالحق سے دریافت کیا۔ "بیٹا اب تمہارے کیا ارادے ہیں اگر تم چاہو تو اپنے بھائی اعظم خان کی طرح شاہی ملازمت اختیار کر لو۔"

لیکن نورالحق نے جواب دیا۔ "پدر بزرگوار! میں آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں آپ کی اور آپ کے مریدوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

علاء الدین یہ سن کر خوشی سے جھوم اٹھے پھر بھی اپنے صوفی مزاج بیٹے سے کہنے لگے "کیا تم جانتے ہو کہ جس راہ کا تم انتخاب کر رہے ہو وہ کس حد تک خاردار اور تکلیفوں سے پر ہے۔ یہ راستہ مصائب کی دلدل سے گزرتی دھوپ کا طویل سفر ہے کہیں چھاؤں نہیں۔

بیٹے کا ایک ہی جواب تھا "ہاں میں سب جانتا ہوں سب کچھ سمجھتا ہوں میں اپنے اس فیصلہ کے بھیانک آثار کی حقیقت سے بھی آگاہ ہوں لیکن مجھے یہی راہ پسند ہے کیونکہ میں اس فانی زندگی کے اعمال کو اتنا دیرپا نہیں سمجھتا کہ وہ آخرت میں میرے کام آسکیں میں وہ کام کرنا چاہتا ہوں جو آخرت میں مجھے خدا کے آگے سرخرو کریں عقبیٰ میں میرا ساتھ دیں۔"

باپ نے بیٹے کے خیالات اور نظریات جانے تو خوش ہو کر بولے "نورالحق..... جان پدر خدا تجھ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے تجھے بامراد کرے اور نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔"

چنانچہ نورالحق باپ کی خانقاہ میں رہنے لگے اور وہاں موجود مریدوں، درویشوں اور ارادت مندوں کی خدمت کرنے لگے۔

اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک بھائی شاہی دربار میں اعلیٰ منصب پر فائز ہے، باپ کے ہزار ہا مرید ہیں عقیدت مند ہیں جان نچھاور کرنے والے ارادت مندوں کا ہجوم باپ کے ہمراہ ہوتا ہے اور مخدوم زادہ مریدوں اور درویشوں کی خدمت کو ہی معراج سمجھتے ہوئے ان کے میلے کپڑے دھو رہا ہے خشک کر کے تہہ کرتا ہے اور ملازموں کی طرح ان کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ جنگل سے سخت محنت و مشقت کے بعد کلہاڑی سے لکڑیاں چیر کر لاتا ہے سر پر لکڑیوں کا گٹھا لادے واپس آتا ہے تو اس حال میں کہ پسینہ سے چہرہ، جسم اور کپڑے بھیگے ہوتے ہیں لوگ حیرت اور افسوس سے دیکھتے دکھ کا اظہار کرتے کہ مخدوم زادے نے تو پڑھ کر ہی گنوا دیا اگر یہی سب کرنا تھا تو علم کے حصول میں کیوں اتنا عرصہ گزارا اگر لکڑیاں ہی چیرنا تھیں، کپڑے دھونا تھے تو تحصیل علم کی کیا ضرورت تھی۔

ایک دن نورالحق حسب معمول جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر انہیں باندھ رہے تھے کہ بڑا بھائی جو شاہی دربار سے وابستہ تھا وہاں سے گزرا گھوڑے پر سوار بھائی نے جو یوں چھوٹے بھائی کو محنت و

مشقت کرتے دیکھا تو دل بھر آیا افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولا نور الحق .... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''

اعظم خان کو دیکھ کر نور الحق نے سلام کیا اور بولے ''بھائی ..... خانقاہ کے لئے لکڑیاں لے جا رہا ہوں۔''

اعظم خان تلخی سے بولا ''نور الحق.... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تعلیم انہی لکڑیوں کو چیرنے کے لئے حاصل کی تھی کیا تمہیں اپنی تعلیم کی اہمیت کا ذرا برابر احساس نہیں غیاث الدین شہزادہ جو تمہارا ہم جماعت رہ چکا ہے اکثر مجھ سے تمہارا ذکر کرتا رہتا ہے۔ وہ تمہیں کوئی منصب عطا کرنے کا خواہش مند ہے اور ایک تم ہو کہ اپنا سارا علم ان بیکار محنت ومشقت کے کاموں میں صرف کر رہے ہو۔

نور الحق بولے ''بھائی اعظم...... میں جانتا ہوں کہ میں شہزادے کی وساطت سے اعلیٰ عہدہ حاصل کرسکتا ہوں یا پھر آپ کی معرفت پر مقام حاصل کر لیتا ہوں لیکن مجھے اس کی خواہش ہی نہیں تو میں کیوں دل پر جبر کر کے وہ کام کروں جس میں دل راضی نہیں۔

نور الحق کی طرف غصے میں دیکھ کر اعظم خان بولا ''افسوس تم نے ہمیشہ وہی کیا جو دل نے چاہا کبھی کسی کی نصیحت پر کان نہ دھرا۔ اب اپنی تمام تر خوبیوں کو غارت کیے دے رہے ہو۔ عزت خاک میں ملائے الٹے سیدھے کام کر رہے ہو سمجھاتا ہوں تو کہتے ہو چند روزہ عزت کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں بہرحال تم جانو تمہاری باتیں سچی بات تو یہ ہے کہ تم اندھا دھند والد کے نقش قدم پر جس طرح چل رہے ہو اس سے تمہیں کچھ بھی نہ حاصل ہو پائے گا خدا تمہارے حال پر رحم فرمائے۔

شیخ نور الحق اپنے کام میں مشغول رہے۔ آٹھ سال تک لگاتار خانقاہ کی ضرورت کے مطابق جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر سر پر لاد کے لاتے رہے پھر والد کی طرف سے حکم ملا کہ علاقے کی عورتیں جہاں سے پانی گھڑوں میں بھر کر لاتی ہیں وہ جگہ مسلسل پانی گرنے سے کیچڑ میں لت پت ہو چکی ہے اور عورتیں اس سے پھسل کر گر چکی ہیں تو تم وہاں پہنچ کر ان کے گھڑے پانی سے بھر بھر کر اس کیچڑ زدہ علاقے سے خشک جگہ تک لا کے دیتے رہو فرمانبردار بیٹے نے بلا چوں وچرا کئے باپ کے حکم کی تعمیل میں تندہی سے اپنا کام سرانجام دینا شروع کر دیا۔ چار سال تک آپ عورتوں کے گھڑے پانی سے بھر بھر کر انہیں خشک جگہ تک لے جا کر دیتے رہے۔ لوگ آپ کو اس حالت میں دیکھتے تو ہنستے اور آپ کا مذاق اڑاتے لیکن آپ سب سے بے نیاز اپنے کام ہی میں مصروف رہے۔ ہر چیز سے لاتعلق باپ کے حکم کی تعمیل میں مگن۔

وقت گزرتا رہا علاء الدین نے آپ کو اپنی زندگی میں ہی اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ جب آپ کے والد کا انتقال ہوا آپ نے یہ جگہ سنبھال لی اور والد کی طرح اسلام کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔

یہ وہ دور تھا جب بنگال میں باطل قوتیں جڑ پکڑتی جا رہی تھیں مسلمان حکمران اپنی عاقبت نااندیشیوں اور آس پاس کے ہندو راجے مہاراجوں کی سازشوں سے کمزور ہوتے گئے۔ ہندو رعایا اور اہلکار اپنی مکار فطرت کے مطابق بظاہر تو وفاداری کا دم بھرتے تھے لیکن درپردہ اسلام اور اسلامی حکومت کے خلاف اپنے مذموم غلیظ ارادوں کی تکمیل کے لئے ہر ممکن سازش میں مصروف رہتے۔ آپ کو ان تمام حالات سے آگاہی تھی لیکن آپ نے اپنا فریضہ انہماک سے انجام دیئے رکھا۔ تبلیغ واشاعت کا کام آپ پورے جوش وخروش سے انجام دے رہے تھے اور آپ کے اردگرد ہندو اسلام

کے خاتمہ کے لئے دن رات جال بننے میں مصروف تھے۔

ہندو اپنے مہا گرو چانکیہ کی اس اپدیش کا بڑا خیال رکھتے کہ منہ پر رام رام کئے جاؤ اور جہاں موقع ملے گھاؤ لگانے سے باز نہ رہو۔ یہی عیاری و مکاری ہندو ازم کی بنیاد ہے چنانچہ ان دنوں گنیش نامی ایک ہندو اپنے گرو چانکیہ کے قول کے مطابق خود کو مسلمانوں کے لئے ان کا سب سے بڑا مترشو کرنے میں مشغول تھا۔ جبکہ وہ درپردہ اسلامی حکومت کے خاتمہ کیلئے زبردست کوششیں کررہا تھا۔ لہجے میں مٹھاس گھولے خوش اخلاقی کا مجسمہ گنیش اندر سے کتنا گھناؤنا اور کراہت زدہ و عیار تھا اس سے سادہ لوح مسلمان بے خبر تھے وہ اسے اپنا خیر خواہ اور ہمدرد سمجھتے۔ شاہی دربار میں گنیش نے رسائی پیدا کرلی تھی اور براہ راست بادشاہوں سے جو اب غیاث الدین بن چکا تھا اس کا تعلق تھا غیاث الدین کو بھی اس پر بڑا اعتماد تھا۔

اکثر مسلمان گنیش کی باطنی غلاظت سے آگاہ ہو چکے تھے۔ لیکن گنیش کے اثر و رسوخ کے سامنے ان کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے شیخ نور الحق کو گنیش کے کرتوتوں سے آگاہ کیا اور کہا ”بادشاہ آپ کا ہم جماعت رہ چکا ہے آپ اسے اس ہندو خطرہ سے آگاہ کریں تاکہ وہ بروقت اس کا سدباب کرکے محفوظ رہ سکے۔ ایسا نہ ہو کہ ہندو سانپ اسے ڈس کر چلتا بنے اور مسلمانان بنگال کسی مصیبت سے دوچار ہو جائیں آج کل ویسے بھی ہندوؤں کے تیور اور عزائم بھلے معلوم نہیں ہوتے کینہ پروری میں اپنی مثال آپ یہ قوم نجانے مسلمانوں کیخلاف کیا بغض دل میں رکھے بیٹھی ہے۔“

شیخ نور الحق نے مریدوں کی بات سنی آپ کو بھی کچھ کچھ حالات کی سنگینی کا احساس ہونے لگا تو آپ نے خود جانے کے بجائے دربار سے تعلق رکھنے والے شیخ معین الدین عباسی کے صاحبزادے شیخ بدر الاسلام کو بلایا جو اپنے عہد کے نامی گرامی عالم تھے اور بادشاہ ان سے مختلف فقہی امور میں مدد لیا کرتا تھا۔ اس ناطے بادشاہ سے آپ کا کسی حد تک گہرا تعلق تھا۔ شیخ عبدالاسلام کے خانقاہ پہنچنے پر آپ نے انہیں اپنے پاس بلایا اور پوچھنے لگے۔ یہ گنیش کیسا آدمی ہے؟ اس کے بارے میں ہمارے پاس مسلسل شک و شبہ کے اظہار والی خبریں پہنچ رہی ہیں لوگوں میں عام تاثر یہ ہے کہ گنیش اندر ہی اندر اسلامی سلطنت کے خاتمے کے لئے کوئی لائحہ عمل تیار کررہا ہے اور اس کا پہلا قدم اس سلسلے کی تکمیل کے لئے شاہی افراد کا اعتماد حاصل کرنا ہے تاکہ بعد میں انہیں اعتماد کی ہی سزا دے سکے۔

شیخ بدر الاسلام نے مسکرا کر جواب دیا ”حضرت جہاں تک گنیش کی ذات کا سوال ہے تو میں سمجھتا ہوں وہ اتنا خطرناک نہیں جتنا بیان کیا جاتا ہے ہر شخص جو شاہی دربار سے وابستہ ہو جائے اور عروج حاصل کرے اس کے بہت سے حاسد اور مخالفت کرنے والے جنم لے لیتے ہیں اور آپ کو بھی یقیناً گنیش کے کسی حاسد نے اس کیخلاف ورغلایا ہوگا۔

نور الحق بولے ”بدر الاسلام خدا کرے گنیش کے بارے میں جو کچھ ہم نے سنا ہو افواہ ہی ہو لیکن معاملہ اسلامی حکمران کی زندگی کا ہے جو یقیناً اتنی قیمتی ہے کہ اس کی جان سے ہزارہا مسلمانان بنگال کی جانوں کو تحفظ ملا ہوا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں احتیاط تو برتنا ہی ہوگی۔ دلوں کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے گنیش کے دل میں کیا ہے نہ آپ صحیح طور پر جان سکتے ہیں نہ میں اس لئے اس کی نگرانی اشد ضروری ہے لوگ یوں خوامخواہ کسی میں برائی کبھی نہیں نکالتے بات ہو تو پھیلتی ہے۔“

بدر الاسلام ادب سے بولے ”جیسے حضرت چاہیں میں آج ہی گنیش کی نگرانی شروع کرا دیتا ہوں

اور اس کے مشاغل کی تفصیلات معلوم کراؤں گا کہ آج کل وہ کرتا کیا پھر رہا ہے۔ اگر کوئی خرابی نظر آئی تو پھر اس کے سدباب کے لئے بادشاہ کو آگاہ کیا جائے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔" شیخ نور الحق سے ملاقات کے بعد بدرالاسلام نے گنیش کی چوری چھپے نگرانی شروع کرادی۔

گنیش جو عیاروں کا مہا عیار تھا بھانپ گیا کہ آج کل اس کے ساتھ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ چنانچہ جلد ہی اسے اپنی نگرانی کرائے جانے کا علم ہوگیا۔ وہ شیطان اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ایک مرتبہ کی نگرانی شک وشبہ دل میں پیدا کرنے اور پھر اسے مضبوط کرنے کا موجب بنے گی چنانچہ اس بات کو یہیں ختم کردیا جائے اور مسلمانوں کے دل میں جو بال برابر شک کا مادہ پیدا ہوا ہے وہ فوراً ختم کرنا ہی ضروری ہے۔

چنانچہ جلد ہی گنیش سرکاری عالم بدرالاسلام کی خدمت میں باادب ہوکر پہنچا اور درخواست کرنے لگا کہ میری دلی اچھا ہے کہ آپ جیسے مہان منش کے ساتھ کچھ لمحے گزارا کروں آپ مجھ پر مہربانی کرکے میرے لئے تھوڑا سے نکال کریں شیخ بدرالاسلام نے پوچھا گنیش تم ہندو ہو تمہارا مذہب میرے مذہب سے بالکل متصادم ہے میری زندگی اپنے مذہب کے اصولوں پر گزرتی ہے جب تمہیں میرے مذہب سے ہی لگاؤ نہیں پھر ان اصولوں کا مطالعہ کرکے کیا حاصل کروگے۔"

گنیش عیاری سے بظاہر عاجزی سے بولا "شریمان جی میں وہ شکتی چاہتا ہوں جو اسلام کے طفیل حاصل ہوتی ہے۔ میں بڑے عرصے سے اسلام کو پڑھتا آرہا ہوں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام مجھے اپنے مذہب سے کہیں زیادہ اچھا لگنے لگا ہے۔ اسلامی تعلیمات نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔ من کہتا ہے دنیا میں کوئی دھرم سچا ہے تو صرف اسلام ہے اب اگر آپ میری رہنمائی کریں تو میں اسلام سے مکمل آگہی حاصل کرکے اسے قبول کرلوں گا۔"

سادہ لوح عالم گنیش کی پرعیار گفتگو سمجھ ہی نہ سکا اور خوشی سے پھولے نہ سمایا کہ ایک اثرورسوخ رکھنے والا ہندو اپنے مذہب سے تائب ہوکر حلقہ اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ وہ اس سے بڑی نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ گنیش بھی میٹھی میٹھی باتیں کرکے آپ کا دل موہتا رہا چنانچہ اب بدرالاسلام نے گنیش کی نگرانی ترک کراکے اس کی تعلیم پر خصوصاً توجہ دینا شروع کردیا۔

ایک دن گنیش بدرالاسلام کی صحبت میں بیٹھا اسلام اور اسلامی تعلیمات پر مختلف سوالات کررہا تھا اور بدرالاسلام اس کی ہر ممکن تشفی کی خاطر آسان الفاظ میں اس کے سوالات کا جواب دے رہے تھے۔ سوال پوچھتے پوچھتے اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں بہت دنوں سے ایک سوال پوچھنے کی اچھا کررہا ہوں لیکن جب بھی آپ کے پاس آن بیٹھتا ہوں میرے ذہن سے وہ نکل جاتا ہے آج یاد آیا تو سوچا آپ سے دریافت کرلوں۔"

حضرت شیخ بدرالاسلام بولے "ضرور۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی الجھن ہو تو اسے سلجھانا میرا کام ہے۔ تم شوق سے پوچھ لیا کرو۔"

یہ سن کر گنیش نے مکارانہ انداز میں پوچھا۔ "شریمان اسلامی حکومت کس طرح کی ہوتی ہے۔" شیخ بدرالاسلام نے جواب دین اسلام میں حکمرانی کا اول تو کوئی تصور ہی نہیں اسلامی علاقے کا نگران بادشاہ یا سلطان نہیں کہلاتا بلکہ اسے مسلمانوں کا امیر کہا جاتا ہے جو ان کا خادم ہوتا ہے۔ شاہی محل نہیں ہوتا راعی اور رعایا میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ارکان اسلام پر عمل کروانے کے لئے اسلامی قوانین کا نفاذ کیا جاتا ہے۔

یہ سن کر گنیش بولا "اگر ایسی بات ہے تو پھر ہمارا

سلطان غیاث الدین کیوں اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتا۔"

بدرالاسلام نے جواب دیا "جہاں تک اس خطہ میں اسلام کے نفاذ کا سوال ہے تو اس کے نافذ نہ کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور مسلمان کی اقلیت۔ اقلیت کے قوانین اکثریت پر مسلط کرنا اسلام کے منافی ہے۔ اس کیلئے ہمیں پہلے یہاں اسلام کی تبلیغ کرنا پڑے گی۔ گنیش بولا۔ "شریمان آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں یہاں کا سلطان مسلمان ہے وہ زور بازو سے یہاں اسلام نافذ کرسکتا ہے۔

بدرالاسلام بولے ہرگز نہیں ہمارا اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اسلامی تعلیمات اور اسلام کا پیغام بزور شمشیر پھیلائیں۔ گنیش عیاری سے بولا "شریمان جی یہ میں آپ کو کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلامی حکمران قوت رکھتے ہوئے بھی اسلام کو عروج نہ دے سکے اگر آپ میری مدد کریں اور میں اسلام میں داخل ہوگیا تو پھر آپ دیکھیں گے کہ میں اسلام کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔"

شیخ نے دلچسپی سے گنیش کی باتیں سن کر اس پر اور زیادہ توجہ دینا شروع کردی ساتھ ہی وہ شیخ نور الحق کو بھی اس کے بارے میں بتاتے رہتے کہ آج کل گنیش کی سوچ بدل رہی ہے۔

اب گنیش نے چند دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ باقاعدہ شیخ بدرالاسلام کی صحبت میں رہنا شروع کردیا اور یوں غور سے وعظ سنتا گویا اس کے دل پر اثر کررہا ہے۔ ادھر جب بادشاہ نے بھی گنیش کو شیخ کی صحبت میں دیکھا تو اس پر اور زیادہ مہربان ہوگیا۔

اور پھر ایک دن سلطان غیاث الدین کے مرنے کی خبر نے ہر طرف تہلکہ مچا دیا۔ لوگ یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔ ایک بھلا چنگا شخص کیوں اور کس طرح اس دنیا سے کوچ کرسکتا ہے۔ شیخ بدرالاسلام نے خبر کی تصدیق کے لئے محل جانا ضروری خیال کیا۔ محل کے دروازے پر کھڑے دربانوں نے آپ کو دیکھ کر راستے میں روک لیا اور پوچھنے لگے شریمان جی کدھر کو منہ اٹھائے بلا روک ٹوک گھستے جارہے ہیں۔"

یہ سن کر شیخ جھنجلا گئے اور بولے "تمہیں شاید علم نہیں کہ میں جب چاہوں محل میں حاضری دے سکتا ہوں اور پھر تم کون ہو مجھے روکنے والے پرانے دربان کہاں گئے؟"

دونوں دربان یہ سن کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور بولے شریمان جی آپ بھی بہت بھولے ہیں تب میں اور اب میں بڑا فرق ہے۔ پہلے یہاں مسلم سلطان کا راج ہوتا تھا جس کے آپ سرکاری عالم تھے لیکن اب یہاں گنیش جی کا راج ہے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گنیش بھی شور کی آواز سن کر محل سے باہر آگیا اور آپ کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر بے رخی سے آپ کو محل میں لے گیا۔ محل کی فضا اب بالکل ہی تبدیل ہوچکی تھی اسے بدرالاسلام نے محسوس تو کیا لیکن گنیش سے کوئی سوال نہ کیا محل میں بیٹھتے ہی آپ نے گنیش سے دریافت کیا آخر سلطان کی موت کا کیا سبب ہے؟"

گنیش مکاری سے بولا "شریمان جی جیون موت تو بھگوان کے ہاتھ میں ہے پرنتو میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ میرے ساتھ بیٹھے دسترخوان پر بھوجن کررہے تھے کہ اچانک ہی چل بسے۔

شیخ بدرالاسلام نے گنیش کے لہجے پر غور کیا پھر کچھ توقف کے بعد بولے "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

گنیش نے جواب دیا "شریمان جی سلطان کے انتقال کے بعد اندیشہ لاحق ہوگیا تھا کہ کہیں سلطنت میں افراتفری نہ پھیل جائے چنانچہ اس حالت سے بچنے کی خاطر میں نے یہی مناسب سمجھا

کہ خود ہی عثمان حکومت سنبھال لوں۔"

شیخ بدرالاسلام نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "اور تمہارا وہ مسلمان ہونے کا ارادہ؟ اس کا کیا بنا؟" یہ سن کر گنیش کے حلق سے قہقہوں کا طوفان امڈ پڑا اور رعونت سے بولا "حضرت کیسی باتیں کر رہے ہیں' میں اور مسلمان ہو جاؤں ملیچھ ہو جاؤں بھلا ایسا سوچا کیونکر آپ نے؟"

یہ سن کر بدرالاسلام کو شیخ نورالحق کے خدشات یاد آنے لگے جو انہوں نے اس گنیش کے بارے میں کہے تھے۔ انہیں افسوس ہونے لگا کہ کاش وہ اس بدبخت ہندو کو پہلے سمجھ لیتے لیکن اب پچھتاوں کے سوا اور کیا رکھا تھا سو دکھ سے سر جھکائے باہر نکل آئے۔

شیخ نورالحق کو بھی جب ان باتوں کا علم ہوا تو انہوں نے سخت دکھ کا اظہار کیا۔

گنیش نے اب کھل کر سامنے آنا شروع کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے شیخ بدرالاسلام کو جنہیں وہ گرو کہا کرتا تھا ناکردہ گناہوں کے پاداش میں قید کر ڈالا اور پھر مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ مسلمانوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو مسمار کیا گیا غرض مکار ہندو نے اپنی باطنی خباثت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس نے اس بات کا برملا اظہار کرنا شروع کر دیا کہ میں بھگوان کی مرضی سے اپنی اس سرزمین ہند کو ناپاک اور ملیچھ مسلمانوں سے پاک کر کے ہی چھوڑوں گا۔

جب گنیش کا ظلم و ستم حد سے زیادہ بڑھ گیا تو نورالحق کو اس کے سدباب کے لئے جونپور کے مسلمان حکمران سلطان ابراہیم شرقی کا خیال آیا جو اس زمانے میں خاصا طاقتور اور رعب و دبدبے والا حکمران تھا آس پاس کی ریاستیں اس سے خوفزدہ تھیں۔ ایسے میں نورالحق نے سوچا طاقتور ہی طاقت کی زبان سمجھتا ہے اور ابراہیم شرقی اتنا طاقتور تو ہے ہی کہ گنیش اس کے ڈر سے اپنی غلیظ روش ترک کر دے۔ چنانچہ آپ نے فوراً اسے ایک خط لکھا جس میں کہا گیا۔

"سلطان ابراہیم خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ یہ بات میں تمہارے علم میں لا رہا ہوں کہ مسلمان بادشاہوں کا فرض ہوتا ہے کہ اگر کہیں اسلام کے نام لیواؤں پر کہیں ظلم ہو رہا ہو تو وہ اسے اپنی طاقت اور اثر و رسوخ سے بند کروائیں۔ یہاں کے راجہ گنیش نے جو آج سے پہلے محض ایک درباری تھا مکروفریب سے کام لے کر مسلمان بادشاہ کو زہر دے کر اسے ہلاک کر دیا ہے اور اب اسلام پسند قوتوں کے ساتھ ناروا سلوک کئے ہوئے ہے۔ ایسے میں یہ تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم مسلمانوں کو اس مکار شخص کے ظلم و ستم اور خوامخواہ کی اشتعال انگیزیوں سے نجات دلاؤ اور مجھے امید ہے کہ اس نیک کام میں خدا کی مدد تمہارے ساتھ شامل حال رہے گی۔

سلطان ابراہیم کو خط ملا تو اس نے درباریوں سے صلاح و مشورہ کیا اور سبھی نے اسے اس بات کے لئے آمادہ کیا کہ اگر وہ اسلام کی خاطر اس مہم میں حصہ لے اور وہاں کے علماء کو اس ناپاک کافر سے نجات دلائے تو یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

چنانچہ سلطان ابراہیم شرقی نے فوراً لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ اس کا لشکر سامان حرب سے لیس علاقے کا طاقتور ترین لشکر تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اس لشکر نے کوچ کیا سبھی نے اس شخص کے انجام پر افسوس کیا جس کی سرکوبی کیلئے یہ فوج جا رہی تھی۔

ادھر راجہ گنیش کو بھی اس امر کی اطلاع مل چکی تھی اسے اب صاف نظر آ رہا تھا کہ ظلم و جبر اور مکروفریب کا راج پاٹ جو وہ سنبھالے ہوئے ہے چند دنوں کا مہمان ہے۔ اس پریشانی کے عالم میں اس نے اپنے دربار کے امراء کو طلب کیا اور ان کے سامنے ابراہیم شرقی کے لشکر کا حوالہ دے کر کہا تباہی و بربادی ہما

مقدر بن چکی ہے جو لمحہ بہ لمحہ ہمارے نزدیک آتی جارہی ہے بچنے کی کوئی امید نہیں یہ سن کر سینا پتی بولا ''مہاراج اتنی مایوسی اچھی بات نہیں آخر ہمارے پاس بھی سینا ہے ہم کیوں چپ چاپ اس مسلمان راجہ کے آگے ہتھیار ڈال دیں یودھ کریں گے بھگوان نے چاہا تو جیت ہماری ہی ہوگی۔''

لیکن راجے نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا ''نہیں میں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا ابراہیم کی فوج سے مقابلہ کرنا گویا جان بوجھ کر خود کو آگ میں ڈالنا ہے یہ تو اک تباہی کہلائے گی جس کا میں خواہش مند نہیں کوئی ایسی تجویز بتاؤ کہ وہ مسلمان راجہ واپس چلا جائے اور ہمارا راج پاٹ اس کے ہاتھوں محفوظ رہے۔''

گنیش کی بیوی جو دیر سے سب باتیں خاموشی سے سن رہی تھی کہنے لگی ''مہاراج میرے ذہن میں ایک تجویز ہے جو اس بیرونی خطرے کو روکنے میں صد فی صد کامیاب ہوسکتی ہے۔'' گنیش نے حیرت سے بیوی کو دیکھا اور بے قراری سے بولا ''پھر جلدی سے بتاؤ چپ کیوں ہوگئی ہو میری حالت دیکھ ہی رہی ہو پل پل قیمتی ہے۔''

رانی نے پتی کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا ''مہاراج میرے ذہن میں ایک ایسی ہستی ہے جو اس خطرہ کو ٹال سکتی ہے اور وہ ہیں شیخ نور الحق جنہیں لوگ نور قطب عالم کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ راجہ جو کسی قابل قبول ترکیب کی امید رکھے بیٹھا تھا یہ سن کر اس کا چہرہ اتر گیا اور کہنے لگا بھولی عورت جس شخص نے اس خطرہ کو پیدا کیا ہے اسی سے جا کر کہیں کہ اسے مار دے۔ ابراہیم کو اس حملے کی دعوت دینے والے شیخ نور الحق ہی تھے۔ اب بھلا وہ کیسے مانیں گے کہ یہ خطرہ ٹل جائے۔ اس کی بیوی بولی مہاراج مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں مجھے بہرحال اتنا یقین ہے کہ اگر اس خطرہ کو روکا جاسکتا ہے تو سوائے نور الحق کے ذریعے ورنہ تباہی و بربادی جسے آپ نزدیک سے نزدیک تر ہوتا دیکھ رہے ہیں وہ واقعی آگے بڑھ کر ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

راجہ دیر تک رانی کی بات سنتا رہا پھر آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ اور دوسرے دن وہ شیخ نور الحق کی خدمت میں سر جھکائے جا حاضر ہوا اور آپ کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولا حضرت مجھے معاف کر دیں میں وہی کروں گا جو آپ چاہیں گے۔

شیخ نور الحق نے حیرت سے اسے دیکھا جو پاؤں پکڑے آپ کے آگے گڑگڑا رہا تھا۔ گنیش نے جب یہ دیکھا کہ آپ پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تو اس نے کہنا شروع کیا۔ حضرت ابراہیم کے اس حملے سے رعایا کا خون خرابہ ہوگا۔ تباہی و بربادی علاقے کا مقدر بن جائے گی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ جو کہیں گے میں اس ہی عمل کروں گا۔''

آپ نے طیش میں آ کر اس جھوٹے مکار اور سفاک راجہ کو دیکھا اور کہا ''بدبخت ہمیں تیری کسی بات کا یقین نہیں تو وہی انسان ہے نا جس نے دھوکے اور مکر فریب سے پہلے مسلمان راجہ کو قتل کیا اور پھر خود بادشاہ بن کر مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔

راجہ نے اپنا سر آپ کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا ''حضرت میں اپنے کیے پر نادم ہوں بس آپ مجھے معاف کر دیں میں اسلام قبول کر کے آپ کا یقین بڑھانا چاہتا ہوں۔'' شیخ نور الحق نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ آپ نے اس کی بات پر یقین نہ کیا۔ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندو جو مکر و فریب کے پتلے ہوتے ہیں ہر بار دغا دینے اور سانپ کی طرح ڈسنے والے بچھو خصلت قوم کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان پر اعتبار کرنا گویا خود کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ آپ نے اس

کی آزمائش کی خاطر کہ یہ کتنا اپنے قول میں سچا ہے اسے کہا ''نہیں ہم اب کی مرتبہ تمہیں بادشاہ بننے کا موقع نہیں دینا چاہتے ہاں اگر تم مسلمان ہونا چاہتے ہو تو بڑی خوشی سے ہو سکتے ہو۔ بادشاہت البتہ تمہیں نہیں ملے گی اگر تم چاہو تو تمہارا بیٹا جو بالغ ہے اسے اسلام کے حلقے میں لا کر بادشاہ بنایا جا سکتا ہے۔

راجہ جو کسی صورت بھی ابراہیم کے خوف سے نجات پانا چاہتا تھا جھٹ اس کے لئے تیار ہو گیا اور فوراً بیٹے کو لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا اور اسے مسلمان کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

آپ نے اس کے بیٹے کو قریب بلایا اور پوچھا ''بیٹا کیا نام ہے تمہارا؟''

''جدو'' گنیش کا بیٹا بولا جو تقریباً بیس سال کا نوجوان تھا۔

پھر آپ نے اس سے پوچھا ''کیوں بیٹا کیا تم مسلمان ہونا چاہتے ہو؟ اگر مسلمان ہونا چاہتے ہو تو کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم پر کسی نے دباؤ ڈالا ہو اور تم بغیر اپنی رضا و منشا کے مسلمان ہو رہے ہو۔''

جدو یہ سن کر بولا ''حضرت ایسی ہرگز کوئی بات نہیں میں اپنی خوشی سے مسلمان ہو رہا ہوں۔ مجھ پر کسی کا کوئی دباؤ نہیں یہ میرا ذاتی فیصلہ ہے۔ چنانچہ شیخ نور الحق نے مطمئن ہو کر اسے مسلمان کیا۔ کلمہ طیبہ پڑھانے کے بعد آپ نے ایک پان چبایا اور اس کا بقایا حصہ جدو کو کھلایا جو اس نے عقیدت سے منہ میں رکھا۔ پھر آپ نے اعلان کیا آج سے جدو جس کا اسلامی نام جلال الدین رکھا گیا ہے بنگال کے اس خطے کا نیا حکمران ہو گا اور یہاں شریعت محمدیہ کے نفاذ کا ذمہ دار آج سے یہاں اسلامی قوانین رائج ہوں گے۔

پھر آپ اپنے مریدوں کے ہمراہ جلال الدین کو لیکر محل کی طرف گئے اور اسے دربار میں لے جا کر تخت پر بٹھایا۔ راجہ گنیش نے بھی وہاں سب کے سامنے اپنے بیٹے کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔

ادھر ابراہیم شرقی بھی منزلیں طے کرتا بنگال کے نزدیک آن پہنچا اور شہر کے باہر خیمہ زن ہو کر بیٹھ گیا۔ شیخ نور الحق نے مریدوں سمیت لشکر میں جا کر ابراہیم سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ وہ کیا حالات تھے جن میں انہوں نے اسے خط لکھا تھا اور اب جبکہ راجہ تائب ہو چکا ہے بلکہ تخت سے ہی دستبردار ہو کر بیٹے کو مسلمان کرنے کے بعد اس کے حوالے کر چکا ہے لہٰذا اب جنگ کرنا واجب نہیں بھلا ایک مسلمان حکومت اور حکمران کیخلاف جنگ کب جہاد کہلا سکتی ہے۔

اگرچہ ابراہیم شرقی نے اس بات کا بہت برا منایا اور آپ پر واضح کیا کہ ہندو کبھی بھی قابل اعتبار قوم نہیں رہی۔ یہ وہ بچھو خصلت قوم ہے جس کی فطرت میں ڈنک مارنا لازماً شامل ہے وقتی طور پر تو بے شک راجہ گنیش نے حالات دیکھتے ہوئے آپ سے صلح کر لی ہے اور آپ کی شرائط مان لی ہیں لیکن اتنا میں آپ کو کہے دیتا ہوں کہ جیسے ہی اسے کسی کا ڈر نہ رہا وہ دوبارہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہو جائے گا۔ ابراہیم بہت دیر تک آپ کو اس بات پر آمادہ کرتا رہا کہ آپ اسے جنگ کرنے کی اجازت دیں کیونکہ گنیش بدعہد اور مسلم آزار راجہ ہے کسی بھی وقت وہ مکر سکتا ہے لیکن آپ نے واضح الفاظ میں اسے صاف کہہ دیا۔

''اب راجہ کی حکومت تو ہے نہیں جو ہم گنیش کیخلاف کارروائی کے لئے آپ سے مدد مانگیں ابراہیم شرقی۔ ... بے شک میرے رعب و دبدبے اور تیری سپاہ کا ہی خوف تھا میں نے اس بدعہد انسان کو سیدھا راستہ دکھایا لیکن اب یہاں کا راجہ ایک

مسلمان ہے مجھے تم ہی بتاؤ بھلا میں اب کیسے ایک مسلمان کو مسلمان کے ساتھ لڑنے کی اجازت دوں اور یہ لڑائی کیسے جہاد کہلا سکتی ہے۔ جہاد کافروں سے کیا جاتا ہے نہ کہ مسلمانوں سے۔''

سلطان ابراہیم شرقی آپ کے دلائل سے لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ مگر اس کے چہرے کے تاثرات صاف چغلی کھا رہے تھے کہ وہ آپ کے دلائل سے مطمئن نہیں چنانچہ وہ اٹھتے ہوئے بولا حضرت جیسے آپ کی مرضی میں چلا تو جاتا ہوں مگر اتنا بتانا ضرور چاہوں گا کہ آپ ایک مرتبہ جس سانپ سے خود کو ڈسوا چکے ہیں دوبارہ اسی کو دودھ پلا رہے ہیں اور یہ کوئی ہوشمندی کی علامت نہیں ہندو قوم مگر مچھ کی مکار فطرت کی حامل ہے اور اس کا اندازہ جلد ہی ہو جائیگا آپ کو۔''

چنانچہ سلطان نے واپسی کا اعلان کیا اور جلد ہی شہر کا محاصرہ اٹھا کر کوچ کر گیا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان اس دنیا سے ہی رخصت ہو گیا۔ ادھر گنیش کی طرف سے بھی امن تھا اس کا نومسلم بیٹا جلال الدین شیخ نور الحق کی ہدایات کے مطابق حکومت چلا رہا تھا۔ شیخ نور قطب عالم بھی اپنے کنبے میں شادمان تھے۔ آپ کو جب سلطان ابراہیم کی وفات کا علم ہوا تو آپ کو اس کا سخت رنج ہوا۔

شیخ نور الحق ہر روز نومسلم راجہ کے پاس جایا کرتے تھے تاکہ اسے آہستہ آہستہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں آگاہ کرتے رہیں اور اسلامی طریقے سے اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا رہے۔

چنانچہ ایک دن جب آپ دربار گئے تو وہاں خلاف معمول گنیش آپ کا انتظار کر رہا تھا آپ نے اس سے جلال الدین کے بارے میں پوچھا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گیا کہ میرا بیٹا بیمار ہے اور طبیب نے اسے آرام کرنے کے لئے کہا ہے۔ آپ اگر اس سے ضروری ملنا ہے تو ہفتہ کے بعد آ کر مل لیجئے گا۔

گنیش کی یہ بات سن کر آپ کا ماتھا ٹھنکا اور آپ نے ذرا سختی سے کہا ''گنیش میں جلال الدین کا استاد ہوں بیمار ہے تو مزاج پرسی کے لئے بھی جا سکتا ہوں تم کیوں مجھے روکنا چاہتے ہو اور یہ معاملہ کیا ہے؟''

گنیش نے جو آپ کا سخت لہجہ سنا تو وہ بھی درشتی میں بولا ''حضرت جلال الدین کا خیال آپ دل سے نکال ہی دیں تو بہتر ہے رہا مزاج پرسی کا بہانہ تو شریمان جی وہ میری اولاد ہے جسے چاہوں اس سے ملنے دوں جسے چاہوں روک دوں۔''

اب تو شیخ نور الحق کو یقین ہونے لگا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس مرتبہ ذرا نرمی سے کہا ''گنیش.... جلال الدین بے شک تمہارا بیٹا ہے مگر راجہ بھی ہے اور میرا اس وقت اس سے ملنا ضروری ہے کیونکہ آج اس کے پاس ایک مقدمہ فیصلے کے لئے آیا ہوا ہے اور میں چاہتا ہوں چونکہ ملزمان کا تعلق اسلام سے ہے لہٰذا انہیں جلال الدین اسلام کی مقرر کی ہوئی سزا ہی دے۔'' یہ سن کر گویا گنیش بھڑک اٹھا اور غصے میں کہنے لگا ''شریمان جی یہ کیا اسلام اسلام لگا رکھی ہے میرے جدو کو اسلام سے کیا تعلق وہ ہندو راجہ ہے جو مناسب سمجھے گا سزا دے دے گا۔''

''ہندو راجہ؟'' شیخ نور الحق نے حیرانگی سے کہا اور سوالیہ انداز میں گنیش کو دیکھنے لگا۔

گنیش اپنے مکروہ چہرے پر مکاری کا نقاب چڑھاتے ہوئے بولا ''ہاں شریمان جی وہ میری مجبوری تھی جو میں نے اپنے جدو کو جلال الدین بننے دیا لیکن اب میرے لئے کوئی مجبوری نہیں۔ اور آپ بھی یہ سن لیں کہ جتنا جلد ہو سکے یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ باقی مسلمان علماء تو خیر میں نپٹ لوں گا لیکن آپ کو اس لئے چھوڑ رہا ہوں کیونکہ آپ نے بھی ابراہیم

رتی سے میری جان بچائی تھی۔ اب میں اتنا احسان
راموش نہیں ہوں کہ محسن کی قدر نہ کروں۔ آپ
ی میرے اس رویے کی قدر کریں۔ اور جتنا جلد
وسکتا ہے یہ علاقہ چھوڑ دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں
نے ارادے سے بھٹک جاؤں اور آپ کی شان
ں کوئی گستاخی کر بیٹھوں۔

شیخ نور الحق نے حیرت سے اس دشمن عہد و
یان کو دیکھا۔ انہیں رہ رہ کر سلطان ابراہیم کا کہا یاد
رہا تھا کہ حضرت یہ ہندو انتہائی مکار فریب کی
طرت رکھنے والی قوم ہے اور اس کا اندازہ جلد ہی
پ کو ہوجائے گا۔ چنانچہ آپ مایوس شکستہ دل ہوکر
پس پلٹ آئے۔

ادھر گنیش کے بیٹے جلال الدین نے جدو بنے
سے انکار کردیا گنیش نے ہر طریقے سے اس پر دباؤ
ال کے دیکھا مگر وہ رام راج کے بجائے شریعت
دیہ کے نفاذ کا اٹل ارادہ کیے بیٹھا تھا۔ گنیش نے
ب دیکھا کہ بیٹا کسی صورت بھی رام نہیں ہو رہا اور
ب کیے کرائے پر پانی پھیرنا چاہتا ہے تو اس نے
بار میں اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر اسے
رفتار کرالیا اور قید خانے میں بند کروانے کے بعد
ود راجہ بن بیٹھا۔

گنیش کے اس اعلان نے تمام مسلمانوں میں
ل مچا دی سب اکٹھے ہوکر شیخ نور الحق کے پاس
نچے اور کہنے لگے حضرت یہ کیا ہوگیا۔ گنیش نے تو
پ کو پوری طرح یقین دہانی کرائی تھی کیا آپ بھی
س ہندو بچے سے دھوکہ کھا گئے۔ جب آپ جیسے
احب کامل بزرگ بھی دھوکہ کھانے لگیں تو پھر اب
را کیا بنے گا۔"

شیخ نور الحق انہیں کیا جواب دیتے دکھ و غم سے
ن کی باتیں سنتے سوالوں پر خاموشی سادھ لیتے۔

شیخ نور الحق کا ایک بیٹا بھی تھا انور جو بہت نرم
اور رحم دل انسان تھا اس نے جب یہ عالم دیکھا تو

باپ کے پیچھے پڑ گیا اور کہنے لگا "بابا۔ آپ کو کچھ نہ
کچھ مسلمانوں کے لیے کرنا ہی پڑے گا۔"

شیخ نور الحق پہلے ہی سے برہم تھے۔ اوپر سے
جب بیٹے نے بھی سفارش کی تو جھنجلا کر بولے میں
کیا کرسکتا ہوں۔"

انور نے دھیمے پر درد لہجے میں کہا۔ "بابا آپ کو
اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اگر مسلمانوں کے
ساتھ کوئی ظلم وستم ہوا تو اس کے ذمہ دار آپ ہی
ہوں گے۔ آپ کو بہت عرصہ قبل ہی سلطان ابراہیم
نے اس بات سے آگاہ کردیا تھا لیکن اس وقت
آپ نے گنیش جیسے سانپ پر اندھا دھند اعتماد کرکے
بڑی فاش غلطی کی جس کی سزا آج نہتے مسلمان بھگت
رہے ہیں۔"

بیٹے کی یہ صاف صاف کھری باتیں سن کر شیخ
نور الحق جو پہلے ہی پریشان تھے ایک دم غصے میں
آگئے اور بولے۔

"گنیش کا ظلم وستم مسلمانوں پر اس وقت تک
بند نہیں ہوسکتا جب تک مظلوم مسلمانوں میں تمہارا
خون بھی شامل نہ ہوجائے۔"

انور کو اب اپنی موت کا یقین ہوگیا۔ ادھر شیخ نور
الحق بھی بات منہ سے نکال کر سخت پریشان تھے اور
کچھ کہہ بیٹھے تھے اس کا سخت احساس پشیمانی تھا مگر
بات منہ سے نکلنا تھی نکل گئی۔

اس واقعہ کے چند دن بعد گنیش کے ہندو اہلکار
دندناتے ہوئے خانقاہ میں آ گھسے اور آپ کے بیٹوں
کو گرفتار کرکے بادشاہ کے پاس لے گئے گنیش نے
نور الحق کے صاحبزادوں کو دیکھ کر کہا "دیکھو لڑکو جو
کچھ ہم تم سے پوچھیں صاف صاف جواب دینا۔
ہماری اطلاع کے مطابق تمہارے والد کے پاس
منوں کے حساب سے سونا جمع ہے۔ اب تم ہمیں اس
جگہ سے آگاہ کرو جہاں یہ مال تمہارے باپ نے دبا
رکھا ہے۔ دونوں لڑکوں نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

جب گنیش کسی صورت میں بھی آپ کے دونوں
بیٹوں سے یہ بات نہ اگلوا سکا جو حقیقت بھی نہ تھی
چنانچہ طیش کے عالم میں اس نے اپنے اہلکاروں سے
کہا کہ انہیں قید خانے میں لے جا کر تشدد کے
ذریعے پوچھو تبھی یہ لوگ سیدھی بات اُگلیں گے۔
جب گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکالا جا سکے تو پھر
انگلیوں کو ٹیڑھا کرنا ہی پڑتا ہے۔

اور پھر کل کے قید خانے میں شیخ نور الحق کے
دونوں صاحبزادوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ سخت
اذیتیں دینے کے باوجود قید خانے کے ملازم دونوں
سے بالکل ہی وہ بات نہ اگلوا سکے جس کا گنیش خواہش
مند تھا۔ بالآخر سپاہیوں نے دونوں سے راز اگلوانے
کا ایک اور طریقہ سوچا۔ انہوں نے آپ کے بڑے
صاحبزادے انور کو کوٹھڑی سے باہر نکال کر زمین پر لٹا
دیا اور اس کی گردن پر تلوار کی نوک چبھوتے ہوئے
بولے "لڑکے جوں جوں تم خزانے سے لاعلمی کا
اظہار کرتے جاؤ گے یہ تلوار کی نوک تمہاری گردن میں
پیوست ہوتی جائے گی۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ آیا تم
خزانہ محفوظ رکھتے ہو یا پھر اپنی جان لیکن انور تو بھلا
خزانے کی بابت کیا علم ہوسکتا تھا جس کا وجود ہی
سرے سے نہ تھا۔ چنانچہ وہ اذیت پسند ظالم سپاہی
تلوار کی نوک لمحہ بہ لمحہ گردن میں اتارتا چلا گیا لیکن
آپ کے صاحبزادے سے خزانے کے بارے میں
وہ معلومات حاصل نہ کرسکا۔ انجام کار آپ کے
بیٹے کی گردن سے خون کا فوارہ چھوٹا اور گردن ایک
طرف ڈھلک گئی ایک سپاہی نے ہنستے ہوئے ڈھلکی
گردن کو تلوار کے ایک وار سے تن سے جدا کر دیا۔
پھر انہوں نے سوچا ایک کو تو شہید کر چکے ہیں اب
گنیش مہاراج سے دریافت کرنے کے بعد ہی
دوسرے کے بارے میں قدم اٹھائیں گے۔

شیخ نور الحق خانقاہ میں بیٹھے بے حد ملول اور
کبیدہ خاطر تھے۔ مریدوں سے آپ کی حالت
دیکھی نہ جاتی تھی مگر وہ بیچارے بھی کیا کر سکتے تھے۔
بعض نے کہا "حضرت آپ راجہ کے دربار میں جا کر
اپنے صاحبزادوں کے بارے میں پوچھ گچھ تو حاصل
کریں کہ آخر ان کا بنا کیا؟"

لیکن آپ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں
اپنا مقدمہ احکم الحاکمین کی عدالت میں درج کرا چکا
ہوں اور اب حتمی فیصلہ کا امیدوار ہوں۔"

ادھر قید خانے میں شہزادہ جلال الدین جو اب
محض قیدی بن کے رہ چکا تھا سخت پریشانی کے عالم
میں پل پل کی خبریں پا رہا تھا۔ اس کے ہمدرد و نگرانی
پر متعین سپاہی اسے باہر کی ہر خبر لا کر دے رہے تھے۔
جلال الدین نے جب یہ سنا کہ شیخ نور الحق کے
صاحبزادوں کو گرفتار کر کے تشدد کے ذریعے ہلاک
کر دیا گیا ہے تو وہ بہت رنجیدہ ہوا۔ اب اس نے دل
میں ارادہ کر لیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اس ظلم
کے خلاف خود ہی کوئی قدم اٹھائے اور اپنے بدعہد
ظالم باپ کو اس کے کرتوتوں کا پھل اسے پہنچائے۔

چنانچہ اس نے نگرانی پر متعین اپنے ایک سپاہی کو
اعتماد میں لیا۔ جو جلال الدین سے بے پناہ محبت رکھتا
تھا۔ جلال الدین نے پورا منصوبہ اسے سمجھایا پھر کہا
کہ جلد از جلد اس کے باپ کے پاس جا کر یہ کہو کہ
جلال الدین اپنے سابقہ رویئے پر نادم ہے اور اس کا
کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے۔

گنیش کو جب بیٹے کے ذہنی انقلاب کی خبر
پہنچی تو خوشی کے مارے دوڑتا چلا آیا اور قید خانے
سے بیٹے کو نکال کر گلے لگایا اور بولا "بیٹے میں
جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن تجھے رام کا خیال
آئے گا اور تو اپنے میچھ تم سے نفرت کرنے لگے
گا بھگوان کا شکر ہے کہ اس نے جلد ہی تمہیں اتنی
بدھی دی کہ تم سوچ سکو کہ اسلام ہمارے ہندو ازم
کے لئے کس قدر خطرناک ہے۔"

اس کے بعد گنیش نے شاندار طریقے سے جلال

اللہ کے رسول دین کے پیغمبر جو حیات و کائنات کی بنیاد ہیں

سیارہ ڈائجسٹ

کا

عظیم الشان اور روح پرور

کا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے

اپنی سابقہ روایات کے شایانِ شان یہ نمبر پیغمبران خدا کی حیاتِ جاوداں اُن کے معجزات اور ایمان افروز واقعات پر مشتمل ایک متاع بے بہا اور جامع دستاویز ہوگا۔

الدین کو دربار میں جا کر بٹھایا جہاں پہلے ہی سونے سے بنی سات گائیں تیار کھڑی تھیں گنیش نے جلال الدین سے کہا ”بیٹا یہ اس نیچ کام کا کفارہ ہے جو میں نے تجھے مسلمان بنا کر کیا تھا اب تم ان کے اندر سے ہو کر باہر نکلو تا کہ ان کا سونا بھگوان کی راہ میں بانٹا جا سکے۔“

جلال الدین نے خاموشی سے وہ سب کیا جو اس کے والد نے کہا۔ جیسے ہی وہ آخری گائے سے باہر نکلا ”دربار نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ گنیش کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیٹے کو خوشی سے دبوچ لیا اور پھر اسے لے کر دستر خوان پر جا پہنچا۔ لیکن جلال الدین نے کھانے سے انکار کر دیا راجہ کو تنہا ہی کھانا کھانا پڑا۔ ذرا ہی دیر بعد محل سے چیخ و پکار کی آواز آنا شروع ہو گئی۔ ایک کہرام برپا ہو گیا۔ راجہ گنیش اپنے انجام کو پا چکا تھا۔ اس کے ناپاک وجود سے دنیا پاک ہو چکی تھی اور پھر فوراً ہی اس بد عہد راجہ کے مسلمان بیٹے جلال الدین نے حکومت سنبھال لی۔ جلال الدین نے فوراً اپنے باپ کے احکامات منسوخ کیے اور شیخ نور الحق کے مخدوم زادے کو رہا کروا کر عزت و احترام کے ساتھ شیخ نور الحق کی خانقاہ تک خود لے کر گیا اور آپ سے سخت افسوس اور دکھ کا اظہار کرتا رہا کہ انہیں ان مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

شیخ نور الحق نے اپنی پوری زندگی بنگال میں فروغ اسلام کے لئے وقف کر دی اور اس سلسلے میں ہر قسم کے دکھ و مصائب جھیلے لیکن ثابت قدم رہے۔ علاقے بھر میں آپ کے عقیدت مند آپ پر جان نچھاور کرتے تھے۔ آپ کا جدھر سے گزر ہوتا عقیدت مند احتراماً کھڑے ہو کر آپ کے دست مبارک کو بوسہ دینے کی سعادت حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کوششیں کرتے۔

زہد و تقویٰ نے آپ کو بہت زیادہ رقیق القلب بنا دیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ وہ حالات بھی لکھے جا سکتے ہیں جن سے آپ کو دوچار ہونا پڑا۔ ایک مرتبہ آپ بہت زیادہ غمزدہ اور ملول کیفیت میں بیٹھے آنسو بہا رہے تھے۔ مریدوں نے یہ دیکھا تو ان کا دل بھی بھر آیا۔ ایک مرید آپ کے پاس گیا اور پوچھنے لگا حضرت یہ آپ اس طرح کیوں رو رہے ہیں؟ کیا ہم سے کوئی خطا ہوئی ہے؟“

یہ سن کر آپ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”میں آخرت کا سوچ کر رو رہا ہوں دنیا میں اللہ نے تو میرے بہت سے انسانوں کو مطیع بنا رکھا ہے لیکن نہ جانے وہاں میرے عقیدت مند لوگ مجھے کس حال میں دیکھیں گے شاید مجھ جیسا گناہ گار بندہ اپنے انہی عقیدت مندوں کے آگے قیامت کے دن مجرم بنا کھڑا ہو۔ وہی لوگ میرا سر پامال کریں۔“

یہ سن کر مرید بولا ”حضرت آپ نے ایسا سوچا کیوں؟ آپ تو بارگاہ ایزدی میں مقبول ہیں پھر بھی آپ ایسا سوچ رہے ہیں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”رب کی باتیں کون جان سکا ہے، وہ بے نیاز ہے نہ جانے اس نے میرے کون سے اعمال پسند کیے ہوں اور کون سے ٹھکرا دیئے ہوں بس یہی سوچ کر میرے آنسو بھر آئے۔“

آپ فرمایا کرتے تھے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ یہاں قدم قدم پر دھوکا ملتا ہے ہم انسان یہاں درخت کی مانند ہیں ایک ایسے درخت کی مانند جس کی اوپری چھال اتار دی گئی ہو۔ خدا بہت غیور ہے گناہ گار بندوں کو معاف کرنے والا غفور الرحیم ہے تو صدیقین کے لئے بڑا غیرت مند۔ آپ اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے تھے خلق کے مظالم کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ضبط کا بندھن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا سورج کی مانند سخاوت کرنا، تحمل زمین سے سیکھو اور پانی کی طرح عاجزی اختیار کرنا۔

پنڈوہ میں جلال تبریزی کی آخری آرام گاہ کے ساتھ ہی آپ کی آخری آرام گاہ بنائی گئی۔

حمد باری تعالیٰ

سارے جہاں کا داتا کون و مکاں کا مالک
ہے اس کی ذات افضل دونوں جہاں کا مالک
دنیا کی ساری رونق محتاج ہے اس کی
جتنی بھی رونقیں ہیں روح رواں کا مالک
درد جنوں ہو کوئی یا درد آدمیت!!
سب کا ہے وہ درماں انس و جاں کا مالک
آدم کی کیا ہے مشکل وہ جانتا ازل سے
وہی نہاں کا مالک، وہی عیاں کا مالک
دلکش رسیلی جتنی آوازیں ہیں جہاں میں
بہتر سمجھتا ہے وہ سب کی زباں کا مالک
خوشیاں اچھالتا ہے موتی بھی غم کے دیتے ہیں
ہے وہ قریب سب کے کون و مکاں کا مالک
دنیا کی دولتیں ہوں یا دین کے خزانے
مانگو اس سے سب کچھ وہ ہے جہاں کا مالک
دیکھے ہیں جتنے موسم سب اس کی دسترس میں
سردی ہو یا ہو گرمی بہار و خزاں کا مالک
اندر ہے جو زمیں کے اوپر وہ جانتا ہے
وہی زمیں کا مالک وہ آسماں کا مالک
دنیا کے کام سارے کیسے چلیں کنول ہیں
وہی چلا رہا ہے جو ہے جہاں کا مالک

(یاسمین کنول۔پسرور)

نذرانہ عقیدت

میں مدینے گیا
کچھ عجب حال تھا
سر پہ گٹھڑی گناہوں کی تھامے ہوئے
پاؤں میں بیڑیاں
دنیاداری کی تھیں
کیا کروں گا یہاں
بس یہی سوچتا
ان کے روضے کی جالی کو تکنے لگا
لب سے اشک آنکھوں میں کیا آ گئے
کچھ عجب ماجراؤں پہ گزرا میرے
ان کی خدمت میں کیا عرض کرنا مجھے؟
کچھ بھی نہ تھا پتا
یوں میں روتا گیا
اور جیسے پھر دل کو چین آ گیا
میرے چاروں طرف
ان کی تھی روشنی
میں نہایا ہوا
نور میں تھا بسا
ان کی نظر کرم نے سمیٹا مجھے
میری خفت و شرمندگی مٹ گئی
دھڑکنیں رک گئیں
روح روشن ہوئی

اشک مانند سمندر بہے جا رہے
اس کے قابل نہ تھا
ارفع رتبہ ملا
ان کی نظر کرم کا تھا کل ماجرا
اب بھی حیران ہوں
کیسے میں اس گھر میں بھلا جا سکا
تھا کرم بس نبی کا میری ذات پر
ان پہ لاکھوں، کروڑوں درود سلام
ان کی عظمت کو رتبے کو لاکھوں سلام

(نوشابہ اختر)

وہ دھوپ سنہری روٹھ گئی

وہ دھوپ سنہری روٹھ گئی
جو صبحیں لے کر آتی تھی
روپہلی کرنوں سے سب کی
جھولی کو بھرتی جاتی تھی
شبنم کو موتی کرتی تھی
اور پھول کھلاتی رہتی تھی
خود ٹہنی ایک گلاب کی تھی
تتلی کو جھلاتی رہتی تھی
اس گھر کے اک اک کونے کو
خوشبو سے سجائے رکھتی تھی
ان کمروں میں سب آنکھوں میں
اک دیپ جلائے رکھتی تھی
اس گھر کا ابد سے حصہ تھی
اس گھر کا ابد سے حصہ ہے
یہ کون کہے وہ قصہ تھی
ہر بات اسی کا قصہ ہے
اس گھر کو رنگ و نور دیا
سوکھی شاخوں کو بور دیا
اس گھر کا وہ سرمایہ تھی
وہ ماں تھی، بہن تھی، سایہ تھی
اس گھر کا مان تران تھی وہ
اس گھر کی عزت شان تھی وہ
اس گھر کا حوالہ اس سے تھا
جتنا تھا اُجالا اس سے تھا
اب کس سے کہیں، کیوں روٹھ گئی
مضبوط تھے دھاگے رشتوں کے
تھی پختہ ڈوری سانسوں کی
بس اک جھٹکے میں ٹوٹ گئی
وہ دھوپ سنہری روٹھ گئی۔

(ارشد ملک)

غزل

یہ جہاں رنگ و نکہت یہ فضا یہ چاند تارے
یہ ہزار پردہ داری ترے حسن کے اشارے
یہ جھکی جھکی نگاہوں کے یہ معتبر اشارے
میری زندگی کے سامان، مری موت کے سہارے
یہ فریب لالہ و گل یہ طلسم ماہ و انجم
مری خوش نگاہوں کے ہیں لطیف استعارے
یہ نظر نظر پہ بندش، یہ قدم قدم پہ گردش
کوئی تا بہ کے خدایا یونہی بندگی گزارے
اسی اک امید پیہم پہ یہ سانس چل رہی ہے
کہ کبھی سرور شاید کوئی بڑھ کے خود پکارے

(سرور بارہ بنکوی)

غزل

قصہ بام و در کو بھول گئے
ایسی غفلت کہ گھر کو بھول گئے
زخم جب بھر گئے مسافت کے
ہم بھی رسم سفر کو بھول گئے
شاخ در شاخ گرد اُڑتی ہے

کچھ پرندے شجر کو بھول گئے
کچھ اسیرانِ شامِ تنہائی
چاند نکلا تو گھر کو بھول گئے
تھا سراپا ترا نظر میں یوں
رنگ شام و سحر کو بھول گئے
دل پہ وہ زخم کھائے ہم نے جمال
نیت چارہ گر کر بھول گئے
(سمیع جمال)

غزل

غم عاشقی سے کہہ دو رہ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت میرے نام تک نہ پہنچے
میں نظر سے پی رہا تھا کہ یہ دل نے بددعا دی
تیرا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے
نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے
یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک
مگر ایسی بے رُخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے
جو نقاب رُخ اٹھا دی تو یہ قید بھی لگا دی
اٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے
(شکیل بدایوانی)

غزل

جو گماں تھا وہ اب دکھائی دے
دل کی دھڑکن بھی کچھ سنائی دے
پہلے کب تھی نگاہ میں منزل
اب تو وہ دور سے دکھائی دے
اس قدر ہیں جراحتیں دل پر
دل کا ہر زخم اب دکھائی دے
اس زمانے سے بھر گیا ہے دل
قید ہستی سے اب رہائی دے
حسن خود سر نہ حد سے بڑھ جائے
اس قدر بھی نہ خود نمائی دے
تو جو چاہے تو بادشاہوں کے
ہاتھ میں کاسہ گدائی دے
کس نگر میں امتیاز ہم آ پہنچے
جس میں کچھ بھی نہیں دکھائی دے
(ایس۔امتیاز احمد)

ھلال عید کو دیکھ کر

آیا ہے چاند عید کا مژدہ لئے ہوئے
دنیا میں ایک عیش کی دنیا لئے ہوئے
ساقی پلا دے مجھ کو تو جامِ مئے نشاط
آیا ہوں میں یہ دل میں تقاضا لئے ہوئے
روشن چراغ کیوں نہ خوشی کے ہوں ہر طرف
آئیں گے وہ خوشی کی تجلی لئے ہوئے
دیکھا جو ان کو چاند وہیں ماند پڑ گیا!
آیا تھا کس غرور کا جذبہ لئے ہوئے
دنیا تو دیکھتی ہے ہر عید کو اے طاہر
بیٹھا ہوں ابروؤں کا میں نقشہ لئے ہوئے
(طاہر ابدال طاہر)

غزل

مر کے جینے والوں میں نام اپنا بھی آیا ہے
ٹھوکر سے گرنا' گر کر اٹھنا بھی آیا ہے
جب سے چھوڑا ہے ساتھ گلستاں کا بہار نے
گلستاں کو اُجڑنا اور پھولوں کو بکھرنا بھی آیا ہے
تیری نظر میں جب سے گرا ہوں میں جاناں
مجھے جینا بھی آیا ہے' مرنا بھی آیا ہے' جینا بھی آیا ہے
شمع ذرا تو آنکھ کھول تو سہی' دیکھ تو سہی
رات بھی آئی ہے پروانہ بھی آیا ہے
رند تو روبرو حاضر ہے' ساقی کا انتظار ہے فقط

پیانے بھی ہیں، خود چل کر میخانہ بھی آیا ہے
میرا پیرہن مقدر ہی ہوگیا ہے جل کر راکھ
کسی سے کیا گلہ شکوہ جو مجھے پیش زمانہ بھی آیا ہے
جب سے دیکھا ہے عدیل نے تجھے یوسف دوراں جاناں
اپنی جاں پہ کھیلنا بھی آیا ہے، مچلنا بھی آیا ہے
(عدیل الرحمٰن عدیل)

غزل

یہ جیون خاک کر جائیں گے ہم بھی
تیرے بن یار مر جائیں گے ہم بھی
تلاش یار میں بے خوف ہوکر
سمندر میں اتر جائیں گے ہم بھی
ہمارے حوصلے زندہ ہیں دل میں
ہاں کانٹوں سے گزر جائیں گے ہم بھی
وہ پتے نیم کے ہوں گے میری جاں
نہ یہ سوچو بکھر جائیں گے ہم بھی
نہیں حالات رہتے ایک جیسے
کسی دن تو سنور جائیں گے ہم بھی
کسی کی یاد رانا ساتھ ہوگی
زہے قسمت جدھر جائیں گے ہم بھی
(قدیر رانا)

غزل

جب اہل بصیرت کو دکھائی نہیں دیتا
پھر کان پڑا لفظ سنائی نہیں دیتا
ہے عشق بھی بپھری ہوئی آتش کا دھواں سا
جب آنکھ میں پڑتا ہے دکھائی نہیں دیتا
اک حجرہ ہجراں میں مقید ہوں مسلسل
یہ عشق مگر مجھ کو رہائی نہیں دیتا
اے قاضی حاجات و مناجات کرم کر
کیوں یار تلک مجھ کو رسائی نہیں دیتا
اس دور کے ظالم سے تجھے لڑنا ہے نصرت
جس دور کا مظلوم دہائی نہیں دیتا
(نصرت عارفین)

غزل

یونہی اتفاق سے مل گیا نہ تو اجنبی نہ تو آشنا
کسی دل کی بھٹکی ہوئی دعا نہ تو اجنبی نہ تو آشنا
غم خودنمائی سے بھاگ کر کئی منزلوں کو تیاگ کر
میرے دست یاس میں آ گرا نہ تو اجنبی نہ تو آشنا
کہیں گم زمانوں کی داستاں کہیں حال فردا کا رازداں
کہیں رنگ حسن غزل میرا نہ تو اجنبی نہ تو آشنا
کوئی غم کی بات ہی بولتا کوئی دل کا راز ہی کھولتا
بنا کچھ کہے کہاں چل دیا نہ تو اجنبی نہ تو آشنا
غم زندگی کو بتا ملے میرے آستاں میں خدا ملے
میرے آستاں میں ہی لوٹ آ نہ تو اجنبی نہ تو آشنا
میرے ساتھ بھی دو قدم چلو ہو سکے تو ساتوں جنم چلو
میری چشم تر کی ہے التجا نہ تو اجنبی نہ تو آشنا
(دائم بٹ)

غزل

تمنا میرے دل کی بھی اگر منظور ہوجائے
تو غم میں دل میرا بھی بالیقیں مسرور ہوجائے
سجائی دے گی منزل بھی مجھے ظلمت کدے میں پھر
جو دل نظر کرم سے آپ کی معمور ہوجائے
میری سوچوں کی ویراں مانگ میں اے جان جاں اکثر
گماں تیرا دھنک رنگ میں سندور ہوجائے
نہ جانے دے سوئے تربت کوئی بھی اپنے پیاروں کو
مگر تقدیر کے ہاتھوں کوئی مجبور ہوجائے
جو دے نمناک پلکوں سے ہوا یاد صبا مجھ کو
تو خوشبو بھی گل تازہ کی یوں مشہور ہوجائے
سکوں دل کو میسر اب کہاں عصمت جہاں میں ہے
کبھی بھولے سے مل جائے تو وہ کافور ہوجائے
(عصمت اقبال عصمت)

سیارہ ڈائجسٹ
کی حسب روایت ایک نئی اچھوتی اور یادگار
پیشکش
شائع ہو گیا ہے
توبہ
قیمت: 160 روپے
توبہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے دروازے کھولتی ہے
قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں توبہ کی برکات' آداب اور فضائل پر کیا کچھ کہا گیا ہے؟
انبیائے کرامؑ، صحابہ کرامؓ، اولیائے کرامؒ اور صالحین کی توبہ نے قدرتِ خداوندی کے کیسے کیسے مظاہر دکھائے۔
ایمان افروز اور نورِ ایمان کے حیرت انگیز واقعات سے بھرپور یہ دستاویز آپ کے ذاتی ذخیرہ کتب میں ایک انمول اضافہ ہوگا اور آپ کے دوستوں کیلئے شاندار اور یادگار تحفہ بھی
240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 7245412
Scanned By Amir

غزل

میرے زخموں پر مرہم رکھتا نہیں کوئی
ساتھ میرے دو قدم چلتا نہیں کوئی
دے کے دُکھ عمر بھر کا جدا ہوگئے لوگ
یہ دل پھر کسی کی یاد میں دھڑکتا نہیں کوئی
غم دنیا بھی بہت خوب ہے میرے دوست
بجھ کے چراغ پھر سے جلتا نہیں کوئی
سحر ہوئی تو سبھی خواب بکھر گئے میرے
فریاد میرے دل کی پھر سنتا نہیں کوئی
انجانی راہوں پہ چلتے چلتے زندگی گزری
بچھڑیں جو ایک بار پھر ملتا نہیں کوئی
کسی کے پیار میں آخر ملی ہے رسوائی جاوید
اپنے آنگن میں پھر خوشیوں کا پھول مہکتا نہیں کوئی

(محمد اسلم جاوید)

غزل

پھر بہار آئے گی رُخ اپنا ہوا بدلے گی
میرے حالات بزرگوں کی دعا بدلے گی
قبر کی سختیاں مانا کہ ہیں دشوار بہت
میری تقدیر مگر خاک شفا بدلے گی
چاند کو دیکھ کے آتا ہے یہی مجھ کو خیال
کیا کبھی جان تمنا بھی ادا بدلے گی
روز اول سے وہی خواب ہے آنکھوں میں میری
خواب بدلیں گے نہ وہ اپنی جفا بدلے گی
عمر تو ہوگئی اک راہ کو تکتے تکتے!!!
جانے کس عمر میں اب جا کے سزا بدلے گی
اب نہ اترے کبھی شاید میرا بوسیدہ لباس
اب تو میری پوشاک قضا بدلے گی
زندگی آگئی طوفانوں کی زد پہ نیئر
کب روش اپنی مگر خلق خدا بدلے گی

(نیئر رضاوی)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شعری غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کرکے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی تصویر منسلک کریں

نام:............ تعلیمی قابلیت:............
عمر:............ پسندیدہ شاعر:............
پسندیدہ غزل/نظم:............
مشاغل:............ تاریخ پیدائش/برج:............
شادی شدہ/غیر شادی شدہ:............ پتہ:............
ای میل:............

نوٹ: اپنی پسند ناپسند شاعری کی ابتدا، مزاج، اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کرکے بھیجئے۔

آج کی عورت......

محمد علیم نظامی

مرد کے شانہ بشانہ زندگی کی دوڑ میں شریک ہے!

آپ چاہے مکمل گھریلو خاتون ہوں یا کیریئر ویمن زندگی میں سے کچھ وقت اپنے لیے ضرور نکالیں یہ یاد رکھئے کہ آپ کو اپنا خیال خود رکھنا ہے!

اگر وہ کسی کے ساتھ ناانصافی کرتی ہے تو وہ ہے اس کی اپنی ذات۔ اگر اس کے پاس وقت نہیں ہے تو صرف اپنے لئے نہیں ہے اور اگر اس نے اپنے لئے وقت نکالا اور خود پر توجہ دی تو اتنی دی کہ مہینے میں ایک بار بیوٹی پارلر چلی گئی۔ صرف پارلر جانا ہی عورت کی صحت و خوب صورتی کے لئے کافی نہیں ہے۔ ایک بات جو پہلے بھی ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ کسی بھی قسم کی صحت و بیماری کی کیفیت میں ذہنی صورت حال نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب تک آپ ذہنی طور پر پرسکون یا کسی حد تک مطمئن نہیں ہوں گی اچھی صحت حاصل کر ہی نہیں سکتیں۔

آپ خود یہ غور کریں کہ کتنی ضرورت سے زیادہ اپنے اوپر بوجھ تو نہیں ڈال لیا۔ اپنی روزمرہ کی مصروفیات کا جائزہ لیں اگر آپ کیریئر وومین نہیں تو گھر اور بیرون خانہ ذمہ داریوں میں تمام تر توازن پیدا کر کے اپنی مشکل زندگی کو آسان بنانے کی کوشش کریں۔ وہ خواتین جو گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ بیرونی ذمہ داریوں کو بھی سنبھالتی ہیں اور مردوں کی طرح جنہیں مسابقت کا سامنا ہو ان کے خون میں عام عورتوں کی نسبت مردانہ ہارمون وجین کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ مسلسل مسابقت' بھاگ دوڑ' پیشہ وارانہ کاروباری سرگرمیاں اور اسٹریس کے نتیجہ میں ANDO GIN کا اخراج بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ کیریئر وومین کے جسم میں مردانہ ہارمون کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اس ہارمون کا تعلق جارحیت سے ہے اور کیریئر وومین کو عام عورت کے مقابلے میں زیادہ جارحیت درکار ہوتی ہے۔ اس سے خون پہنچانے والی چھوٹی چھوٹی رگوں میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور بالوں کو آکسیجن اور دیگر ضرورتوں کے لئے اجزاء نہیں پہنچ پاتے۔

اسٹریس یا ذہنی دباؤ کے نتیجہ میں پسینے کا اخراج زیادہ ہوتا ہے چنانچہ آلودگی کے ساتھ مل کر پسینہ بالوں کو اور زیادہ خراب کر دیتا ہے اور ناگوار بو آ سکتی ہے۔ اسٹریس سے کھوپڑی کے عضلات میں کھنچاؤ بھی پیدا ہوتا ہے جس میں ان میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ اسٹریس سے چکنائی پیدا کرنے والے گلینڈز کی کارکردگی نارمل سے زیادہ بڑھ جاتی ہے جس سے چکنائی کی غیر ضروری وافر مقدار نہ صرف سر کو بلکہ پورے جسم کو غیر صحت مند بنا دیتی ہے اور اس سے السر' سر درد' ایگ زیما' دل کے امراض اور اعصابی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسٹریس سب سے زیاہ خطرناک حالت ہے جو آج کی عورت کو نقصان پہنچاتی ہے چاہے وہ گھریلو عورت ہو یا گھر اور باہر دونوں ذمہ داریوں کو سنبھالنے والی یہ بات ہر ایک کو یاد رکھنی چاہئے کہ قدرتی طور پر بھی ایام کے دوران اس کو اسٹریس یا ٹینشن کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنی عام زندگی میں کوشش کی جائے کہ اسٹریس کا کم سے کم سامنا کرنا پڑے۔

الغرض یہ کہ آپ چاہے مکمل گھریلو خاتون ہوں یا کیریئر وومین زندگی میں سے کچھ وقت اپنے لئے ضرور نکالیں یہ یاد رکھئے کہ آپ کو اپنا خیال خود رکھنا ہے اور خواتین خود ایسا کر بھی سکتی ہیں...... کیسے یہ آخر میں ہم آپ کو بتاتے ہیں:

☆ نماز کی پابندی کریں۔

☆ کتنی بھی مصروفیت ہو اپنے من پسند مشاغل کے لئے وقت ضرور نکالیں۔

☆ اپنی خوراک کا خیال رکھیں۔

☆ وٹامنز ضرور لیں۔

☆ ورزش اسٹریس کم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

☆ یہ ضرور کریں کہ اگر آپ ورزش کے لئے وقت نہیں نکال سکتیں تو کم سے کم لمبی سانس کی مشقیں کریں یہ آپ کو بہترین ذہنی سکون فراہم کریں گی۔

ہر روز کم سے کم 7 گھنٹے کی نیند ضروری لیں۔

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کرکے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کرسکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کرسکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کرسکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنھیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email:sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

چکن قیمہ تکہ

ہلدی	1/4 چائے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
نمک	1 چائے کا چمچہ
کٹا ہرا دھنیا	2 کھانے کے چمچے
حسبِ ضرورت	

تک فرائی کرلیں۔ اب اسے چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

دہی پھلکی

اجزاء:

دہی	1/2 کلو
ماش دال آٹا	1/2 کپ
مونگ دال آٹا	1/2 کپ
پسی کالی مرچ	1/2 چائے کا چمچ

سوڈا	1/4 چائے کا چمچ
تیل	تلنے کے لئے
نمک	حسب ذائقہ

دہی کے لئے:

لہسن	4 جوے
کٹی لال مرچ	1 کھانے کا چمچ
پسی لال مرچ	1/2 چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ

بگھار کے لئے:

لہسن کے جوے	2 عدد
زیرہ	1 کھانے کا چمچ
تیل	3 کھانے کے چمچ

ترکیب: پہلے 1/2 کپ ماش دال آٹا اور 1/2 کپ مونگ دال آٹے کو پانی سے گھول کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اب اس میں حسب ذائقہ نمک 1/2 چائے کا چمچ پسی کالی مرچ اور 1/4 چائے کا چمچ سوڈا ڈال کر کچھ دیر کے لئے رکھ دیں۔ پھر چھوٹی چھوٹی پھلکیاں بنا کر فرائی کرلیں۔ اس کے بعد 1/2 کلو دہی کو پھینٹ کر اس میں لہسن کے 4 جوے 1 کھانے کا چمچ کٹی لال مرچ 1/2 چائے کا چمچ پسی لال مرچ اور حسب ذائقہ نمک کی چٹنی بنا کر بڑے شامل کردیں۔ آخر میں 2 عدد لہسن کے جوے 1 کھانے کا چمچ زیرہ اور 3 کھانے کے چمچ تیل کا بگھار بنا کر لگا دیں۔

بریڈ رولز

اجزاء:

چکن قیمہ	1 پاؤ
ڈبل روٹی	1 عدد
انڈے کی سفیدی	2 عدد
کچی ہری مرچ	2 عدد
ابلے آلو	1/2 کلو
باریک کٹا ہرا دھنیا	1 گٹھی
بریڈ کرمبز	1 پیکٹ
کوٹیج چیز	1 پیکٹ
کٹی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچ
کارن فلور	1 کھانے کا چمچ
سویا سوس	2 کھانے کے چمچ
تیل	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

☆ پہلے 1/2 کلو ابلے آلوؤں کو چھیل کر کانٹے کی مدد سے انہیں میش کرلیں۔ اب 1 پاؤ چکن کے قیمے میں نمک ملا کر پانی خشک کرلیں۔ پھر ڈبل روٹی کے سلائس کے کنارے کاٹ کر خشک کئے ہوئے قیمے میں مکس کرکے چورا کرلیں۔ اب اس میں 2 کھانے کے چمچ سویا سوس ابلے آلو 1 چائے کا چمچ کٹی کالی مرچ 6 عدد کچلی ہری مرچ 1 گٹھی باریک کٹا ہرا دھنیا اور 1 پیکٹ کوٹیج چیز اچھی طرح ملائیں۔ اس کے بعد رولز بنا کر 2 عدد انڈے کی سفیدی میں ڈپ کرکے 1 پیکٹ بریڈ کرمبز لگالیں۔ آخر میں کڑاہی میں تیل گرم کرکے تیار کئے ہوئے رولز کو ڈپ کرکے فرائی کرلیں اور گولڈن براؤن کرکے نکال لیں پھر اسے ٹوماٹو کیچ اپ کے ساتھ سرو کریں۔

ہے۔ کمرہ نمبر گیارہ' عظمت حسین۔ یہی ہے نا آپ کا نام؟"

"نام تو یہی ہے۔ کہیں میرے نام کا کوئی اور آدمی تو یہاں ٹھہرا ہوا نہیں ہے۔"

"مجھے کیا معلوم صاحب، منیجر نے آپ کو بلانے کو کہا ہے۔"

"اچھا چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں بیرے کے ساتھ چل پڑا۔

فون واقعی میرے ہی نام تھا۔

انٹرویو بورڈ کے ایک سینئر رکن مراد علی خان نے مجھے یاد کیا تھا۔ مراد علی خاں بہت وجیہہ اور متاثر کرنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ انٹرویو کے دوران وہ مجھے سر سے پاؤں تک بہت غور سے دیکھتے رہے۔ میں محسوس کرتا رہا کہ انہیں مجھ سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ کچھ سوالات انہوں نے مجھ سے ایسے بھی کیے جن کا انٹرویو سے کوئی خاص تعلق نہیں لگتا تھا۔ بلکہ ان باتوں سے میرے اقتصادی اور خاندانی پس منظر پر روشنی پڑتی تھی لیکن یہ سوالات انہوں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کیے تھے کہ بظاہر بے جوڑ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ انہی سوالات میں گنجائش پیدا کر کے انہوں نے اس ہوٹل کا نام بھی پوچھ لیا تھا۔

فون پر انہوں نے بہت مختصر گفتگو کی۔ صرف یہ بتایا کہ وہ مجھ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتے تھے اور اس کیلئے انہوں نے مجھے شام کی چائے اور رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ یہ غیر متوقع التفات مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہوئی۔ لیکن ذرا سی ہچکچاہٹ کے ساتھ میں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ کچھ یہ بات بھی ذہن کے کسی گوشے میں تھی کہ پبلک سروس کمیشن میں ان کی شخصیت خاص اہمیت رکھتی تھی۔ معلوم نہیں میری کون سی ادا انہیں پسند آ گئی تھی۔ ویسے میں اپنی ذہانت' صورت اور قد و قامت کے اعتبار سے اپنے اندر پہلی نظر والی اپیل رکھتا تھا۔ کالج سے لے کر یونیورسٹی تک میں نے کتنی ہی لڑکیوں کو متاثر کیا تھا۔ اپنی خداداد دل کشی کی وجہ سے دوستوں اور شناساؤں میں قابل رشک تھا۔ میرے ان اوصاف پر جس خوبی نے جلا کر رکھی تھی وہ میری پارسائی تھی اور میری پارسائی کا سب سے مشہور ثبوت یہ تھا کہ ایک غیر معمولی لڑکی نے مجھ سے مایوس ہو کر خودکشی کر لی تھی۔

لیکن مراد علی خاں صاحب کو میری ذاتی خوبیوں اور خرابیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ سارا دن اسی ادھیڑ بن میں شام کا انتظار کرتا رہا۔ رہ رہ کے گھڑی پر نظر جاتی تھی۔

شام ہوئی اور مراد علی خاں صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ خان صاحب کی رہائش میں کروفر تو بہت تھا لیکن ان کا بنگلہ اتنا پرسکون تھا کہ سونا سونا معلوم ہوتا تھا۔ دو تین شائستہ قسم کے نوکر تھے۔ ان کی ادھیڑ لیکن خوبصورت اور تندرست بیگم تھیں اور وہ خود تھے۔ معلوم ہوا کہ لاولد تھے۔ اس وقت میرے دل کے دور دراز گوشے میں ایک خیال ابھرا کہ کہیں وہ مجھے بیٹا نہ بنانا چاہتے ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک لڑکی کو انہوں نے متبنیٰ کیا بھی تو وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی گئی۔ ان کا ساتھ اسے راس نہیں آیا۔ اس بات پر میرا شک اور بھی بڑھ گیا۔

لیکن خاں صاحب یا ان کی بیگم نے اشارتاً بھی ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا بلکہ وہ میرے گھر' خاندان' مشاغل وغیرہ کے بارے میں بہت تفصیل سے باتیں کرتے رہے۔ میں نے بیچ بیچ میں کئی بار جاننا چاہا کہ وہ ضروری بات کیا تھی۔ جس کیلئے انہوں نے مجھے بلایا تھا لیکن وہ ہر بار ٹال گئے۔ رات کا کھانا دسترخوان پر آتے آتے ان میاں بیوی نے

جس وقت گھنے باغات کے درمیان سے حویلی کی جھلک نظر آئی تو ڈوبتے ہوئے آفتاب کا شعلہ بجھ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی اور لطیف خنکی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اور جب میں بلند و بالا اور پرشکوہ حویلی کے صدر دروازے پر پہنچا تو ہر طرف سناٹا تھا۔ ذرا دیر کو میں ٹھٹکا تو فصیل کے بیرونی نکڑ سے ایک خوبصورت لمبا تڑنگا جوان کاندھے سے رائفل لٹکائے میری طرف لپکا اور قریب آتے ہوئے بولا۔ "آپ کون ہیں؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دوں وہ خود ہی کہنے لگا۔ "آپ عظمت حسین معلوم ہوتے ہیں۔ خوش آمدید' خوش آمدید آپ کا تو یہاں کب سے انتظار ہو رہا تھا۔ لیکن میرے یار اچانک ہی ٹپک پڑے چلئے چلئے اندر تشریف لے چلئے۔"

اس طرح مست اور متوالے سرفراز نے میرا استقبال کیا۔ مراد علی خاں بھی بڑی گرم جوشی سے ملے۔ ان کی بیگم اور سرفراز کی والدہ فریدہ خانم نے تو جیسے میرے لئے آنکھیں بچھا دیں۔ جیسے میں ان سب کا قریبی عزیز تھا جو کسی دُور دراز مقام پر بھولے بھٹکے ان کے درمیان پہنچ گیا ہو۔ میں اپنی اجنبیت کے احساس کو زیادہ دیر تک باقی نہ رکھ سکا۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد جب نوکر نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی تو سرفراز خان نے اسے ڈانٹ دیا۔ "سرشام ہی کھا کے پڑ جائیں۔" پھر کمال بے تکلفی سے مجھ سے پوچھا۔ "شراب پیو گے؟"

پہلی ملاقات' سب کی موجودگی اور فریدہ کی تسبیح ملی والی بات کا خیال مجھے سرفراز خاں کی یہ بے تکی کچھ بھائی نہیں۔ البتہ یہ اندازہ ہو گیا کہ اس لئے چائے اور شراب ایک جیسی چیزیں تھیں مجھے نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔

"ابھی تو اللہ نے بچائے رکھا ہے" میں نے عذر کیا۔ میری اس بات پر وہ ذرا تیکھا ہو کر کہنے لگا۔ "پھر پیو گے بڑھاپے میں؟ اور یہ اللہ میاں کو بیچ میں کیوں لے آئے۔ یہ شراب کا ذکر تھا نماز کا نہیں۔" پھر ذرا رُک کر بولا۔ "سمجھ گیا تم صرف امی جان سے ملنے آئے ہو مجھ سے نہیں۔"

مراد علی خان صاحب کو بولنا پڑا۔ "تم اما ننے کی بات نہیں بیٹا! یہ اپنا خیال اور اپنی اپنی طبیعت ہے چلو میں تمہارے ساتھ پیتا ہوں۔"

"ہاں چلئے۔" کہہ کر سرفراز اٹھ کھڑا ہوا۔

واقعی بڑا بھولا اور بگڑے دل کا آدمی تھا۔ فریدہ خانم نے صفائی اور سفارش کے طور پر کہا۔ "برا نہ ماننا بیٹا! ذرا باؤلا ہے اور جب سے ایک واقعہ اس کے ساتھ پیش آیا ہے تب سے کچھ چڑچڑا بھی ہو گیا ہے ورنہ بڑا دلیر اور جی دار ہے۔"

میرے ہونٹوں پر صلح صفائی والی مسکراہٹ آتے ہی مطلع صاف ہو گیا۔ پھر اِدھر اُدھر کی گپ شپ چل پڑی۔ حویلی کے کسی الگ تھلگ گوشے میں سرفراز خان اور مراد خاں اپنا شغل کرنے چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ مراد خان کو شراب کا شوق نہیں تھا بس کبھی اندھیرے اُجالے کا موقع پا کر چکھ لیا کرتے تھے اور سرفراز خاں کے ساتھ تو آج پہلی بار محض اس کا دل رکھنے کے لئے بیٹھ گئے تھے۔

سفر کی تھکان کی وجہ سے مجھے فوراً نیند آ جانی چاہئے تھی لیکن میں آدھی رات تک کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک سوال تو انٹرویو والی رات سے میرے ذہن کو پریشان کر رہا تھا لیکن آج دو سوال اور بھی ذہن میں کلبلانے لگے۔ سرفراز خاں کے ساتھ کون سا واقعہ پیش آیا تھا؟ اور وہ ماہ پیکر کہاں تھی؟ اس کی جھلک تو الگ رہی اس کا ذکر تک نہیں آیا۔

صبح کو کافی دیر سے میری آنکھ کھلی۔ مجھے جو کمرہ دیا گیا تھا اس میں آسائش و آرائش کا ہر سامان موجود تھا۔ کچھ آثار ایسے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا

عاشقانِ رسولؐ کی خدمت میں

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور ایمان افروز، دلکشا اور روح پرور پیش کش

فرمانِ رسولؐ
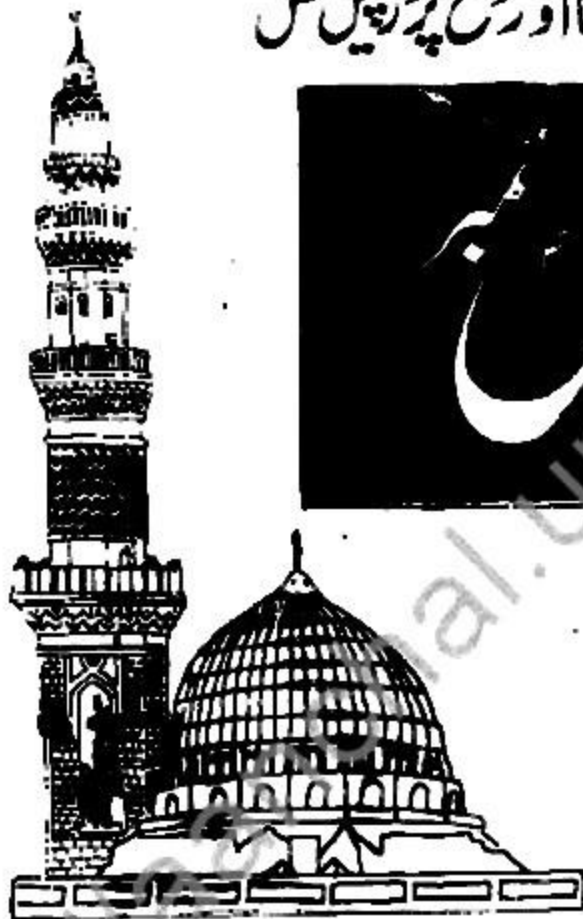
شائع ہو گیا ہے

❋

اللہ کے آخری پیغمبرؐ کے ارشاداتِ گرامی کا ایک ایک زریں، نور افشاں اور مقدس لفظ جو عالمِ انسانیت کی ظاہری اور باطنی زندگیوں کی مکمل فلاح کا باعث ہے

کہ مجھ سے پہلے یہ کمرہ...... معاً مجھے ماہ پیکر کا خیال آیا' ہاں یقیناً وہی ...... میرا ذہن ابھی پوری بات سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ باہر چوکھٹ اور پردے کے درمیانی خلا سے دو پاؤں نظر آئے۔ سنہرے کام اور سیاہ مخمل کے سلیم شاہی جوتوں میں دو گورے گورے پاؤں اور گلابی چوڑی دار پاجامے میں کسی ہوئی گداز پنڈلیاں۔ میں نے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کی۔ یقیناً کوئی جوان عورت پردے کے پاس اندر کا رُخ کئے کھڑی تھی۔ ایک ہلکی سی کھانسی سے میں نے بیدار ہونے کا اظہار کیا......!

دوسرے ہی لمحے ہاتھوں میں چائے کی چھوٹی ٹرے سنبھالے سبز ریشمی گھیردار کُرتے پر پیازی دوپٹہ ڈالے ایک دہکتی ہوئی سرخ سرخ سی پٹھان لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی۔ بھیگے بھیگے کھلے ہوئے بال' شفاف کشادہ آنکھیں' صبح صبح کا نکھرا ہوا بے داغ حُسن' تازہ اور شاداب' خون چھلکاتے بند ہونٹوں میں بھنچی اور لہر کی مانند جھلملاتی کرتی مسکراہٹ' جیسے میرے سامنے عورت کے روپ میں ترشا ہوا ہیرا تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ واقعی خدا کتنا بڑا مصور اور کتنا بڑا تخلیق کار ہے۔

مُردے کو زندہ کرنے والے اس جادو کو دیکھ کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ انتقام! مراد خاں اور ان کی بیگم کا انتقام۔ خودکشی کرنے والی لڑکی کا بدلہ! پوری سازش میری سمجھ میں آ گئی۔ لیکن پہلی نظر کا وہ ایک ہی قاتل لمحہ فیصلہ کن تھا اور میری حالت اس بے بس مسافر جیسی تھی جس کے سامنے اچانک چنگھاڑتا ہوا سمندر آ گیا ہو اور واپسی کا راستہ بند ہو چکا ہو۔ اس مجسم قیامت نے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر ...دل لبھانے والے لہجے میں کہا۔ "میرا نام ماہ پیکر ہے۔ آپ نے سنا ہوگا۔ کیا فضول سا نام ہے گو میں اس سے بھی زیادہ فضول ہوں۔" اور ایک نظر مجھ پر ڈال کر بولی۔ "آداب بجا لاتی ہوں۔" اور پھر چائے انڈیلتے ہوئے اپنے آپ کہتی رہی۔ "کل میں بیمار تھی کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ آج اس کی تلافی کرنے آئی ہوں۔ کب سے آپ کے آنے کا سن رہی تھی۔ پھوپھی جان اور پھوپھا جان نے تو تعریفوں کے پل باندھ رکھے تھے۔" چائے میں چمچہ چلاتے ہوئے اس کا ہاتھ رُکا اور بہت معنی خیز لہجے میں بولی۔ "خدا جانے سچ کہ غلط۔"

میں نے چائے کے لئے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "اگر آپ نے صحیح مانا تو یہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوگی۔"

اس نے مسکرا کر اپنی جھینپ کو چھپانے کی کوشش کی۔

میں چپ چاپ چائے پینے لگا۔ چائے کے فلیور اور ماہ پیکر کی ملی جلی بھینی بھینی خوشبو سے کمرہ مہک اٹھا تھا۔ پھر وہ کچھ کہے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں چائے پیتا رہا اور بیگم مراد خاں کے الفاظ میری یادداشت میں گونجتے رہے۔ "کبھی نہ کبھی وقت ضرور انتقام لے گا۔"

اس کے بعد بھی ماہ پیکر سے ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن تنہا نہیں سب کے سامنے اور اس کے بغیر مجھے اپنی زندگی کا تصور ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے مصور نے تصویر کا محض خاکہ کھینچ کر چھوڑ دیا ہو لیکن میں اپنے اندر اتنی اخلاقی جرأت نہیں پاتا تھا کہ مراد خاں اور ان کی بیگم کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کر سکوں۔ اعتراف کا فائدہ بھی کیا تھا وہ دونوں تو ماہ پیکر کے ذریعے شاید انتقام لینے کا پلان بنائے ہوئے تھے۔

دس بارہ دن ان لوگوں کی دلچسپ صحبت میں

یہاں تک بتا کر وہ کچھ دیر کے لئے چپ
۔ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا
ا۔ "شاید اب تمہاری سمجھ میں یہ بھی آ گیا ہوگا
یں پراسرار طور پر یہاں کیوں بلایا ہے؟"
یک پل میں سارے پردے اٹھ گئے اور
ہ ذہن میں شکوک کی جو دھندلاہٹ تھی وہ ختم
۔ میرے اندر ایک ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ میں
کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ میرے
کا انتظار کئے بغیر بولا۔ "ہم سب تمہیں پسند
لے ہیں۔ ماہ پیکر بھی۔"
میرے تو دل کے کنول کھل گئے اور آنکھوں
ہزاروں بہاریں ناچ اٹھیں۔ جی چاہا کہ سرفراز
چوم لوں۔ قسمت نے دنیا ہی میں مجھ پر
کا دروازہ کھول دیا تھا۔ سرفراز خاں نے پھر
رمند لہجے میں کہا۔ "مجھ ا

ہم سب دوڑ پڑے۔ بڑے صاحب اپنی رائفل کے ساتھ اس کے تعاقب میں نکل پڑے ہیں۔ سکندر نے باغ کے رکھوالے کو گولی مار دی ہے۔"

ہم نوکر کی بتائی ہوئی سمت میں دوڑ پڑے۔ تھوڑی ہی دور جانے پر پھر فائرنگ کی دو تین آوازیں آئیں اور ہم آواز کی نشاندہی کی سمت میں بھاگے۔ ہم اتنے قریب پہنچ گئے تھے کہ ایک بلند نسوانی چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ یقیناً ماہ پیکر کی تھی۔ اس چیخ کی طرف ہم بے تحاشا لپکے جھاڑیوں' چٹانوں اور نشیب و فراز کو خاطر میں لائے بغیر۔ اور ہم نے سکندر کو جا لیا۔ اڑھائی تین سو گز کے فاصلے پر پہاڑی کی اوٹ سے پانچ چھ مسلح آدمی ماہ پیکر کو باندھے ہوئے ہاتھوں سے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ ماہ پیکر کا پیراہن تار تار

گزر گئے۔ میں جیسے اس خاندان کا رکن بن گیا تھا۔ سرفراز خاں تو مجھ سے کھنچا کھنچا رہتا تھا۔ کیونکہ میں اس کا ہم ذوق نہیں تھا لیکن مراد خاں صاحب کے ساتھ دُور دُور تک سیر سپاٹے کو نکل جایا کرتا تھا۔ کبھی مچھلی کا شکار کرتے اور کبھی پرندوں کا۔ میں نے اپنی زندگی میں بندوق کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ مراد خاں ہی چھوٹے چھوٹے جانوروں پر ہاتھ صاف کیا کرتے۔

ایک دن میری طبیعت مراد خان سے بور ہوگئی میری اور ان کی عمر میں جو فرق تھا وہ رنگ لایا۔ طبیعت کچھ سرفراز کی طرف رجوع ہوئی۔ آخر وہ ماہ پیکر کا بھائی تھا اور میرا ہم عمر بھی۔ پڑھا لکھا تو مجھ سے بہت کم تھا لیکن اس کے اندر زندگی اور جوانی تھی۔ بس ایک عیب تھا کہ شراب بہت پیتا تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا کبھی کبھی دن کو بھی پی لیتا تھا۔

میرے دل میں سرفراز کو دوست بنانے کی خواہش پیدا ہوگئی اور ایک دن دوپہر کو جب وہ نشہ میں سرخ انگارا بنا ہاتھ میں رائفل لئے حویلی سے نکلا تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ جب اسے حویلی سے کچھ زیادہ دُور جانا ہوتا تو بھری ہوئی رائفل لے کر نکلا کرتا۔ کافی دُور تک میں اس کے پیچھے چلتا رہا وہ بے خبر تھا۔ آخر جب وہ ایک ٹیلے کے پاس رُکا تو مجھے دیکھ کر حیرت سے چونک پڑا۔

”تم میرے پیچھے پیچھے کیسے آگئے۔؟“

”بس یوں ہی۔ تمہاری کشش کھینچ لائی۔ تم تو پہلی ہی ملاقات سے کچھ ناراض سے نظر آتے ہو حالانکہ میں اتنا بُرا آدمی نہیں ہوں ایک شراب ہی تو نہیں پیتا ہوں بس یہی نا؟۔“

وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر میرا منہ دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔”کئی سال سے تنہا شراب پیتے پیتے تھک گیا ہوں تمہیں دیکھ کر سوچا کہ چلو چند دن کے لئے ایک ساتھی ملا لیکن تم تو صوفی نکلے۔“

میں نے اس کا دل رکھنے کیلئے کہا۔”اگر میرے شراب پینے میں تمہاری خوشی ہے تو میں پی لوں گا لیکن تم میرے دوست تو بن جاؤ۔“

”بن جاؤ کیا۔ میں تو تمہارا دوست ہوں ہی۔“

یہ کہہ کر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر دل کھول کر باتیں ہونے لگیں۔ تب اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ سنایا کہ کس طرح اس علاقے کا ڈاکو سکندر ایک غریب کسان لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا؟ اور کس طرح اس نے لڑکی کو بچایا پھر وہ لڑکی اس پر مرنے لگی اور وہ خود بھی اس کیچڑ میں کھلے ہوئے کنول میں دلچسپی محسوس کرنے لگا مگر ان دونوں کے درمیان بہت سی باتیں مانع تھیں۔ سکندر کی نظر بد سے بچانے کے لئے سرفراز نے اس لڑکی کی شادی ایک جگہ طے کر دی مگر ٹھیک شادی کی رات ...... جب وہ دلہن بن کر رخصت ہو رہی تھی سکندر نے اسے پھر اغوا کرنے کی کوشش کی جو ناکام بنا دی گئی۔ لیکن اس نے بھاگتے ہوئے اتفاقاً اس لڑکی کو گولی مار دی۔ سرفراز نے پہلی بار اس غم میں شراب پی تھی۔ تب سے چار سال گزر چکے تھے۔ لیکن سکندر اس وقت اس کا دشمن بنا پھرتا تھا ماہ پیکر اسلام آباد میں پڑھ رہی تھی تو طرح طرح کا وسوسہ سرفراز کے دل میں گھر کئے رہتا اور وہ تھوڑے دنوں بعد اسے دیکھنے جایا کرتا۔

اور ایک بار وہ بہن کو ساتھ ہی واپس لے آیا لیکن کچھ دنوں سے یہاں بھی ایک خطرے کی آہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لئے وہ ماہ پیکر کی شادی جلد از جلد کر دینے کیلئے پریشان تھا۔ جس کیلئے اس چھوٹے سے خاندان کو ایک شایان شان لڑکے کی فوری تلاش تھی۔ یہ کام سرفراز کے بس کا تو تھا نہیں اس لئے مراد علی خاں اور ان کی بیگم پر یہ ذمہ داری

شہ مات

ح ۔ اصغر

وہ جلد از جلد یہ شہر چھوڑ دینا چاہتا تھا اس کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی تھی وہ اپنے باپ کو دوسرے شہر کے ایک اچھے ہسپتال میں داخل کرآیا تھا اور اب سرعت سے یہاں سے نکلنے کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا کہ واپس جاتے ہوئے دو آدمیوں نے انتہائی ڈرامائی انداز میں اس کو اغوا کرلیا تھا۔

ایک قاتل ادا حسینہ کا فسانہ جسے اپنے حسن اور اداؤں پر بڑا مان تھا

''تمہارا کیا خیال ہے یہ چھوٹی موٹی چوریاں تمہیں تمہاری منزل کی جانب لے جائیں گی، مارتھر؟'' اس کے لہجے میں استہزائیہ پن نہیں تھا۔ تمسخر نہیں تھا لیکن اس کی سچائی اور حقیقت بیانی نے مارتھر کو دکھی کردیا تھا۔ مارتھر اور اس کے دوستوں نے پچھلی رات کو اے ٹی ایم سے رقم چرائی تھی لیکن بٹوارے کے بعد اس کے حصے میں محض اتنی رقم آئی تھی کہ وہ اپنے باپ کے علاج کی محض ایک ادنیٰ سی قسط ادا کر پایا تھا۔ ڈاکٹر ہرمن نے ناک منہ چڑا کر وہ قسط وصول کی تھی اور اگر مارتھر کے باپ کے ان پر احسانات نہ ہوتے تو شاید وہ یہ قسط اس کے منہ پر مارنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ان کی خاموشی نے جہاں اس کو تقویت دی تھی وہیں ان کے ناگوار انداز نے اس کو سوگوار کردیا تھا۔

گھڑی کا انوکھا سفر

انسانوں کی قدیم ایجادات میں سے ایک گھڑی بھی ہے۔ زمانہ قدیم میں لوگ چاند، سورج، ستاروں اور سیاروں کی مدد سے وقت کا صرف اندازہ لگایا کرتے تھے۔ اس کے بعد انسان وقت کو مزید مختصر اکائیوں میں جاننے کی کوششیں کرنے لگا تبھی "گھڑی" جیسی ایجاد کی ابتدا ہوئی۔ ابتدا میں "سن ڈائل" اور "واٹر کلاک" جیسی گھڑیاں ایک ساتھ منظر عام پر آئیں۔ اس کے بعد یورپ میں ایک بڑی جدت لائی گئی اور گھڑی میں پہلی بار مختلف پرزے استعمال کیے گئے، جیسے اسپرنگ، پہیے، پنڈولم وغیرہ۔ برقی گھڑی کی ایجاد 1840ء میں ہوئی، مگر برقی رو عام نہ ہونے کے باعث وہ چل نہ ہو سکی۔ بیسویں صدی میں جب برقی رو نے عروج پایا۔ نت نئی گھڑیاں بنانے کی اس دوڑ میں مسلم انجینئر اور سائنسدان الجزری نے بھی حصہ لیا۔ انھوں نے ایک انوکھی قسم کی گھڑی بنائی تھی۔ جب تک گھڑیاں عام نہیں ہوئیں، گھڑیوں کو ریلوے اسٹیشن، ہوٹلوں اور عمارتوں میں نصب کر دیا جاتا، جسے گھنٹہ گھر یا کلاک ٹاور کہتے ہیں۔ میکانکی گھڑیوں کی ایجاد کے ساتھ ہی کلائی میں باندھنے والی گھڑی بھی کچھ عرصے بعد بازاروں میں عام فروخت ہونے لگی۔

تو مجھے یہ خیال بھی گزرا تھا کہ کہیں مارے ہی نہ جا چکے ہوں۔

کارتوس کی کمی کی وجہ سے سرفراز سنبھل سنبھل کے اور نشانہ جما کر فائرنگ کر رہا تھا لیکن دوسری طرف سے تڑاتڑ گولیاں آ رہی تھیں۔ آخر ایک گولی سرفراز کے کاندھے کے نیچے سینے کی ہڈی میں آ کر لگی اور وہ تڑپ کر نڈھال ہو گیا۔ گولی بھرپور اور گہری لگی تھی۔ میں کچھ نہ کر سکا۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ سرفراز کے رائفل کی گولیاں بھی شاید ختم ہو چکی تھیں اس کا ایک ہاتھ بے دم ہو چکا تھا۔ پھر بھی رائفل پر سے اس کی گرفت چھوٹی نہیں تھی ہاں ڈھیلی ہو گئی تھی۔ زخم سے خون بُری طرح اُبلنے لگا تھا۔ درد اور اذیت کی شدت سے اس کے چہرے پر تشنج کی کیفیت طاری تھی زندگی اور موت کی کشمکش میں بھی وہ سنبھالا لینے کی کوشش کرتا رہا۔ کچھ دیر تک سکوت طاری رہنے کے بعد سکندر نے سمجھا کہ مطلع صاف ہو چکا ہے۔

سکندر نشانہ باندھے کچھ دیر اور انتظار کرتا رہا پھر شاید اسے یقین ہو گیا کہ دشمن ہلاک یا زخمی ہو چکا ہے اس سکوت پر ماہ پیکر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ "بھیا" اور بھائی جان کی دلدوز چیخیں سنائی دینے لگیں۔ سکندر نے جب اپنا اطمینان کر لیا تو وہ ماہ پیکر کی طرف بڑھا جس کی آڑ لے کر اس کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

سرفراز کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔ "عظمت میاں! ابھی رائفل میں ایک گولی باقی ہے جو خان بختیار کے گھرانے کی آبرو بچا سکتی ہے۔ تم ذرا میرے زخمی کاندھے کو سہارا دو۔"

میں نے جیسے تیسے اسے سہارا دیا۔ نہ جانے کون سی طاقت سرفراز کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے اپنی منتشر ہوتی ہوئی توانائی کو جمع کر کے نشانہ باندھا اور تھرتھراتے ہاتھوں سے گولی چلا دی۔ ایک جگر خراش چیخ کے ساتھ ماہ پیکر زمین پر تڑپنے لگی۔ سرفراز کا سر بے جان ہو کر ڈھلک گیا۔

یہ برسوں کی بات ہے مگر میں آج بھی خود کو یقین دلانے کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ سرفراز نے فائر ماہ پیکر پر نہیں بلکہ سکندر پر کیا تھا!!

جگہوں پر لاکھڑا کرتی تھیں جہاں سے وہ کترا کر بھی نہ نکل پاتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ مکڑی کے خوشنما فریب میں پھنسنے والا ہے۔ وہ جو اپنی زندگی کو بہتر کرنے کی جدوجہد میں لگا ہے دراصل فریب نظر ہے ایسا فریب جس نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم کردی ہیں۔ اب جو رہ گیا ہے وہ دھوکہ ہے۔ ایک من گھڑت خودساختہ اختراع ہے جس میں الجھا کر جولی اس کو تختہ دار پر چڑھا دے گی کیونکہ وہ جولی کے حسن سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ وہ باقی لڑکوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے نہیں چلا تھا اور یہی بات اس کی انا پر کاری ضرب لگا گئی تھی۔ وہ دانستہ اس کے قریب آ گئی تھی اتنی قریب کہ اس کی سانسوں کی مہک اس نے چہرے پر ایسے محسوس ہورہی تھیں جیسے کسی نے بیک وقت کتنی ہی گلاب کی مہکتی پتیاں اس کے منہ پر بکھیر دی ہوں۔ اس کے دلفریب پرفیوم کی خوشبو نے اس کو مخمور کردیا تھا لیکن ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں وہ ہوش کی وادی میں واپس آچکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کو پیچھے دھکیلا اور سٹپٹا کر کھڑا ہو گیا۔ جبکہ وہ زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔

اس کے ماتھے پر پھیلے جابجا پسینے کے نشانات نے زیرک جولی کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ مرغا دام میں پھنس چکا ہے۔ اس نے دوبارہ اس کی رضامندی نہیں مانگی تھی بلکہ ایک رقم کا لفافہ اس کے ہاتھ میں اس طرح تھمایا تھا کہ اپنے دونوں ہاتھوں کا لمس اس کے کپکپاتے ہاتھوں میں منتقل کردیا تھا۔ وہ مرغ بسمل کی طرح نظر آرہا تھا لیکن خاموش تھا تھوڑی دیر پہلے والی طراری و زبان دانی سب جھٹکے میں چھن گئی تھی۔ "اس کام کے لئے میرے دو آدمی تمہاری مدد کریں گے لیکن کام تمہیں خود کرنا ہوگا۔ یہ فائل رکھو اس شخص کی تمام معلومات بمعہ تصویر موجود ہیں۔ یہ کہاں سے آتا ہے کہاں جاتا ہے کس سے ملتا ہے...... یہ سب تم نے نوٹ کرکے بتانا ہے اس کام کے لئے تمہیں دو دن ملیں گے دو دن بعد تم اس فائل میں درج فون نمبر پر کال کرکے معلومات دو گے اور ہاں اس کام کے لئے تمہیں ایک کار فراہم کی جائے گی اور جو اشیاء درکار ہوں تم لے سکتے ہو اس کے لئے الگ سے رقم دی جائے گی۔ بس کام محتاط انداز میں ہونا چاہئے۔"

فائل تھامنے کے بعد وہ کچھ دیر اس کو دیکھتا رہا پھر بولا، "میں اب جاسکتا ہوں......"۔

"دل نہیں چاہ رہا تو بیٹھ جاؤ دونوں کافی پیتے ہیں......" جولی نے خوشدلی سے پیشکش کی۔

"تھینکس مجھے ہسپتال جانا ہے......" وہ روکھے لہجے میں بولا۔

"تمہاری یہی باتیں تو بس خیر تم جاسکتے ہو"......

اس کے جانے کے بعد جولی کافی دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔

دو دن کی خواری کے بعد اس نے فائل میں درج فون نمبر پر کال کرکے اس آدمی کی ساری سرگرمیاں من وعن بتادی تھیں اور اس پہلی رپورٹ پہنچانے کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد اس کو جولی کی طرف سے پیسوں سے بھرا ایک لفافہ مل گیا تھا۔ وہ حیران ہوگیا تھا۔ لفافے میں ایک اور خط ارسال کیا گیا تھا جس میں اس آدمی پیٹر کے سیکرٹری ٹریسن کو اغوا کرنے کا کہا گیا تھا۔ یہ کام اگرچہ پہلے کام کی نسبت مشکل تھا لیکن تین دن صبح شام اس نے ٹریسن کو ٹریس کیا تھا اور جب ایک شام وہ لیٹ نائٹ گھر کے لئے روانہ ہوا اس نے ان دو آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اغوا کرلیا تھا اور جولی کے بتائے گئے پتے پر اس کو پہنچا دیا تھا۔ اگلے ہی دن اس کو ایک پیسوں سے بھرا ایک اور لفافہ ملا تھا۔ وہ خود کو ایک چکرویو میں پھنستا ہوا محسوس کررہا تھا۔ اس کو جتنی رقم

"میں کر ہی کیا سکتا ہوں؟ ڈیڈ کے چلے جانے کا سوچ کر ہی میری سانسیں رُکنے لگتی ہیں، میرا دل بند ہونے لگتا ہے۔ جولی، ان کے جانے کا ہلکا سا کھٹکا بھی مجھے رات رات بھر بے چین رکھتا ہے۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا ہے مجھے اپنی نااہلی کھلنے لگی ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا تم فکر نہ کرو" جولی کی تسلی و تشفی بھی اس کے ملال کو کم نہ کر پائی تھی۔

جولی کے جانے کے بعد بھی اس کے اندر کا خلفشار کم نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کے دوست کل رات کی کمائی کو بے دریغ خرچ کرنے میں جت گئے ہوں گے۔ ایک وہی تھا جو سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا تھا، حرام کو حلال کرنے کی کوششوں میں سرگرداں تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ تبھی کسی نے اتنے زور و شور سے کار اس کے بالکل قریب روکی کہ وہ اچھل پڑا۔ اس نے ناگواری سے کار کی جانب دیکھا۔ کار کا شیشہ نیچے ہوا اور جولی کھڑکی سے سر باہر نکال کر بولی "میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں مارتھر۔" جولی کی آواز اس کے لیے حیران کن نہیں تھی وہ جانتا تھا کہ وہ گرداب میں پھنسنے جا رہا ہے۔ وہ یونہی آدھا گھنٹہ پہلے اس کے پاس نہیں بیٹھی تھی۔ وہ انتہائی مطلبی خودغرض اور امیر باپ کی بگڑی ہوئی بیٹی تھی جس کے بیک وقت کتنے ہی بوائے فرینڈز تھے۔ اس کے نزدیک اچھائی بُرائی کا کوئی معیار نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اس کو تاش کے پتوں کی طرح استعمال کر کے پھینک دے گی۔

"تم میری کیا مدد کر سکتی ہو جولی......" مارتھر کو اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ "وہ میں تمہیں فرائی ڈے کو بتاؤں گی۔ تم مجھے اس جگہ ملنا۔" اس نے ایک مہر بند لفافہ اس کے حوالے کیا اور کار آگے بڑھ گئی۔ جبکہ وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گیا تھا۔

وہ مقررہ دن اس کے بتائے گئے پتے پر پہنچ گیا۔ وہ ایک تہہ خانہ سا تھا جہاں کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ دل عجیب و غریب وسوسوں سے دھڑکنے لگا۔ اس گھومتی گلیوں کی بھول بھلیوں سے ہوتا ہوا وہ مین ہال میں آیا اب تک وہ ایک معمولی گلی محلے کا چور تھا اور اب وہ اس کو ایک سمندر میں دھکیل رہی تھی۔ وہ عین سامنے ایک کرسی پر براجمان تھی۔ اس کے ہاتھوں میں اوراق کا ایک پلندہ سا تھا اس پر نظر پڑتے ہی اس نے اس پلندے کو بند کیا اور پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہوگئی۔ "مارتھر میں تم سے کوئی غیر قانونی کام نہیں لینا چاہتی لیکن یہ کام قانونی بھی نہیں ہے۔ بہرحال میں چاہتی ہوں میرا یہ کام تم کرو۔"

"کیوں کوئی اور مرغا نہیں پھنسا دام میں"......

وہ زور سے ہنسنے لگی۔ کچھ دیر ہنستے رہنے کے بعد بولی "یوں سمجھ لو...... بھروسہ اعتماد ایک دیوار ہیں اور اس دیوار پر صرف انہی لوگوں کو چڑھایا جاتا ہے جو اس کے قابل ہوں......"

"اور تمہیں میں اس کے قابل لگا ہوں"......

وہ استہزائیہ انداز میں بولا تھا۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا وہ کوئی کڑوی گولی دانتوں میں پھنسا کر بیٹھا ہو۔ جبکہ مقابل نے قطعی طور پر اس کی بات کو نظرانداز کیا تھا اور ایک مبہم سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کے کناروں کو مزید نکھار دیا تھا۔ بلاشبہ وہ جاذب نظر تھی۔ دیکھنے میں بہت پرکشش تھی اس کی شخصیت متاثر کن تھی چال ڈھال بہتر تھی لیکن کردار کے حوالے سے وہ حد سے بدنام ہو گئی تھی۔

"کیا تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے مارتھر؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بغیر بولی۔ مارتھر کو ایسی مرد مار عورتوں سے ہمیشہ کوفت رہی تھی اور اس کی قسمت کی بھول بھلیاں اس کو ہمیشہ ناگوار و تعفن زدہ

سیّارہ ڈائجسٹ

شائع ہوگیا ہے

کی ایک اور عظیم ایمان افروز پیشکش

سرورِ کونینؐ کی 63 سالہ زندگی کے دوران وقوع پذیر ہونے والے سینکڑوں معجزات پر مشتمل

معجزاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نمبر

قیمت: 175 روپے

ان معجزات کے ذریعے

- لاتعداد انسانوں کے لیے راہِ ہدایت روشن ہوئی ——— اور
- دُنیائے انسانیت پر چھائی ہوئی کفر و جہالت کی تاریکیاں سمٹتی چلی گئیں۔

چاہیے تھی اس سے زیادہ مل گئی تھی لیکن جولی کا ایک کے بعد ایک کام نکلتا آ رہا تھا جس پر اس کو تشویش ہونے لگی تھی۔ لفافے میں اب کی بار اس پیٹر نامی بندے کو اسی مقام پر لے جانا تھا جہاں وہ ٹریسن کو چھوڑ آیا تھا۔ مارتھر نے تین دن مزید لگائے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس کو اغوا کیا۔ اس کو اغوا کرنا ایک انتہائی کٹھن مرحلہ تھا لیکن وہ اس کام کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اگلے ہی دن جولی نے اس کو بلا بھیجا تھا۔ "تم واقعی لاجواب ہو مارتھر۔ تم نے انتہائی مہارت سے یہ سارے کام کیے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ بس اب تمہیں آخری کام کرنا ہے۔ تم کسی بھی طرح پیٹر سے لاکر کا کوڈ حاصل کرو۔ مار کر یا ڈرا دھمکا کر اس کام کے لئے تمہارے پاس آج کا دن ہے بس۔ وہ ڈرا ہوا ہے بتا دے گا تمہیں۔ لیکن تمہیں یہ کام جلدی کرنا ہوگا۔"

"لیکن تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا جبکہ تم تو انتہائی امیر ہو۔" مارتھر نے پرشکن لہجے میں پوچھا۔

"بتاؤں گی سب کچھ بتاؤں گی مارتھر۔" وہ ایک پل پھر اس کے قریب ہو کر بولی۔ مارتھر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ہنستے ہوئے بولی "کیا مجھ سے ڈرتے ہو؟"۔

"میں تم سے نہیں ڈرتا تمہارے مل اونر منگیتر سے ڈرتا ہوں۔"

"منگیتر؟ ہاں میں تو بھول گئی۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ "میں جاؤں؟" اب مارتھر نے ناگواری سے پوچھا۔ "دل تو نہیں چاہ رہا کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی؟"۔

"میں نے کبھی تمہارے بارے میں نہیں سوچا" وہ نظریں چرا کر کمزور لہجے میں بولا۔ "تمہاری اس بے نیازی نے ہی تو......" اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی پھر بولی "تم جاسکتے ہو......" وہ رُخ موڑ کر کھڑی ہو گئی تھی اور مارتھر کو ایک لمحے کے لئے ایسا لگا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان آ ٹھہرا ہو۔ وہ اس طوفان میں خود کو نہیں ڈبونا چاہتا تھا اسی لئے سرعت سے باہر نکل گیا۔

مارتھر نے کوڈ حاصل کر لیا تھا لیکن وہ اس کام کو کر کے بھی ناخوش تھا۔ اگلے ہی دن جولی نے اس کو فون کر کے کام ختم ہونے کا عندیہ سنا دیا تھا۔ مارتھر جہاں خوش تھا وہیں آنے والے وقت کی ہولناکیوں کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس لڑائی میں دو ہاتھی مدمقابل ہیں اور ان کے بھڑنے سے سارا نقصان اس کو ہوگا اور سارا ملبہ اس پر گرے گا۔ اس لئے وہ جلد از جلد یہ شہر چھوڑ دینا چاہتا تھا اس کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی وہ اپنے باپ کو دوسرے شہر کے ایک اچھے ہسپتال میں داخل کرا آیا تھا اور اب سرعت سے یہاں سے نکلنے کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا کہ واپس جاتے ہوئے دو آدمیوں نے انتہائی ڈرامائی انداز میں اس کو اغوا کر لیا تھا۔ ایک آدمی نے پیچھے سے آ کر اس کو کچھ مارا تھا اور دوسرے نے سرعت سے اس کی ناک پر رومال رکھ دیا تھا۔ جب اس کو ہوش آیا اس نے خود کو کرسی پر نیم دراز پایا۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے سامنے دیکھا چار پانچ لوگ کھڑے تھے اور ان کے درمیان جولی کو دیکھ کر اس کو قطعی طور پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ زہریلی ناگن تھی ڈنگ مارنا اس کی فطرت تھی۔ اس کی بے قرار نظریں مارتھر کا طواف کر رہی تھیں، اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ وہ اس زہریلی ناگن کو نہیں چھوڑے گا تختہ دار پر وہ خود چڑھے گا تو اس کو بھی ساتھ چڑھائے گا۔

"پوچھیں اس سے، یہ سارا پلان انہی دونوں کا تھا۔ یہ مجھے آپ کی نظروں میں گرانا چاہتی تھی انکل یہ کام یہ بہت دفعہ کر چکی ہے۔" پیٹر چلا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مارتھر اور جولی کو دونوں کو

شوکت افضل

آخری قسط

انا کی زنجیر

شوکت افضل کی زیرِ نظر کہانی ہمیشہ کی طرح دلچسپ کرداروں اور حقیقت سے قریب موضوع پر مبنی ہے۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی سے ہمارے معاشرے میں بڑھتی مادہ پرستی اور دولت و وسائل رکھنے والوں کے کردار کی پستی کو بے نقاب کیا ہے۔ اس کہانی میں جہاں رومان کے رنگ دکھائے گئے ہیں وہاں ساتھ ساتھ کئی خوبصورت سبق بھی موجود ہیں۔ جب سچے جذبات کی قدر نہ کی جائے اور جائز ناجائز ذرائع سے دولت کو ہی اپنا سب کچھ تصور کر لیا جائے تو قدرت ایسے لوگوں کو کیسا سبق سکھاتی ہے۔ شوکت افضل کی اس کہانی میں بڑے پُراثر انداز سے یہ بات واضح کی گئی ہے۔ (مدیر)

ایک نوجوان کی کہانی جس کے جذبات کا مادہ پرست معاشرے میں کوئی مول نہ تھا

"سہری! کیا آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟"
سارہ کے کانوں سے بیٹھے شاہد حسین کی آواز ٹکرائی تو اس نے بند آنکھیں کھول کر سراسیمگی سے [illegible] میں دیکھا۔ اس کی طرف کا دروازہ کھول کر

شاہد سامنے کھڑا [illegible] نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے پیچھے ایک گنجان درختوں میں گھرا ہوا ایک سرسبز مگر سنسان مقام تھا۔
"آئیے" شاہد نے اسے اُتارنے کے لیے ہاتھ

موت کے گھاٹ اُتار دے۔" "ہاں اس نے اغوا کیا تھا"۔ جولی کی آواز پر وہ ٹھٹکا۔ وہ واقعی ناقابلِ بھروسہ تھی۔ وہ اس پر دھاڑنے والا تھا کہ اس کے آگے کے الفاظ نے اس کو خاموش کرادیا۔ "میرے کہنے پر۔"

"تمہارے کہنے پر جولی؟" پاپا نے جولی کو تحقیر آمیز تاثرات کے ساتھ دیکھا۔

"اچھا تو وہ تم ہی تھیں میں تو اندھیرے میں تیر چلا رہا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ واقعی یہ غلیظ حرکت تمہاری ہوگی۔ میں نے تم سے کتنا پیار کیا تھا اور تم نے میرے ساتھ یہ کیا ہے۔" وہ جولی کے قریب ہوا جولی نے آگے بڑھ کر اس کو دھکا دے دیا۔ نازک اندام سی جولی کے پرزور دھکے نے بھی اس کو ٹس سے مس نہیں کیا تھا وہ زور سے چلائی۔ "تم جیسے سپولے کسی سے پیار نہیں کرسکتے۔ میں دکھاتی ہوں تمہارے کارنامے، پاپا یہ کتنا پیار کرتا ہے آپ سے اور مجھ سے وہ یہ ثبوت دیں گے۔" اس نے فائل ان کے ہاتھ میں تھمائی۔ "دیکھیں کس طرح اس آستین کے سانپ نے ہمارا خون چوسا ہے۔" پیٹر ایکدم سے چلایا، "اپنی بکواس بند کرو تم مجھ سے نفرت کرتی رہی ہو اس لئے تم نے یہ سب کچھ کیا ہے تاکہ انکل کی نظروں میں مجھے گراسکو لیکن تم ایسا ہرگز نہیں کر پاؤ گی وہ تمہاری فضول باتوں پر یقین نہیں کریں گے۔"

وہ مطمئن دکھائی دے رہا تھا پریشانی کا ہلکا سا شائبہ بھی اس کے چہرے سے عیاں نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن جولی قطعی طور پر بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ "میں نے کچھ نہیں کیا جو کچھ کیا ہے تم نے کیا ہے میں نے تو بس ثبوت جمع کیے ہیں۔ دیکھیں پاپا، آپ نے فائل نہیں کھولی ابھی تک۔ میں بس اتنا چاہتی تھی کہ پاپا یہ جان جائیں کہ وہ جس کو معمولی سا زخم سمجھ کر نظر انداز کر رہے تھے وہ ہماری جانوں کا ناسور بن گیا ہے۔ وہ بچپن سے ایک سانپ کو دودھ پلاتے رہے ہیں۔" پاپا فائل کھول کر دیکھ رہے تھے ان کا سیکرٹری ان کو سمجھا رہا تھا کہ کہاں کیسے اور کس کس طرح گھپلا کیا گیا تھا۔ کمپنی میں پیٹر نے کمال مہارت سے گھپلے کئے تھے کہ ان ثبوتوں کے بغیر اس کو پکڑنا ناممکن تھا اور یہ سارے کاغذات پیٹر کے لاکر سے برآمد ہوئے تھے۔ پیٹر حواس باختہ سا ہوگیا تھا۔

"اب میری کمپنی میں اور میرے گھر میں پیٹر تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے" اور اس کے ساتھ پاپا نے ایک زوردار تھپڑ پیٹر کو دے مارا لیکن...... یہ سب سچ نہیں تھا بلکہ جولی کا وہم تھا۔ اگلے ہی پل وہ حقیقت کی دنیا میں آگئی تھی۔ پاپا نے فائل جولی کے منہ پر دے ماری تھی "جولی یہ سب کیا بکواس ہے یہ سب کاغذات میرے خلاف جاتے ہیں کیا میں اتنا بڑا بیوقوف ہوں کہ اپنی فیکٹری میں خود گھپلے کروں گا۔" جولی کی حالت اس وقت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن سے لہو نہ ملے......

"پیٹر تمہاری شادی اب اس ماہ ہوگی جولی سے۔ وہ یہ کہہ کر چلے گئے تھے...... اور جولی نے بے یقینی سے مارتھر کی جانب دیکھا۔ شاید جولی نے اس چہرے کا غلط انتخاب کیا تھا۔ شاید دل لگی کا ڈرامہ دل کی لگن بن گیا تھا۔ اس مہرے نے اس کو شہ مات دی تھی۔

"یہ میرے کہنے پر ہر کام کرتا رہا ہے حتیٰ کہ تم سے کیا کیا کہنا ہے یہ سب بھی میں نے اسے بتایا تھا۔ یہ...... میرا آدمی ہے جولی۔" پیٹر کی پرسکون آواز اس کو کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جبکہ مارتھر اور پیٹر کے قہقہوں نے اس کی آنکھوں میں دھند کی آندھیاں چلا دی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بس ایک ہی الفاظ کی بازگشت ہو رہی تھی "شہ مات"۔ جبکہ مارتھر ایسے کھڑا تھا جیسے کہہ رہا ہو جولی ہر ایک انسان پر حسن کے وار کارگر نہیں ہوتے اور اس حقیقت کو تو اب جولی نے بھی تسلیم کر لیا تھا۔

"اُف کس قدر حسین لڑکی ہو تم۔ بالکل گوڈیس ایفروڈائٹی کی طرح۔" ناصر نے بہکے ہوئے لہجے میں اس کے گھنگھریالے بالوں کی ایک لٹ ہولے سے کھینچ کر کہا تو سارہ کی شرمائی ادا نے مزید جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس سے کسمساتے بدن اور دہکتے رخساروں والی آفت جان سارہ ناصر کو راحت دل محسوس ہونے لگی' اس کا جی چاہا۔ سب کچھ بھول بھال کر اس مرمریں گداز گڑیا کو اُٹھا کر سینے میں چھپالے اور جب سارہ نے اپنے گلابی ڈوروں والی مخمور نگاہیں اُٹھا کر ناصر کی طرف دیکھا تو وہ ان مدھ بھرے پیالوں میں ڈوبتا چلا گیا اور دور جیسے سات سمندروں کے نیلگوں پانیوں پر سے ہوتی ہوئی ایک شبنمی' رسیلی' نشیلی سی' ہوش ربا گیت کی لے ناصر کے کانوں میں گونجنے لگی۔

"رقص سے تیز کرو۔ ساز کی لے تیز کرو' سوئے بے خانہ' سفیران حرم آتے ہیں' رقص سے تیز کرو' ساز کی لے تیز کرو۔ اور پھر ساز کی لے تیز تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی اس لے کے ساتھ بگولے کی طرح گھومنے لگا اس کی ذات میں چھپا ٹائی فون اس کے وجود کی دیواروں کو دھڑ دھڑاتے ہوئے کہاں کا کہاں جا نکلا اور پھر ایک چھناکے سے ساز کے سُر بکھیرتے تار جھنجھنا کر ٹوٹ گئے' شور جنوں تھم گیا اور کوئے جاناں میں رقص کرتے گھنگھرو ٹ کر دانہ دانہ ہو کر دور دور تک بکھر گئے اور ناصر و سارہ کی مدہوش کن آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں گتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگا تھا یکا یک چونک ر بیدار ہو گیا۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی رکی لو دیتی آنکھوں کے آگے پلکوں کی خاردار باڑ ڑی کرلی اور اس کے اندر انتقام کا زخمی ناگ اپنا ن اُٹھا کر پھر بار بار اس کے سینے کی دیواروں کے ھ سر ٹکرانے لگا۔

لیکن اس دوران اس کی ہر کیفیت سے بے نیاز سارہ اپنی پوجا کا پھولوں بھرا تھال ناصر کے قدموں پر وار چکی تھی۔ اس پجارن کی طرح جسے اس بات کی کوئی پروا نہ ہو کہ دیوی نے اس کی بھینٹ قبول کی یا نہیں۔

گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ سارہ کی آرزوؤں کے کنول کھل رہے تھے سپنے رنگین سے رنگین تر ہوتے چلے جا رہے تھے اگرچہ شاہد نے کبھی کبھار اس کے حُسن کی تعریف کرنے یا تحفے تحائف دینے کے علاوہ اس سے کبھی اظہار محبت نہ کیا تھا لیکن سارہ اس کو بھی اپنے لئے بہت کچھ سمجھتی۔

ادھر سیٹھ کریم کھلی آنکھوں سے ان دونوں کی باہمی دلچسپی اور ساتھ گھومنے پھرنے کو دیکھ رہا تھا۔ بلکہ جانتے ہوئے بھی دونوں کو زیادہ سے زیادہ قریب آنے کے مواقع فراہم کر رہا تھا شاید اسے سارہ کے لئے ایسے ہی امیدوار کا انتظار تھا۔

؎ دل سے پھر ہو گئی مری بات کہ اے دل اے دل

یہ جو محبوب بنا ہے تیری تنہائی کا
یہ تو مہمان ہے گھڑی بھر کا' چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا
مشتعل ہو کے ابھی اٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہوگا
جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل

اور آج پھر سیٹھ شاہد حسین اور سارہ دونوں بڑے خوش تھے۔ سیٹھ شاہد حسین کی آنکھیں کسی نامعلوم جذبے کے زیر اثر دہک رہی تھیں خوب باتیں ہو رہی تھیں قہقہے اُچھل رہے تھے۔ سارہ زندگی کے اس رُخ سے ابھی تک ناآشنا رہی تھی۔ سیٹھ کریم بخش نے کبھی اس قدر کھل دی ہی نہ تھی نہ

آگے بڑھایا۔ اس لمحے سارہ کو خیال آیا کہ وہ تو بغیر سوچے سمجھے اور معلوم کیئے شاہد کے ساتھ یہاں تک آ گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مگر اس کی زبان پر جیسے تالے پڑ گئے تھے۔ اس نے سہمی ہوئی کبوتری کی طرح ہاتھ شاہد کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا اور پھر خاموشی سے کار سے اُتر آئی۔ چند قدم ساتھ چلنے کے بعد دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہریالی اور خودرو پھولوں کو دیکھ کر جیسے خشک گلے سے تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

''واقعی مصوری کیلئے یہ ماحول بہترین ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ کچھ بہار نے بھی اس منظر کو زیادہ روپ بخش رکھا ہے۔ شاہد صاحب معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی نیچر کے شیدائی ہیں ورنہ شہر سے باہر یہ اتنا دُور دراز گوشہ کیونکر اب تک ہماری نظروں سے اوجھل رہا اور میں بتاؤں کہ...... ویسے بھی مجھے تو بہار کا موسم تمام موسموں سے اچھا لگتا ہے۔''

''لیکن مجھے تو خزاں زیادہ پسند ہے مس سارہ صاحبہ جب خزاں ان اونچی اونچی خود سر مغرور چوٹیوں والے درختوں کو عریاں اور ٹنڈ منڈ کر کے بے بسی کی تصویر بنا کھڑا کرتی ہے اور ان کے پتے سوکھ کر زرد رو آسیبوں کی طرح ہواؤں میں اپنے استخوانی پنجے پھیلائے منڈلا منڈلا کر اوندھے منہ زمین پر بچھ جاتے ہیں۔ تو پھر مجھے ان سوکھے پتوں کو قدموں تلے روند روند کر چلنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جب یہ پتے میرے پاؤں تلے کراہ کراہ کر ٹوٹتے ہیں تو ان کی چرچراہٹ کی آواز سے میری روح کو سکون ملتا ہے۔ نجانے کیوں؟'' شاہد نے جیسے دانت پیس کر کہا اور پھر ایک ایسی کھوکھلی ہنسی ہنس پڑا جس میں کھنڈروں کی سی بازگشت تھی۔

''اف ایسا ہینڈسم شخص ایسی منفی سوچ ایک دم اذیت پسند۔SADDIST۔''

سارہ نے قدرے ہراساں ہو کر سوچا اور پھر جونہی اس نے شاہد سے نظریں ملائیں تو اس کی آنکھوں میں اسے ایسی چمک نظر آئی جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے آسمان میں بجلی کے کوندے لپک رہے ہوں ...... اور یک دم سارہ کو ان آنکھوں کو دیکھ کر ناصر کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ آخری بار جب اس نے اسے گھر سے نکل جانے کو کہا تھا تو جاتے سمے جب ناصر نے مڑ کر سارہ کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بھی یہی موسم تھا۔

سارہ کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ نجانے کیا بات تھی کہ اس سے پہلے بھی سیٹھ شاہد حسین کی آنکھیں اسے شناسا سی لگی تھیں مگر وہ پھر اس قدر جلد گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتی تھیں کہ سارہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا۔

''شاہد صاحب! نجانے کیوں کبھی کبھی آپ مجھے بے حد شناسا سے لگتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پہلے بھی کہیں آپ کو دیکھتی رہی ہوں۔'' آخر ایک دن سارہ نے سیٹھ شاہد حسین سے کہہ ہی دیا۔

شاہد کے ہونٹوں پر بھینچی بھینچی سی مسکراہٹ لرزنے لگی جس کا عکس اس کی آنکھوں میں نہ نظر آ سکا۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر کتنے ہی لمحے سوچتا رہا مگر یکدم ہی نجانے کس خیال کے تحت ہنس پڑا اور بولا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں تم نے مجھے ضرور دیکھا ہوگا پتہ ہے کہاں؟ اپنے خوابوں کے حسین جزیروں میں جہاں تم میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتی رہی ہو۔ ارے حیران ہو کر کیا دیکھنے لگیں کیا بھول گئی اتنی جلدی مہ پارا؟'' ناصر نے جذبات سے بوجھل سرگوشی نما آواز میں سارہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو سارہ نے شرماتے ہوئے چہرہ نیچے جھکا لیا۔

ب میں بھی شاہد کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے
در کے شور مچاتے ساحلوں کے قریب گھومتی رہی
ں سرمست بھیگی ہوئی سمندر کی لہریں بار بار اس
قدموں سے آ کر لپٹ لپٹ جاتیں اور وہ نیند
ھی مسکراتی رہی۔

گر ناصر رات گئے تک اپنے کمرے کے
یچے میں کھڑا سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔
شریر ہوائیں البڑ دوشیزاؤں کی طرح ناصر کو چھیڑ
ر سرگوشیاں کررہی تھیں مگر وہ نیرنگیٔ زمانے پر
ن و پریشان سوچ میں گم فیض کے ان اشعار پر
در رہا تھا۔

یسی مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
دم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
یے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
یکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
یے کلیوں کے لئے جھکی ہے خود شاخ گلاب
س طرح رات کا ایوان مہ...

کہ کون مخبری کررہا ہے اور اس طرح تو وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے والی بات بنی ہوئی ہے اور آخر کار اس کے اس ظاہری کاروبار پر جو دراصل کالے دھندے پر مشتمل تھا بُری طرح زد پڑنے لگی۔

اب سیٹھ کریم کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ ادھر جب وہ تقریباً اپنی تمام جمع پونجی حصص خریدنے میں لگا چکا تھا تو حصص کی قیمتیں گرنی شروع ہوگئیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ جب سے سیٹھ شاہد نے اس کے ساتھ شراکت کی تھی پے در پے ناکامیاں اس کے نصیب میں لکھی جاچکی تھیں مگر وہ شاہد پر اس لئے شک بھی نہ کرسکتا تھا کیونکہ شاہد کی اپنی بھی کافی رقم اس کے کاروبار میں لگی ہوئی تھی۔

"اے میرے مالک اب کیا ہوگا؟ یہ کیا ہورہا ہے؟ اور کیا ہونے والا ہے؟" سیٹھ ...
کر ...

ہی وہ خود بھی ذہنی یا جسمانی طور پر کسی کے اس قدر قریب آئی تھی۔

"سارہ۔" ناصر نے پرسوچ نظروں سے سامنے دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"جی!" وہ سرشار لہجے میں بولی۔

"پتہ ہے آج ہم کہاں جارہے ہیں؟" ناصر نے کار کو تیز کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کے ساتھ تو میں کہیں بھی جاسکتی ہوں شاہد۔" سارہ نے آنکھیں موند کر اپنا سر اس کے شانے سے لگاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں شاہد نے کار ایک جگہ روک دی اور اتر کر سارہ کو اترنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ سارہ ہرنی کی سی کلانچ بھر کے نیچے اتر آئی۔

ذرا دور سامنے دریا بہہ رہا تھا۔ اس کی مست خرام موجیں غروب ہوتے سورج کی کرنوں میں دمک رہی تھیں سبزے کے اس وسیع رقبے میں جگہ جگہ جنگلی پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ پیڑوں پر سے پرندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور فضا بیت مست آوارہ خوشبو سے بوجھل تھی۔ ذرا پرے درختوں کے جھنڈ میں گھری ایک ہٹ (HUT) نظر آرہی تھی اسے دیکھ کر سارہ بے ساختگی سے بولی۔

"یا اللہ کیسا منظر ہے شاہد۔ بالکل ایسے ہی نا جیسے ویو کارڈز پر سینریاں بنی ہوتی ہیں۔ ہیں نا اور اس ہٹ میں کون رہتا ہوگا۔ شاہد؟" سارہ ننھی بچیوں کی طرح مچل کر بولی۔

"اف کتنی کیوٹ لگ رہی ہے باہر سے یہ ہٹ بھی۔ بالکل پریوں کی کہانیوں جیسی یہاں کون رہتا ہوگا شاہد جلدی سے بتاؤ نا۔"

ناصر کو سارہ کے یہ الفاظ بجلی کے کرنٹ کی طرح لگے۔ اس نے جیسے چونکتے ہوئے اس کے دل فریب چہرے کو غور سے دیکھا، یہ وہی جھونپڑی تھی جس میں درد و اذیت کی نجانے کتنی صدیاں ناصر پر سے گزری تھیں۔ جب وہ اسی ہٹ کے دروازے تک گھسٹ گھسٹ کر بمشکل اپنے پامال وجود کو پہنچا پاتا تھا اور اس کی دہلیز پر بیٹھ کر افق کی ڈوبتی راہوں پر دور دور تک نظر دوڑاتا تھا۔ اس دہلیز کی مٹی میں اس کے نجانے کتنے آنسو اور کراہیں دفن تھیں وہ اس جنگل میں کبھی صبح سے، کبھی رات کی تاریکی سے سوال کرتا رہتا تھا۔

"میرا قصور کیا تھا؟" میرا قصور کیا تھا؟"

اور آج عمر گریزاں کی جلتی ہوئی دہلیز پر چلتے چلتے وہی آفت جاں اس کے ساتھ ساتھ یہاں تک آپہنچی تھی جس کے سبب اس نے اس گوشہ تنہائی میں غم کی یلغاریں سہی تھیں اور اس دن سے آج تک ناصر کے روح اور بدن کو انتقام کے شعلے بھسم کئے دے رہے تھے وہ دن رات انگاروں کے بستر پر لیٹا رہتا اور آج انتقام کے یہ بھڑکتے شعلے سارہ کے دامن کو بھی جھلسانے کیلئے بے تاب نظر آرہے تھے۔

ناصر نے اپنی متغیر ہوتی ہوئی حالت کو سنبھالا اور چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ سجا کر سارہ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے ڈالی سے پھول توڑنے سے پہلے نظروں سے پرکھا جاتا ہے اور پھر سرگوشی نما آواز میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

"مجھے تو یہ ہٹ (HUT) خالی معلوم ہوتی ہے سارہ۔ بہرحال چل کر دیکھتے ہیں کیسی ہے بھلا یہ اندر سے؟"

اس رات واپس آنے کے بعد سارہ اپنا کمرہ بند کر کے کتنی ہی دیر سیٹھ شاہد حسین کا تحفے میں دیا ہوا جواہرات کا بھاری سیٹ پہن کر آئینہ میں اپنا سراپا دیکھتی رہی۔ آج اس کا انگ انگ شاہد کی محبت میں سرشار تھا۔ وہ اپنا سب کچھ شاہد پر نثار کر چکی تھی۔ وہ

- جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جلوۂ یار کا بے نقاب مشاہدہ کر کے شرف صحابیت پایا
- جنہوں نے منبع رشد و ہدایت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست کسب فیض کیا۔
- جنہوں نے صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے رموز و اسرار سمجھے۔
- جنہوں نے اپنے خون جگر سے چمنستان اسلام کی آبیاری کی۔
- جنہوں نے اپنے ارفع سیرت و کردار سے چہرۂ انسانیت کی سیاہیاں دھو ڈالیں۔
- جنہوں نے انتھک مخلصانہ جدوجہد سے جنت نظیر معاشرہ کی صورت گری کی۔
- جنہوں نے فیصلہ کن اور غیر مصالحانہ ٹکر لے کر باطل کو تہہ و بالا کر دیا۔

۵۰۰ صفحات پر مشتمل سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب سرورق

شائع ہو گیا ہے

کی کوئی بات چلائے گا مگر وہ تو سرے سے ہی غائب تھا۔ اس دوران ایک اور وسوسے نے اس کے وجود پر دستک دینی شروع کردی۔ ایک صبح وہ اٹھی تو اس کی طبیعت میں سخت گرانی تھی۔ اس کا دل جیسے ڈوبا جارہا تھا بیڈ ٹی کا پہلا گھونٹ لیتے ہی اسے ابکائی سی آ گئی اور ساتھ کے ساتھ بے خیالی ہی میں سامنے دیوار پر لگے کیلنڈر پر جونہی اس کی نظر پڑی وہ وہیں جم کر رہ گئی۔ کتنی ہی دیر وہ ٹکٹکی باندھے ایک ہی نمبر کو دیکھے گئی اور اس کے بعد پہلا کام جو اس نے کیا وہ اپنی ایک دوست ڈاکٹر شکیلہ کے کلینک جا پہنچی۔ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔

وہ اجنبی سوداگر دُور دیس کے الف لیلوی شہزادوں کی مانند تحائف اور اپنے مسحور کن وجود کی سوغات لے کر آیا۔ اس کے سنگ وہ خوابوں کے نگر نگر گھومتی رہی۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور پھر نجانے کیا ہوا کچھ پتہ نہ چل سکا یاد کرنے پر بھی یاد نہ آتا تھا۔ وہ کون سی منزل تھی، وہ کون سے لمحات تھے جب اس نے اس کے وجود کا ایک حصہ چپکے سے اپنے وجود میں سمولیا تھا حالانکہ سوداگر تو کبھی بھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے۔

ڈاکٹر شکیلہ نے اس کی مدد کرنا چاہی تو سارہ نے ایسی کٹتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا جیسے شکیلہ اس کی کسی نہایت ہی قیمتی چیز کو چھیننے جارہی ہو۔

"یہ امانت میں خیانت ہوگی شکیلہ اور پھر اسے آ لینے دو وہ آتا ہی ہوگا۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ وہ جب آئے گا تو میں اسے سب کچھ بتا دوں گی۔ سب کچھ بتا دوں گی۔ اور پھر وہی ہوگا جو وہ چاہے گا۔" اور وہ کلینک سے باہر نکل آئی اس کے قدم اس طرح زمین پر پڑ رہے تھے جیسے وہ کوئی کانچ کا نہایت نازک آبگینہ اٹھائے ہو۔

آخر جان لیوا انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں جونہی سارہ کو معلوم ہوا کہ سیٹھ شاہد واپس آ گیا ہے تو وہ جیسے اپنے آپ سے شرما گئی۔ اک نئے احساس کی حدت سے اس کا رواں رواں آنچ دینے لگا۔ وہ جیسے اُڑ کر فون کے پاس گئی اور اس کا نمبر ملانے لگی آگے سے پرائیویٹ سیکرٹری نے فون اٹھایا سارہ کی آواز سنتے ہی بولی۔

"میڈم! سیٹھ صاحب تو اس وقت میٹنگ میں مصروف ہیں۔"

"اچھا تو جس وقت فارغ ہوں ان کی مجھ سے بات کروا دینا۔" سارہ نے لرزتی آواز میں کہا۔

مگر ایک دن پھر دو دن گزر گئے سیٹھ شاہد کا فون نہ آیا۔ سارہ نے جھلا کر پھر فون کیا تو دوبارہ اسی پرائیویٹ سیکرٹری نے فون اٹھایا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ سیٹھ شاہد کی مجھ سے بات کروائیں۔" سارہ نے تیز لہجہ میں کہا۔

"میڈم میں نے سیٹھ صاحب کو عرض کیا تھا کہ مس سارہ صاحبہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں مگر میڈم ہم جب بھی فون ملاتے ہیں جب سیٹھ صاحب بات کرنا چاہیں۔" پی اے نے بے چارگی سے کہا۔

"شٹ اپ۔" سارہ نے قدرے کھسیا کر کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

اور جب دو تین بار گھر فون کرنے پر بھی سیٹھ شاہد سے اس کا رابطہ قائم نہ ہوسکا تو وہ بے حد حیران ہوئی کہ آخر ایسی بھی کیا مصروفیات ہوسکتی ہیں جنہوں نے شاہد کے ذہن سے سب کچھ ایک دم محو کردیا ہے۔ تیسرے دن جھنجلاتے ہوئے وہ اس کے آفس جا پہنچی شاہد اسے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔

"آئیے آئیے مس سارہ صاحبہ۔ کہئے کیسے آنا ہوا۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت۔"

سارہ اس بدلے بدلے لہجے سے گھبرا کر یکدم جلدی سے کہنے لگی۔ "شاہد میں کب سے آپ سے

وہی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے والی بات ہوئی نا۔“ ناصر نے کچھ عرصہ پہلے کے سارہ کے کہے ہوئے لفظوں کے وار اسی پر چلا دیے۔

اور دُور ماضی کی ایک عطر بیز شام میں ایک سرسبز لان میں موتی بکھیرتے فوارے کے پاس کھڑے ایک خوبرو معصوم صورت نوجوان نے سارہ کے ذہن کی سکرین پر تڑپ کر زخمی نگاہوں سے سارہ کو دیکھا اور جب اپنے ہی لفظوں کی بازگشت سارہ کے کانوں سے ٹکرائی تو چونکتے ہوئے سارہ نے ویسی ہی زخم خوردہ نگاہوں سے شاہد کو دیکھا جس کے چہرے پر ایک زہریلی طنز بھری مسکراہٹ رقصاں تھی۔ شاہد نے اکتائے ہوئے انداز میں اپنی رسٹ واچ دیکھی اور ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

یادوں کی بساط پر بچھے ہوئے مہروں کی بازی ختم ہو چکی تھی اور اب صرف ایک سوال باقی رہ گیا تھا جس کے لئے سارہ نے اپنے بکھرے ہوئے حواس جمع کئے اور گویا آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے بولی۔

”آپ......آپ......کو اگر مجھ سے پیار نہ تھا تو پھر میرے اتنے قریب کیوں آئے؟“

شاہد چلتے چلتے رُک گیا اور پھر قدرے جھنجھلاہٹ اور پریشانی کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ آنکھوں میں نفرت بھر کر دھیمی سی آواز میں بولا۔

”سارہ...... سارہ جو کچھ بھی ہوا تمہاری رضامندی سے ہوا۔ میں جبراً تو تمہارے قریب نہیں آیا تھا۔ نہ ہی اس بات کی تمام تر ذمہ داری تم صرف مجھ پر ڈال سکتی ہو۔ بغیر کسی ثبوت یا گواہ کے۔“ یہ کہتے ہی شاہد بھاری قدم رکھتے وہاں سے باہر نکل گیا اور سارہ اسے پیچھے سے دیکھتی رہ گئی۔ حیران و ششدر آنسوؤں کی دیوار کے پیچھے سے وہ ایک متحرک دھندلی تصویر کی مانند نظر آ رہا تھا اور جب وہ ہوش میں آئی اور اس نے اپنی گردوپیش نظر دوڑائی معلوم ہوا وہ وہاں تنہا کھڑی ہے اور وہاں موجود عملے کے تمام لوگ اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان آتے جاتے لوگوں کی چبھتی ہوئی نظروں کے تھپیڑوں سے وہ اپنے حواسوں میں آ گئی اور تیز تیز چلتی ہوئی اپنی کار میں جا بیٹھی۔

کار کے روانہ ہوتے ہی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ اس بچے کی طرح زار و قطار رونے لگی جس کا کھلونا چھین لیا گیا ہو۔ اس کے شکستہ ارمانوں کا خون اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر اس کے شہابی رخسار بھگونے لگا۔

سارہ کی بربادی نے بوڑھے سیٹھ کریم بخش کا جیسے ذہنی توازن بگاڑ کر رکھ دیا وہ بالکل ہی بوکھلایا بوکھلایا پھرتا اور اس قدر کاروباری غلطیاں کرنے لگا کہ بالآخر اسی بینک کا مقروض ہو گیا جس کا کبھی وہ کرتا دھرتا تھا۔ ادھر بینک والوں کو سیٹھ شاہد کی خفیہ ہدایات تھیں کہ سیٹھ کریم جتنا قرضہ مانگے دیتے جاؤ اور پھر آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ بینک سیٹھ کریم کی قرقی کرنے پر مجبور ہو گیا۔

آنے والے لمحوں کا کرب سیٹھ کریم کو کسی پل چین نہ لینے دے رہا تھا۔ دولت گئی عزت گئی ساکھ گئی اور عزیز از جان بیٹی کی برباد زندگی علیحدہ آسیب بن کر چمٹ گئی اور ایک دن وہ غصے سے بھرا سیٹھ شاہد کے گھر پہنچا۔

”زہے نصیب۔ آیئے آیئے سیٹھ صاحب۔ آج تو چیونٹی کے گھر نارائن آ گئے۔“

شاہد نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ اس کی آنکھوں میں فتح کا ایک بے پناہ سیلاب امنڈتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک زہر خند ہنسی تھی۔ جونہی سیٹھ کریم کی آنکھیں سیٹھ شاہد کی آنکھوں سے چار ہوئیں وہ بے تحاشہ چونک اٹھا اور ہڑبڑا کر بولا۔

ملنا چاہ رہی تھی مگر آپ جب سے واپس آئے ہیں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔"

"ارے ارے جناب کیوں خیریت تو ہے۔" شاہد نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا تو سارہ کی کچھ ہمت بندھی اور دھم سے کرسی پر گر پڑی پھر کہنے لگی۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے نا۔"

"اوہو کیوں کیا ہوا؟" سیٹھ شاہد نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ شرم کے مارے سرخ ہوگئی۔

"وہ ......وہ ...... اب میں کیا بتاؤں شاہد۔ سمجھ میں نہیں آرہا یہ سب کیسے ہوگیا۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں نگاہیں نیچی کر کے انگلیوں کے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ تو پہیلیاں بجھوا رہی ہیں اور اپنے پلے تو کچھ پڑا نہیں۔" شاہد نے تجاہل عارفانہ برتتے ہوئے کہا تو سارہ روہانسی سی ہوگئی اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"پلیز شاہد سمجھنے کی کوشش کیجئے نا۔ اور پھر پاپا سے ابھی تک آپ نے کوئی بات نہیں کی۔"

شاہد نے سوالیہ انداز میں سارہ کی طرف دیکھا اور بولا "میں کچھ سمجھا نہیں سارہ۔"

اس کی اس تغافل شعاری اور بدلے بدلے رویے سے سارہ کی روح ہوا ہوئی جارہی تھی اس کے دل کی دھڑکن ہتھوڑی کی طرح خود اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے شاہد جان بوجھ کر انجان بن رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ رُک رُک کر کہنے لگی۔

"میں ڈاکٹر شکیلہ کے کلینک گئی تھی اور......اور میرا خیال ہے کہ آپ کو اس معاملے سے نمٹنے کے لئے اب پاپا سے جلد از جلد بات کرنی چاہئے تاکہ وہ شادی کی کوئی تاریخ طے کردیں۔"

"اوہ...... مگر ......" وہ تذبذب سے سارہ کو گھورنے لگا۔ "مگر سارہ میں تم سے شادی نہیں کرسکتا اب تو میں اس طرح سوچ بھی نہیں سکتا۔" وہ جیسے تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

سارہ کے حواس پر جیسے بم گرا اور وہ سکتے کی سی حالت میں شاہد کو دیکھنے لگی۔ اسے شاہد کی طرف سے اس طرح کے ردعمل کی توقع ہرگز نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ حواس مجتمع کرکے ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"پلیز شاہد سنجیدہ ہونے کی کوشش کیجئے۔ یہ مذاق کرنے کا وقت نہیں ہے۔"

"کون مذاق کررہا ہے۔ تم سے سارہ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" وہ حیران سا ہوکر بولا۔

"تو کیا......تو کیا...... وہ سب جھوٹ تھا آپ محض مجھ سے کھیلتے رہے...... اور کچھ نہیں؟" سارہ نے آنسوؤں کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"اُفوہ......بھئی یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے کچھ وقت ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارا ہے مگر اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں نکلتا کہ......کہ......" یہ کہتے ہوئے شاہد کی نظریں سارہ کے لال بھبھوکا حسین چہرے پر پڑی تو وہ ایک لمحے کے لئے نروس ہوگیا مگر پھر سنبھل کر بولا۔

"تم بے حد حسین ہو سارہ بے حد اور تم نے مجھے لازوال خوبصورت لمحات عطا کئے ہیں جس کے لئے میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں لیکن مائی ڈیئر مجھے افسوس ہے میں تم سے شادی نہیں کرسکتا۔"

"آخر کیوں؟ کوئی وجہ بھی ہو۔ کوئی میرا قصور بھی تو ہو؟" سارہ نے سسکتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اتنی بھی ناسمجھ نہیں ہو۔ دیکھو نا آخر میرا بھی کوئی سٹیٹس ہے ایک سمگلر کی بیٹی سے شادی کرکے میں اپنی ساکھ کیسے خراب کرلوں؟ یہ تو

صرف مجھے تنخل میں ٹاٹ کا پیوند کہہ کر دھتکارا بلکہ تم سے شکایت کر کے مجھے زندہ درگور کروا دیا۔ آخر کیا کمی تھی مجھ میں میں بھی نجیب الطرفین والدین کی اولاد ہوں میرا قصور یہی تھا نا کہ میرے اوپر سیٹھ کا لیبل نہیں لگا ہوا تھا اس لئے تمہیں میرے اندر چھپا ہوا ہیرا نظر نہ آسکا۔" سیٹھ کریم کا یہ سب سنتے سنتے تمام بدن کانپنے لگا چند لمحے تو اس کے گلے سے کوئی آواز تک نہ نکل سکی اسے چکر آ گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔

"تم...تم......ناصر ہو؟" وہ اپنی کانپتی ہوئی استخوانی انگلی اٹھا کر بولا "نہیں نہیں تم وہ نہیں ہوسکتے۔ اس کی تو بالکل مختلف صورت تھی اور پھر......پھر وہ تو مر گیا تھا۔"

"جی ہاں یہی تو میں عرض کر رہا ہوں نا جناب کہ تم نے تو اپنی طرف سے مجھے مار کر ہی پھنکوا دیا تھا۔ دنیا میں باہم رہتے ہوئے کیا کچھ نہیں ہوجاتا۔ باہمی تعلقات میں غلط فہمیاں جھگڑے اور شکایتیں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں لیکن ایسی درندگی کبھی دیکھی نہ سنی کہ انسانی جان کو مچھر سے بھی بے وقعت سمجھا جائے۔ جب جی چاہا مسل کر پھینک دیا۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ ناصر تو بالکل مختلف شکل و صورت کا تھا۔ کیوں بدل گئی میری صورت بولو بتاؤ؟" پھر گرج کر بولا "ظالم شخص تم انسان کے روپ میں بھیڑیے ہو۔ وہ تو میری زندگی باقی تھی جو میں بچ نکلا ورنہ اگر تم مجھے اس حالت میں دیکھتے جو حالت میری تمہارے غنڈوں نے بنائی تھی اور وہ دن جو میں نے ایک زخمی چوپائے کی طرح سسک کر قید تنہائی میں گزارے تھے تو شاید مجھے دیکھ کر تمہارے اعصاب بھی جواب دے جاتے۔"

"اوہ میرے خدا! بوڑھے سیٹھ نے کراہ کر اپنی کنپٹیاں دبائیں اور جھلا کر روتی آواز میں بولا۔

"مجھے کیا پتہ تھا کہ میں اپنے بدترین دشمن کے ہاتھوں کھیل رہا ہوں اور اپنی آستین میں سانپ پال رہا ہوں؟ اے تم جو بھی ہو تم نے بھی تو مجھے ہر طرح سے تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کیا اتنی سزا دے کر بھی تمہارا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا؟ تیرا بیڑہ غرق ہو۔"

"شاید یہ سزا تمہارے لئے کافی نہیں ہے۔ میں کتنے عرصے سے انتقام کی آگ میں جھلس رہا ہوں اور تم نے ابھی میرا انتقام دیکھا کہاں ہے۔ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ میں تمہاری بیٹی کو ویسے ہی ٹھکراؤں گا جس طرح اس نے مجھے ٹھکرایا تھا اور اس طرح تم دونوں کو تڑپا تڑپا کر ماروں گا جیسے تم نے میرے ساتھ سلوک کیا تھا۔" ناصر نے زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا "تم خود کو خدا سمجھنے لگے تھے مگر تم یہ بھول گئے تھے کہ جس کو تم نالی کا ذلیل کیڑا کہہ کر پکار رہے ہو ایک دن وہ بھی تمہیں گندے کیڑے کی طرح پاؤں تلے مسل سکتا ہے۔ تمہیں کتے کی موت مار سکتا ہے۔"

"میں..... میں تمہارا خون پی جاؤں گا تم نے سمجھا کیا ہے؟"

سیٹھ کریم غصے سے کانپتا ہوا مٹھیاں بھینچ کر ناصر کی طرف بڑھا تو ناصر نے فوراً ہاتھ گھنٹی پر رکھ دیا۔ اسی لمحے اس کا باڈی گارڈ آ گیا۔ ناصر نے تملاتے ہوئے سیٹھ کی طرف اشارہ کیا اور نہایت طنز سے قہقہہ لگا کے بولا۔

"بڑے میاں کو باہر کی تازہ ہوا کھلواؤ بھئی۔"

اور اسی رات سارہ کے باپ نے خودکشی کر لی۔

اب سارہ اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی اس کے بعد بھی اس نے ناصر سے کئی دفعہ رابطہ قائم کیا اس کی ہر طرح سے منت سماجت کی مگر ناصر ٹس سے مس نہ ہوا۔

"کون ہو تم؟ میں کہتا ہوں کون ہو تم؟ آج میں تم سے صاف صاف پوچھ کر ہی جاؤں گا کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا؟ کس جرم کی سزا دی تم نے میری بچی کو؟"

شاہد نے جو سینے پر بازو لپیٹے آتشدان سے ٹیک لگائے کھڑا تھا مضحکہ خیز نظروں سے بوڑھے سیٹھ کی طرف دیکھا اور تمسخر بھری آواز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "اوہو۔ بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں آپ تو حوصلے سے کام لیجئے بڑے میاں۔"

"اتنا ظلم ڈھا کر بھی حوصلے کی بات کرتے ہو؟" سیٹھ کریم چلاتے ہوئے بولا۔

"آپ خوامخواہ رائی کا پہاڑ بنانے کی کوشش میں ہیں۔ کیا کر دیا آخر میں نے؟"

سیٹھ شاہد طنزیہ مسکرا کر بولا تو بوڑھا سیٹھ پھٹ پڑا۔

"میں کہتا ہوں خدا کے قہر سے ڈرو ظالم انسان کیا تمہیں ذرہ بھر اللہ پر ایمان نہیں؟"

"کوئی بھی انسان اپنے نفس کے علاوہ کسی پر ایمان نہیں رکھتا۔ ہر کوئی اپنے نفس کو پوجتا ہے۔"

"مگر تم ہو کون؟" اوپر سے تو تم بڑے خوبصورت بنتے ہو نیکی اور پارسائی کی باتیں کرتے ہو مگر تمہارے اندر کیا ہے کبھی سوچا تم نے؟ منافقت' ریاکاری' فریب اور بے رحمی۔ تم نے ہم باپ بیٹی کو کہیں کا نہ چھوڑا سیٹھ' کہیں کا نہ چھوڑا ہمیں۔" سیٹھ کریم بخش نے اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے کہا۔

"اف بڑے گرم ہو رہے ہیں آپ تو ٹھنڈا منگواؤں آپ کے لئے؟" ناصر نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"بکواس بند کرو۔ اور میری بات کا جواب دو۔" سیٹھ کریم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

اس وقت سامنے والے دریچے میں سے غروب آفتاب کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی تمام لہو رنگ سرخی جیسے سیٹھ شاہد کی مجروح آنکھوں میں اتر آئی۔ اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگارے معلوم ہونے لگیں دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پر ماضی کی خونچکاں داستان لکھی نظر آنے لگی۔ جونہی پرانی یادوں کے جھلسانے والے تھپیڑوں نے اس کے ذہن کے دریچے دھڑ دھڑاتے ہوئے وا کرنے شروع کر دیئے تو وہ پرانا ناصر بن گیا۔ جس کی ہڈی ہڈی چور تھی اور جو ویران جھونپڑے میں کسمپرسی کی حالت میں زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔

اس نے خشک گلے سے تھوک نگلا۔ اس کے گلے میں سے ایسی بھرائی ہوئی آواز نکلی جو شاید اس کی اپنی نہ تھی۔ اس کے بیتے ہوئے دنوں کی بازگشت تھی۔ "تم پوچھتے ہو کہ کون ہوں میں اور کیوں، یاد کیا تم باپ بیٹی کو تو پھر لو پہچانو مجھے میں وہی ہوں، ہاں وہی تو ہوں میں گندی نالی میں رینگنے والا ذلیل کیڑا تمہارا اسسٹنٹ منیجر ناصر جسے تم نے اپنی بیٹی سے پیار کرنے کے جرم میں اپنے غنڈوں سے مروا کر جنگل میں پھنکوا دیا تھا۔ میں وہی تمہارا کشتۂ ستم ملازم ناصر ہوں جس کی خون پسینے کی کمائی میں سے ایک پائی بھی نہ دی تھی تم نے۔ اب تم ہی بتاؤ مجھے کہ کیا گناہ کیا تھا میں نے؟ کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا؟" ناصر گرج کر بولا۔ "جواب دو اب خاموش کیوں ہو؟ میں وہی ٹٹ پونجیا ہوں جس نے تمہارے لئے دن رات کام کیا۔ تمہاری وفاداری میں جان کی بازی لگا دی مگر تم' تم نے ظالم انسان' نہ صرف میری رقم ہضم کر لی بلکہ مجھے مروانے کی کوشش کی۔ نہ تو میری جوانی پر ترس کھایا نہ ہی میرے بوڑھے والدین پر اور پھر نفرت کے بیج سے محبت کا پھول کبھی نہیں اُگ سکتا۔ تمہاری بیٹی سارہ نے نہ

اس طرح میری روح کو سیراب کیا ہے کہ اب میں چاہوں بھی تو اس کی یاد ذہن سے کھرچ نہیں سکتی۔ اس کے بغیر اب میرے دل کے آنگن میں کبھی بھی کسی خوشبو کا موسم نہ اُتر سکے گا۔ میں ہر دکھ جھیل لوں گی' مگر اپنے پیار کی نشانی اپنے سے جدا نہ کروں گی اور دیکھو اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے در پر پڑی رہوں تو پلیز آئندہ پھر اس موضوع پر بات نہ کرنا ورنہ میں کچھ کھا کر سو رہوں گی۔'' سارہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا حالانکہ باپ کی وفات کے بعد جب سارہ ناصر کے پاس گئی تو وہ اس وقت اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا۔ وہ سیدھی اندر چلی گئی اور ناصر کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی تھی۔

''ناصر! میں اپنی نادانی اور جلد بازی پر انتہا سے زیادہ شرمندہ ہوں۔ اتنی شرمندہ کہ اس شرمندگی نے میرے ذہن کے پرخچے اُڑا کر رکھ دیئے ہیں۔ یقین کرو جو کچھ میرے پاپا نے تمہارے ساتھ کیا میں اس سے لاعلم ہوں' مجھے کچھ پتہ نہیں میں تو بس یہی کچھ جانتی تھی کہ تم نوکری چھوڑ کر چلے گئے ہو۔ اس وقت میری آنکھوں پر پردہ آیا ہوا تھا لیکن ناصر اب تو میں صرف تمہیں ہی چاہتی ہوں۔ اب میں کسی اور کی بن کر رہ نہیں سکتی۔ میں تمام زندگی تمہارے ہی نام پر گزار دوں گی۔ ناصر میرے ناصر تم بولتے کیوں نہیں؟ میری طرف دیکھتے کیوں نہیں۔ کیا تم میرے دل کی یا میری روح کی فریاد سن رہے ہو۔'' سارہ بول رہی تھی اس کی آواز میں ایسا افسردہ نغمہ تھا جو [illegible] امید' خوشی اور غم کے ان جذبات سے آراستہ ہو جو محبت [illegible] دل کی گہرائیوں میں اپنے محبوب [illegible] پیدا ہوتے ہیں اس کی حیران آنکھیں جھلملا [illegible] مجبور رہتی تھیں۔

[illegible] ناصر کہ اس سب کو میں محض [illegible]

وحشت ناک خواب سمجھ کر بھول جاؤں۔''

اس کی فریاد سن کر ایک دفعہ تو ناصر کی روح تک چونک پڑی۔ اس کے دل میں محبت اور انا کی جنگ ہونے لگی۔ محبت جو گھٹا ٹوپ تاریکی میں روشن ستارے کی طرح جگمگاتی ہے اور انا جو امنگوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے' جو سنگدل ہوتی ہے۔ آخر کار اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور آہستگی سے سارہ کے بازو اپنے گلے سے نکال دیئے اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے امید و بیم کے بھنور میں چکراتی سارہ کی مضطر اور ہراساں آنکھوں سے آنکھیں پھیر لیں اور ایسی دھیمی آواز میں جیسے تپتے صحرا میں کراہتا ہوا بگولا جلتی ہوئی ریت اُڑاتا آگے کو نکلتا جائے وہ کہنے لگا۔ ''میری طرف سے تو تم آزاد ہو سارہ تم جہاں اور جس کو چاہو اپنا سکتی ہو۔ بہرحال میں نے تمہاری شخصیت کا طلسم توڑنا تھا سو توڑ دیا۔''

''مگر میں...... جب تک میری سانس میں سانس ہے تمہارے بغیر کسی دوسرے مرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی ناصر۔ مجھے مت ٹھکراؤ۔ مجھے امانت میں خیانت کے لئے مت کہو۔ عورت زندگی میں صرف ایک بار ہی محبت کرتی ہے۔'' سارہ نے دردناک آواز میں کہا۔

''دیکھو یہاں سے چلی جاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں میں نے صرف انتقام لینے کے لئے تم سے تعلقات استوار کئے تھے۔ اب میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں۔'' ناصر نے دانت پیس کر کہا۔ ''تم نے میری محبت کی تذلیل کی تھی۔ تمہارا وجود میری مردانگی کے لئے چیلنج تھا۔ تمہاری بلندیاں اب میرے قدموں میں سرنگوں ہوگئی ہیں بس میں یہی چاہتا تھا۔''

''ناصر...... ناصر تم جھوٹ بول رہے ہو مگر تمہاری آنکھیں جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ یہ اسی ناصر

اس وقت اس کا واحد سہارا اس کی بچپن کی دوست شکیلہ تھی جو اس وقت اس شہر میں ڈاکٹر تھی اور اس کا ذاتی کلینک بھی تھا۔ سارہ اس کے پاس اٹھ آئی تھی کیونکہ سیٹھ کریم بخش دیوالیہ ہو کر مرا تھا۔ وہ تمام دن اٹھوائی کھٹوائی لئے پڑی رہتی اور آخر یہ سوچ کر کہ کب تک ڈاکٹر شکیلہ پر بوجھ بنی رہے گی اس نے ایک کنڈر گارٹن سکول میں ملازمت کر لی۔ جس کی سرپرستی کبھی اس کا باپ کیا کرتا تھا۔ ادھر سالانہ فنکشن میں چند ہی دن باقی تھے کہ اس نے چھپے ہوئے کارڈ پر سیٹھ شاہد حسین کا نام پڑھا جو کہ بطور چیف گیسٹ بلایا جا رہا تھا۔

سیٹھ شاہد حسین نہایت طمطراق سے آیا۔ پریس فوٹو گرافرز اس کے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے اور سکول کا سٹاف اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہا تھا۔

جب سیٹھ کریم، سیٹھ شاہد کے پاس سے ہو کر آیا تھا تو آتے ہی سارہ کو بتا دیا تھا کہ سیٹھ شاہد حسین' ناصر کے سوا کوئی نہیں۔

اب جو وہ اسی سکول میں چیف گیسٹ بن کر آیا جہاں سارہ ملازمت کرتی تھی تو جاتے وقت دس ہزار کا چیک بھی سکول کو عطیئے کے طور پر دے گیا۔ سارہ نہایت بے بسی سے دور ایک کونے میں چھپی کھڑی اس ناصر کو دیکھتی رہی جسے اس نے کبھی ٹھکرایا تھا۔

گھر آ کر وہ تمام رات روتی رہی اور ایک منٹ کے لئے بھی نہ سو سکی۔ اس کی زندگی ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہو چکی تھی۔ بے رحم حالات کے دھارے میں بہہ کر نجانے وہ کہاں کہاں سرگشتہ پھر رہی تھی۔ ناصر کے ساتھ گزرے ہوئے دن اسے خواب کی طرح معلوم ہو رہے تھے آخری بار ناصر سے ملاقات کے بعد وہ اس کے لہجے اور الفاظ کے پتھروں تلے سنگسار ہوئی پڑی تھی نفرتوں کے ناگ اس کی خوشیوں کو ڈس گئے تھے۔

اور اب گزرتے سمے کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بھی بے ڈول اور بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے بچپن کی ساتھی شکیلہ اس کی ہمت پر کڑھتی اسے بڑا سمجھاتی کہ وہ آنے والی صورت حال سے قبل از وقت چھٹکارا پا لے مگر سارہ ٹس سے مس نہ ہوتی اس نے باہر نکلنا بالکل بند کر دیا اور سارا وقت منہ لپیٹے پڑی رہتی۔

"مجھے ایک تو تمہاری اس بات کی سمجھ نہیں آتی سارہ کہ تم آخر کس انسان کیلئے اپنی زندگی تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہو؟ اری وہ تمہارے باپ کا قاتل ہے' تمہیں اس نے معاشرے میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا پھر بھی تمہیں عقل نہ آئی۔" شکیلہ نے جھنجلاتے ہوئے کہا تو سارہ تڑپ کر بولی۔

"ایسا مت کہو شکیلہ۔ جس معاہدے کی بنیاد ہی بناوٹ اور انتقام کے جذبوں پر رکھی گئی ہو اس کے دیرپا مستحکم ہونے کا امکان ہی کہاں ہوتا ہے۔ ایک وقت میں میں نے اور میرے باپ نے اس کے ساتھ حد سے بڑھ کر زیادتی کی۔ اس وقت وہ غصے میں ہے۔ انتقامی جذبے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت کو مفلوج کر رکھا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ کبھی تو وہ سوچے گا کبھی تو گزرے دنوں کی یادیں اس کے دل پر دستک دیں گی' کبھی تو وہ اپنی ذمہ داری قبول کرے گا۔"

"ہاں ہاں تو پھر ٹھیک ہے تم اٹھائے پھرو سر پر اس کی یادوں کے تابوت اور برداشت کرتی رہو اس کی جدائیوں کی تمام صعوبت اس ایک خام خیال پر۔" شکیلہ نے طنز بھرا ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

"رات کٹ ہی جاتی ہے شکیلہ اگر سورج کی آس رہے۔ یہ مت بھولو کہ وہ مجھ سے پیار کرتا رہا ہے۔ اس نے اس مختصر عرصہ میں اپنے پیار سے

زنانہ حصے کی درگاہ کی جالی سے لگی نجانے کتنی دیر سے وہ گریہ وزاری کررہی تھی نیوی بلیو کلر کے سوٹ کی شلوار کے نیچے اس کے گورے گورے خوبصورت پاؤں کھائی دے رہے تھے یا پھر اس کے خوبصورت ہاتھوں کی مرمریں انگلیاں جن سے وہ جالی تھامے رقت بھری دھیمی دھیمی آواز میں دعائیں و مناجات پڑھ رہی تھی۔ اس کا جھکا ہوا سر بڑے سے آنچل میں مشکل طور پر چھپا ہوا تھا۔

ناصر کی امی ذرا پرے ہٹ کر نوافل ادا کرنے کے بعد اب وہیں بیٹھی اس کی طرف دیکھے جارہی تھیں۔

"آہ۔" وہ سرد آہ بھر کر سوچنے لگیں۔ "نجانے کون دکھیا ہے۔ اف کوئی بھی سکھی نہیں اس دنیا میں جس کا دل کھول کر دیکھو اسی پر زخم نظر آئیگا۔ میرے مولا نجانے میری جھولی بھی کب تک خالی رہے گی۔"

اتنے میں ایک ڈیڑھ سال کا پیارا سا گول مٹول بچہ جو اس کا آنچل پکڑے اس کے ساتھ کھڑا تھا پیچھے کو مڑا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

اور ناصر کی ماں کو آج کتنے عرصہ کے بعد اپنا وہ ناصر نظر آیا جو اس کے بطن سے پیدا ہوا' اس کی گودی میں سویا' اس کے آنگن میں کھیلا کودا اور جوان ہو کر جب پردیس سدھارا تو پھر وہ ناصر واپس نہ آسکا جو اس کا اپنا ناصر تھا۔

وہ بغیر پلکیں جھپکائے اس بچے کو دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ جس تسبیح کو ہاتھ میں لئے دانے رول رہی تھی اس کے ہاتھ سے گر گئی اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔

اتنے میں وہ مڑی اور اپنی سرخ ہوئی خوبصورت ناک کو آنچل کے پلو سے پونچھ کر واپسی کے لئے قدم بڑھایا۔ ناصر کی امی نے اس حسن و جمال کی تصویر کو دیکھا جس کی مدھ بھری آنکھیں رو رو کر سرخ ہو چکی تھیں اور گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس نے اس بچے کا ہاتھ پکڑا اور جونہی وہ ناصر کی امی کے قریب سے گزرنے لگی ناصر کی امی نے جیسے ہوش میں آتے ہوئے ہاتھ پھیلا کر بچے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ بچے نے یکدم حیران ہو کر پہلے ناصر کی امی کو دیکھا پھر اپنی ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"معاف کرنا بیٹی کیا میں آپ سے متعارف ہوسکتی ہوں؟" ناصر کی امی نے نہایت شستہ انداز میں خاکساری سے کہا......

"جی...... جی...... میرا نام سارہ ہے۔"

"اور یہ بچہ؟" ماں جی نے پوچھا۔

رات باقی تھی ابھی جب سرہانے آ کر
چاند نے مجھ سے کہا' جاگ! سحر آئی ہے

گلاب کے پھولوں اور اگربتی کی خوشبو میں لپٹا ایک جھونکا سارہ کے کانوں میں سرگوشی کرتا آگے نکل گیا۔ "جی یہ بھی اپنا ہی ہے۔" کچھ سوچ کر قدرے تذبذب سے سارہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بیٹی شاید آپ یقین نہ کریں لیکن یہ بچہ ہو بہو میرے بیٹے کے بچپن کی تصویر ہے کیا میں اس کے والد کا نام پوچھ سکتی ہوں؟" ناصر کی امی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کیا کریں گی پوچھ کر؟ انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا ہے چلو بیٹے چلیں۔" سارہ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

ناصر کی ماں یہ سن کر تڑپ اٹھی۔ اس کا دماغ کئی قسم کے شکوک کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "ذرا ٹھہرو بیٹی۔ اس طرح نہ جاؤ کیا ہمارے درمیان کوئی تفصیلاً گفتگو ہوسکتی ہے؟ براہ مہربانی اگر تم

کی آنکھیں ہیں جو مجھ سے پیار کرتا تھا۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی یا مجھے اپنا لو یا پھر قتل کردو مگر مجھ پر اور اس ہونے والے بچہ پر اتنا ظلم نہ کرو۔" سارہ روتے روتے بولی۔

"اوہ جہنم میں جاؤ تم اور تمہارا بچہ۔ میں کہتا ہوں چلی جاؤ یہاں سے ورنہ دھکے دے کر باہر نکلوا دوں گا۔"

جیسے آندھی کے منہ زور تھپیڑے سے نازک ٹہنی ٹوٹ کر گر جاتی ہے ایسے ہی ناصر کے الفاظ سن کر سارہ کے ہارے ہوئے قدم اپنی بے نشان منزل کی طرف سرکنے لگے۔

اور پھر واپس آکر وہ کئی دن سخت بخار میں گھری رہی بے ہوشی میں بھی وہ تمام وقت ناصر کو ہی یاد کرتی رہی۔ وہ ڈاکٹر شکیلہ کا ہاتھ پکڑ کر کہتی۔

'شکیلہ تجھے اپنی عزیز ترین چیز کی قسم ہے تو ناصر کے پاس جا۔ اس کی میری طرف سے منت سماجت کر۔ اسے بیتے دنوں کی یاد دلا۔ اسے بھولی بسری محبت کا واسطہ دے۔ اسے کہنا کہ اس گردش کی ماری کی جان ہونٹوں پر ہے۔ اسے بتانا وہ دیوانی حسرت بھری' موت کی وادیوں میں بھٹک رہی ہے۔ خدا کے لئے اسے ایک دفعہ میرے سامنے لے آؤ۔ اسے کہنا سارہ خطا وار ہے' خوار و زبوں ہے۔ وہ زندگی کے آخری لمحوں میں ایک دفعہ تمہاری صورت دیکھنا چاہتی ہے۔ جا میری پیاری شکیلہ جا اسے لے آ۔ تجھے اپنی خوبصورت جوانی کی قسم۔ اسے بتانا کہ وہ پچھتاوے کے جہنم میں جل رہی ہے۔" بولتے بولتے سارہ کا ذہن بے ہوشی کی گہری تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا اور شکیلہ کے منہ سے روتے روتے مارے بے بسی کے چیخیں نکلنے لگیں۔ کاش وہ اس کے لئے کچھ کرسکتی۔

وقت اپنے گردوپیش سے بے نیاز اپنی ہی چال چلتا رہا۔ ناصر کے باپ کا انتقال ہوچکا تھا۔ بہن بھائی اعلیٰ تعلیم کے بعد اپنے اپنے ٹھکانے لگ چکے تھے۔ ایک ماں رہ گئی تھی وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اگرچہ اب عیش وعشرت ناصر اور اس کی ماں کے گھر کی لونڈی تھی مگر ناصر کی ماں اکثر سوچتی کہ وہی دن اچھے تھے جب ناصر' ناصر تھا۔ اس دولت کی ریل پیل نے اس سے اس کا ناصر چھین لیا تھا۔ یہ تو نجانے کون تھا جس کی آواز اور آنکھیں تو ناصر کی تھیں مگر نہ تو صورت وہ تھی اور نہ مزاج یہ ناصر ہر وقت گم صم رہنے والا ایک نہایت سنجیدہ مزاج انسان تھا۔ کس بات کی کمی تھی اس کو ایک سے ایک اعلیٰ خاندان اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کا خواہاں تھا مگر ناصر ٹس سے مس نہ ہوتا۔ اب تو اس کی ماں پوتا کھلانے کی آرزو میں گھلی جارہی تھی اور دن رات جائے نماز پر بیٹھی رہتی یا بڑی بڑی درگاہوں کے چکر کاٹتی۔ اسے سمجھ نہ آتی تھی کہ مال و دولت' نام ونمود' اچھی شہرت' خوبصورتی کے باوجود ناصر اس قدر پراسرار طور پر تنہا زندگی کیوں گزارنا چاہتا ہے۔ وہ کتنی ہی دفعہ ناصر کے ذہن کو باتوں باتوں میں ٹٹول چکی تھی مگر اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا اس کے ہاتھ نہ آسکا۔ کبھی تو اس موضوع کو ناصر ہنس کر ٹال دیتا اور کبھی ایسی گمبھیر خاموشی اختیار کرلیتا جس سے اس کی ماں بھی خوفزدہ ہوجاتی۔ انجانے میں ناصر نے انتقام کی خاطر اپنی زندگی کی تمام مسرتوں کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا اور اس انتقام کے شعلے اس کا اپنا دامن بھی جھلسائے دے رہے تھے۔

درگاہ کے آس پاس عقیدت مندوں کا جم غفیر تھا جو پھولوں کے ہار' چڑھاوے کی چادریں اور مٹھائیوں کے ڈبے لئے جوق در جوق بڑھے چلے آرہے تھے۔ عود ولوبان کی خوشبو چہار طرف پھیلی ہوئی تھی۔

ہیت تبدیل کر سکتے ہیں' کس طرح معافی کے قابل ہو سکتے ہیں ایسے ہی لوگوں کی غلطیاں دوسروں کو نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیتی ہیں۔" ناصر نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ تو سوچو کہ سارہ کے ساتھ ساتھ سزا تم اپنے آپ کو بھی دے رہے ہو۔ اس سے انتقام لیتے لیتے تم خود بھی خوشیوں سے منہ موڑ بیٹھے ہو۔ تمہارے ساتھ کے کھیلے لڑکے اس وقت دو دو بچوں کے باپ بن چکے ہیں اور ایک تم ہو کہ باپ ہو کر بھی باپ نہیں بن سکتے۔ تم اسے اپنے سینے سے لگا کر تو دیکھو۔ دیکھنا یہ کیسے تمہارے اندر کے ظالم سناٹے کو بھرتا ہے۔ تم نے ابھی تک وہ سریلی جھنکار سنی ہی نہیں جو اس بچے کے لمس سے تمہارے وجود میں سے اُٹھے گی۔ یہ تمہارے ہی لہو سے ابھری ہوئی روشنی کی ایک کرن ہے ناصر۔ اس سے میرے صحن میں اُجالا کر دو۔ یہ تمہارے اپنے وجود کی تخلیق ہے اور اسے خدا سے میں نے دعائیں مانگ مانگ کر لیا ہے میں کس منہ سے اپنے رب کریم کا شکریہ ادا کروں۔"

ناصر کی امی فرط جذبات سے گلوگیر ہو کر اُٹھیں اور بچے کو اُٹھا کر ناصر کی جھولی میں ڈالنے لگیں تو یک دم ناصر ایسے تڑپ کر صوفے سے اٹھا جیسے بچھو نے ڈنک مار لیا ہو اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اپنے حالات سے میں صلح تو کر لوں لیکن
مجھ میں روپوش جو اک شخص ہے مر جائے گا

ناصر نے لائبریری کی کھڑکی کا پردہ اٹھا کر دیکھا۔ پاؤں پاؤں چلتا گول مٹول خوبصورت بچہ جو اس کے بچپن کی ہو بہو تصویر تھا اپنی ڈگمگاتی چال سے مرغی کے چوزوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کی دادی اسے دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھی آج کتنے عرصہ بعد اس کے مضمحل و افسردہ چہرے پر تازگی کی چمک نظر آ رہی تھی۔

"اوہ سویٹ روح میری اماں آپ بھی میرے ساتھ انتقام کے اس کرائسس سے دوچار ہیں اس کا تو مجھے اس سے پہلے خیال ہی نہ آیا تھا۔ اُف میں بھی کتنا ظالم ہوں۔" اتنے عرصے بعد پہلی دفعہ ناصر کے دل میں اس خیال نے سر اٹھایا۔ اتنے میں بچہ گر گیا اور رونے لگا کہیں قریب سے ہی لپک کر سارہ آئی اور بچے کو اٹھا کر بہلانے لگی۔

ابھی بچے کے گالوں پر آنسو موتیوں کی طرح لڑھک رہے تھے کہ اس کے گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ مسکرا اُٹھے اور آنکھیں ستاروں کی طرح جگمگانے لگیں۔ دھوپ اور بادل کا یہ حسین امتزاج ناصر کے دل کو بے حد بھایا وہ وارفتگی سے اسے دیکھنے لگا مگر پھر جونہی سارہ پر نظر پڑی اس کی آنکھوں میں کرچیاں سی چبھنے لگیں اور اس نے پردہ گرا دیا۔ اس کے اندر کا وحشی پھر سے تلملانے لگا تھا۔

'پھر یادوں کی دیوداسی' بالوں کی کھلی گھٹاؤں کے ساتھ نامرادی کی سیاہ رات میں' حسرتوں کا جلتا دیا لے کر دل کے تنہا راستوں میں بھٹکتی پھرے گی اور اجڑے شبستانوں میں روتی پھرے گی۔'

آخر ناصر نے ماں کو اپنا فیصلہ سنا ہی دیا۔ "اماں بچے کی بات تک تو ٹھیک ہے وہ میرے پاس رہے لیکن میں سارہ کو اپنے سامنے نہیں دیکھ سکتا وہ جہاں مرضی ہو چلی جائے۔"

"بیٹے تم اپنے حواسوں میں تو ہو۔ بچہ ماں کے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔ اب تک اس نے اپنی ماں کو ہی دیکھا ہے بے شک وہ ابھی ...... بچہ ہے لیکن پھر بھی ماں کی مامتا تو ماں سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔" ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

مجھ پر اعتماد کرو تو شاید کوئی بہتر صورت نکل آئے اور یہ بچہ تو مجھے بالکل اپنا ناصر لگ رہا ہے۔" ناصر کی امی نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

ناصر کا نام سن کر سارہ کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے غور سے ناصر کی امی کی طرف دیکھا وہی ناصر کی سی آنکھیں وہی ماتھا اور وہی بات کرنے کا انداز۔

"امی جان! آپ ناصر صاحب کی امی ہیں؟" سارہ نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

ناصر کی امی نے گلوگیر ہو کر کہا۔ "مگر تم مجھے سچ سچ بتاؤ ماجرا کیا ہے؟"

سارہ نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر قدرے پس و پیش کے بعد ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔ "امی جان! یہ بچہ آپ کا پوتا ہے لیکن ناصر صاحب ہم ماں بیٹے دونوں سے ناراض ہیں ایک کروڑ پتی سیٹھ کا بیٹا میرے ساتھ ٹھوکریں کھا رہا ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے تم ابھی چلو میرے ساتھ۔ غضب خدا کا جب ہی تو میں کہتی تھی کہ یہ ناصر شادی کیوں نہیں کر رہا۔ ہر وقت کھویا کھویا کیوں رہتا ہے۔ توبہ توبہ کتنا ہوشیار بنا رہا یہ لڑکا اور مجھے بھنک تک نہ پڑنے دی کسی معاملے کی۔"

ناصر نے جز بز ہوتے ہوئے تیوری چڑھا کر اپنے سامنے کھڑی سارہ کو دیکھا جو کہ ابھی بھی ایمان کو ڈگمگا دینے کی حد تک خوبصورت تھی بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ زمانے کی سرد و گرم نے اس کے حسن کو گہنایا نہ تھا بلکہ وقت کے ساتھ اس کے حسن اور رعنائی میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے ناصر کی نظر اس پر ٹک گئی اور اس کے اندر ایک کشمکش شروع ہوگئی مگر اس نے اپنے آپ پر کنٹرول کرتے ہوئے سارہ سے اپنا رخ پھیر لیا۔ اسی لمحے کمرے کا پردہ ہٹا کر ناصر کی امی اندر داخل ہوئیں انھوں نے بچہ اٹھایا ہوا تھا۔ ناصر نے بچے کو حیرت سے دیکھا۔

نظریں چار ہوتے ہی بچہ نہایت دلفریبی سے مسکرایا اور ناصر دل مسوس کر رہ گیا۔ اس کے اندر سے اک آواز نے اس کے ذہن پر دستک دی۔

"ناصر...... ناصر...... یہ بچہ تمہارا ہے۔ تمہارے جگر کا ٹکڑا ہے بازوؤں میں لے لو اسے سینے سے لگا لو اسے۔"

مگر اس نے اس دستک سے کان بہرے کر لئے اور صوفے پر بیٹھے بیٹھے اخبار آنکھوں کے سامنے رکھ لیا۔

سارہ نے نہایت بے بسی سے سفید پڑتے ہوئے چہرے کے ساتھ ناصر کی امی کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگی "دیکھا امی جان! میں نے آپ سے عرض کی تھی نا یہ ہم سے بے حد ناراض ہیں آپ ناحق گھر لے کے آ گئیں یہ...... یہ ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

ناصر کی امی نے بات کرتی ہوئی سارہ کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور کہنے لگیں۔

"بیٹی سارہ آپ دوسرے کمرے میں جائیے۔"

ناصر کی امی ناصر کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئیں اور بچے کو نیچے قالین پر اتار دیا جو کہ اب پاؤں پاؤں چلتا قریب سوئی بلی کے پاس جا پہنچا اور اس کی دم کو کھینچ کر کلکاریاں مار مار کر زور زور سے ہنسنے لگا۔

"بیٹے مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ اگرچہ تم نے مجھ سے سب کچھ چھپا رکھا تھا۔ سارہ خطا کار سہی مگر یہ معصوم کس گناہ کی سزا بھگت رہا ہے بولو! اور پھر غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں خدا بھی تو معاف کر دیتا ہے۔ تم بھی معاف کر دو۔"

"مگر میں خدا نہیں ہوں امی جان۔ وہ جو بزدل ہوں ٹھکرا سکتے ہیں' دماغوں کو کچل سکتے ہیں' دلوں اور چہروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان پر

"آخر کبھی تو عادی ہو ہی جائے گا ماں۔ میں سارہ کو یہاں ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔ اسے کہیں یہاں سے چلی جائے میں منہ مانگی قیمت دوں گا۔"

یکایک پردے کے پیچھے کھڑی سارہ سامنے آگئی۔ اس کے تیور بگڑ گئے اور اس کی آنکھیں بجلیاں سی گرانے لگیں اس کی ساری ملائمت' امیدیں اور فریادیں غیض وغضب میں بدل گئیں۔ وہ ایک غضب ناک شیرنی کی طرح گرج کر بولی۔

"کون ہے جو میری مامتا کی قیمت لگا سکتا ہے؟ اس بچے سے خوشی اور سرور حاصل کرسکتا ہے؟ جس بچے کے لئے میں نے اپنے خون کا قطرہ قطرہ قربانی دی ہے۔ اسکے باپ نے عرصہ پہلے کہا تھا کہ جہنم میں جاؤ اور تمہارا بچہ بھی۔ اماں جان ان سے کہہ دیں کوئی ماں اپنا بچہ نہیں بیچ سکتی اور اماں جان اگر یہ مجھے یہاں برداشت نہیں کرسکتے تو پھر میں جہاں رہوں گی وہیں میرا بچہ بھی رہے گا۔ شکریہ سیٹھ صاحب۔" سارہ نے یہ کہہ کر بچے کو اٹھایا اور تیز تیز قدموں سے باہر کو جانے لگی۔

"سنو' سنو سارہ۔ رُک جاؤ' میں کہتی ہوں ٹھہر جاؤ۔" اماں جاتی ہوئی سارہ کو پکارتی رہ گئیں۔ مگر اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آخر اماں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس کے پیچھے چل دیں۔

سارہ کو گھر سے گئے کئی دن ہوچکے تھے۔ جب سے وہ گئی تھی اماں نے بھی چپ سادھ رکھی تھی ناصر بات کرتا تو ہوں ہاں میں جواب دے کر خاموش ہو رہتیں اور اکثر تو گھر سے غائب رہنے لگی تھیں۔

"شاید پھر امی جان نے درگاہوں کے چکر لگانے شروع کردیے ہیں۔" ناصر نے آہ بھر کر سوچا۔ آج کتنے دنوں سے ایک بے نام افسردگی نے اس کی روح کو گھیر رکھا تھا۔ بچے کے جانے کے بعد پھر گھر کے درودیوار کو سناٹوں نے ڈھانپ لیا تھا۔ لاشعوری طور پر ہی ناصر لائبریری کی کھڑکی میں کھڑا ہوگیا جہاں سے اس دن اس کا گول مٹول بچہ کلکاریاں مارتا نظر آرہا تھا مگر لان میں خاموشی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج ایک تھکے ہارے زرد مسافر کی طرح مغرب میں غائب ہونے لگا۔ جب ناصر خیالوں سے چونکا تو تاریکی ہر طرف چھا رہی تھی اس شب خواب میں بچہ آیا جو کہ بازو پھیلائے اسے بلا رہا تھا۔

"ابو.....ابو......!"

ناصر یکدم خواب سے بیدار ہوگیا۔ اس کی روح اس طرح بچے کو پکارنے لگی جیسے سمندر ندی کو پکارتا ہے کیوں کہ سمندر کی یکراں پراسرار گہرائیاں بھی تو ندیوں کی ہی مرہون منت ہیں آج ناصر اپنے آپ کو بے حد ادھورا محسوس کررہا تھا۔ اسے کسی پل چین نہیں آرہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ماں اس سے ناراض ہے مگر وہ ہمت کرکے اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ تسبیح پر کچھ پڑھ رہی تھی ختم کرنے کے بعد انہوں نے ہاتھ اٹھا کر نہایت رقت سے دعا مانگی اور پھر استفہامیہ نظروں سے پاس خاموشی سے بیٹھے ناصر کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔

"اماں!" ناصر نے حوصلہ کیا کرکے کہا۔ "میں اس بچے کے بغیر اب نہیں زندہ رہ سکتا۔"

"کون سا بچہ' کہاں کا بچہ" ارے لگتے کیا ہو تم اس بچے کے؟" اماں نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "اگر تمہیں اس بچے کی ذرا بھی پروا ہوتی تو کیا وہ بچہ اور اس کی ماں اب تک در در کے دھکے کھا رہے ہوتے۔"

"اماں آپ کیسی ماں ہیں جو میرا تمام دکھ بھلا بیٹھی ہیں۔ جنہوں نے مجھے آج اس حال تک پہنچایا آپ ان کی ہی طرف داری کررہی ہیں۔" ناصر نے بے چارگی سے کہا۔

شائع ہو گیا ہے

سیارہ ڈائجسٹ کے لازوال اسلامی نمبروں میں ایک اور اضافہ

قیمت: 175 روپے

- ان تمام واقعات کا جدید علم و تحقیق کی روشنی میں تفصیلی ذکر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور اس کی امت کو بتانا ضروری سمجھے
- انبیائے کرام کی مقدس اور پاکیزہ زندگیوں سے وابستہ واقعات
- قصے ان قوموں کے جن پر انبیائے کرام کی نافرمانی، اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی اور سرکشی کے باعث عذاب الٰہی نازل ہوا

عمدہ ترتیب، دلچسپ انداز بیاں اور پرکشش رنگین ٹائٹل

500 صفحات پر مشتمل یہ عظیم الشان نمبر جلد پیش کیا جائے گا

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 245412-3

میرے تاریک ذہن میں جوت سی کیسے جلنے لگی ہے؟ میرے پتھر وجود کے گوشہ احساس میں یہ تشنگی سی کیسی جاگ رہی ہے؟ یہ سلگتی سی آنچ میرے دل کو کیوں گرما رہی ہے؟ کیا میں بدل رہا ہوں؟ نہیں نہیں' ایسا نہیں ہوسکتا میں ایسا کبھی بھی نہ ہونے دوں گا۔

مجھے حوصلہ دے میرا خدا مجھے ہمت دے۔ میں کس طرف جارہا ہوں؟ میرا ساتھ نبھانے والے جذبے چپ کیوں سادھے بیٹھے ہیں؟ آج میری انا کے ہونٹوں پر خاموشی کے قفل کیوں پڑے جارہے ہیں؟ میرے سینے میں جو زخموں کے چراغ روشن تھے آج ماند کیوں پڑ رہے ہیں؟ دل بیزار کا ہر نقش سہما سہما کیوں ہے؟ کیا میرا غمناک تڑپتا ہوا ماضی آہوں کا سفر ختم کرکے دہلیز پر آکھڑا ہوا ہے؟ نہیں نہیں میں اسے رخصت نہیں ہونے دوں گا۔ یہ ماضی اب میرے وجود کا حصہ بن چکا ہے۔ میرا دل اب تو غم کی چوٹوں پر دھڑکنا سیکھ گیا ہے۔ اب اسے خوشی کے نغمے راس نہ آئیں گے۔ میں نے جواب تک اپنے ہی خون جگر سے پیاس بجھائی ہے۔ اب پیار کا امرت پی نہ سکوں گا۔ چلو چلو انہی جزیروں کی طرف' اسی افلاس کی وادی کی طرف جہاں مجھے میری تقدیر کی ناگن ڈستی رہی جہاں مجھے ان پری پیکروں نے خون رلایا جہاں میرے خوابوں کا چمن چھین لیا گیا۔ ہاں میں جاؤں گا وہیں جاؤں گا وہیں مجھے پھر اپنی صحیح تصویر نظر آئے گی۔ وہیں میں اپنا اصلی روپ دیکھوں گا۔"

ناصر تیزی سے گیراج کی طرف گیا تو سارہ جو کتنی ہی دیر سے برآمدے کے ستون کے پیچھے سے ناصر کو پاگلوں کی طرح چکر لگاتے دیکھ رہی تھی پیچھے پیچھے بھاگی۔ ناصر بھی مڑا' اپنے کمرے میں گیا اور پھر کار کی چابی لے کر نکلا۔ سارہ اسے آتا دیکھ کر کار کے پیچھے چھپ گئی۔ جونہی ناصر کار میں بیٹھا وہ آہستگی سے پچھلا دروازہ کھول کر پیچھے بیٹھ گئی۔ ناصر کے سر پر کچھ ایسا جنون طاری تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چل سکا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔

ناصر نے بگولے کی طرح اُڑاتے ہوئے کار سنسان سڑک پر ڈال دی۔ میلوں پر میل گزرتے گئے اور پھر کار اسی سنسان جنگل میں داخل ہوگئی جہاں وہ ناصر کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ تھوڑی دور جاکر ناصر نے کار اسی ہٹ کے پاس جا کھڑی کی جہاں سارہ نے کبھی اپنے دونوں جہاں ہارے تھے۔ آسمان پر تاروں کی برسات کے درمیان چودھویں کا چاند دولہا بنا نظر آرہا تھا تمام جنگل ایک پرفسوں روشنی میں نہایا معلوم ہورہا تھا۔

ناصر کار سے اترنے کے بعد چند منٹ ہٹ کے باہر کھڑا رہا اور پھر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اس کے اندر جانے کے بعد سارہ بھی آہستگی سے اُتری اور ہٹ میں داخل ہوگئی۔ ناصر دروازے کی طرف پیٹھ کیے ماچس جلا کر طاقچے میں رکھا چراغ روشن کررہا تھا۔ سارہ دبے پاؤں ناصر کے قریب گئی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ناصر چونک کر جھرجھری سی لیتا ہوا مڑا۔ اس کے سفید پڑے چہرے پر حسرتوں کا دھواں سا پھیلا ہوا تھا اور آنکھوں میں ایک سنگین خاموشی کا پرتو تھا۔

"کیوں آئی ہو یہاں تم؟" ناصر غصے سے بولا۔

"یہی سوال میں بھی آپ سے کرتی ہوں۔" سارہ نے آہستگی سے کہا۔

"میں تو اپنے ان لمحات سے ملنے آتا ہوں جو کبھی میرے چور چور وجود کے ساتھی تھے۔ جب تمہاری بے درد دنیا نے میرا لہولہو جسم یہاں لاکر

بیٹا تھا تو انہی درودیوار نے میرے زخموں پر مرہم رکھا تھا اور تم یہاں بھی میرے پیچھے پیچھے چلی آئیں۔ میں تو جب اپنا آپ بھولنے لگتا ہوں تو 'ایاز قدر خود بہ شناس' کے مصداق یہاں چلا آتا ہوں مگر تم نے تو شاید اس بات کا تہیہ کر رکھا ہے کہ مجھے کہیں بھی چین نہیں لینے دو گی۔'' ناصر نے سوگوار آواز میں کہا۔

''میں بھی آج شاید اسی لئے چلی آئی ناصر کہ وہ جگہ تو دیکھوں جس کے درودیوار میں میں زندہ چن دی گئی ہوں' جہاں کسی نے مجھے بہاروں کے طلسم میں پھانس کر خزاں کے نوکیلے کانٹوں پر دھکیل دیا۔ جہاں مجھے پیار کے گیت سنا کر بعد میں میرے ذہن میں کھولتا لاوا بھر دیا اور میں اس ویران جھونپڑی میں روشنی دینے والا دیا بن گئی جس میں اب تک میرا خون جل رہا ہے۔''

''بس بس خاموش ہو جاؤ۔'' ناصر نے چلا کر کہا اور کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے۔

''کیوں سچ بات کڑوی لگی یا تمہارے ترکش کے تمام تیر ختم ہو گئے؟'' سارہ نے بپھر کر کہا۔ ''ہاں برساؤ مجھ پر تیر اور پھینکو مجھ پر پتھر' کرو سنگسار مجھے کیونکہ خدا نے بناتے وقت تمہاری مٹی میں عفو و رحم کا عنصر نہ ملایا تھا۔'' ناصر نے ایک نظر سارہ کے لال بھبوکا چہرے پر ڈالی اور پھر اسے دھکا دے کر اپنے راستے سے ہٹاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ سارہ بھی تیزی سے ناصر کے پیچھے لپکی وہ ابھی کار سٹارٹ کر ہی رہا تھا کہ سارہ بھی پہنچ گئی۔ آج اس کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ چکا تھا اور وہ بہت غصے میں تھی اور کار کا دوسرا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس کا بازو پکڑ کر کہنے لگی۔ ''میں آج تم سے اس بات کا فیصلہ کر کے ر... صبر کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے میں تمہارے انصاف کا دروازہ کب تک کھٹکھٹاتی رہوں گی۔ کب تک تمہارے در پر بھکارن بن کر بیٹھی رہوں گی یہ تم کیسا انتقام لے رہے ہو؟ یہ تمہاری کیسی انا ہے جو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے؟ تم انا کے جھوٹے دیپ جلائے بیٹھے ہو کیوں؟ آخر ایسا کیوں ہے میں تم سے پوچھتی ہوں ناصر؟'' وہ اسے ہلاتے ہوئے بولی۔

ناصر کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔ اس کے حواس تتر بتر ہو گئے۔

''میں کہتا ہوں چپ ہو جاؤ تم سارہ!'' بالآخر وہ دھاڑا۔ پھر ایک بڑے زور کا دھماکہ ہوا۔ سارہ کی آنکھوں کے آگے چنگاریاں اڑیں اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ کار بے قابو ہو کر درخت سے ٹکرا چکی تھی۔

رات کے آخری پہر کسی جنگلی جانور کی آواز سے سارہ ہوش میں آ گئی۔ درد کی ایک لہر نے اسے بے بس کر دیا۔ اس کے تمام اعضاء چور چور تھے۔ قریب ہی ناصر سیٹ پر لڑھکا پڑا تھا ان کا خون بہہ بہہ کر سیٹوں کو رنگین بنا رہا تھا۔ اس نے ناصر کو کراہتے ہوئے آواز دی۔

''ناصر مجھے باہر نکالو۔''

ناصر نے کسی نہ کسی طرح کار کا دروازہ کھولا مگر خود ہی باہر جا پڑا اور وہیں سسکنے لگا۔ سارہ بھی کسی طرح باہر آئی اور ناصر کے پاس جا گری۔ ان کے اردگرد جنگل تھا۔ جنگلی جانوروں کے علاوہ ان کے قریب کوئی ذی روح نہ تھا۔ ان کے اردگرد خون کی مہک تھی اور تمام فضا جیسے ماتم کر رہی تھی ایک الو بچے کی سی آواز میں قہقہہ لگاتے ہوئے ان کے سروں پر سے اڑا اور قریبی درخت پر جا بیٹھا۔

ہوا درختوں میں آوارہ روح کی طرح بین کرتی پھر رہی تھی۔ ان کے کانوں میں نادیدہ پروں کی